اشاعت کا پندرہواں سال

جلد : ۱۵
شمارہ : ۱
جنوری ۱۹۸۷ء

زرسالانہ (۱۵) روپے
لائبریریز کے لئے (۲۰) روپے
بیرونی ممالک سے (۲۵) شلنگ

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

خط و کتابت کا پتہ
مینیجر ماہنامہ "پونم"
16-7-300/A
اعظم پورہ
حیدرآباد 600024

ایڈیٹر : ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

ترتیب

مطبوعہ : دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد — ۵۰۰۰۰۲

26 جنوری

مقدس سالگرہ ـــــ جس کی اہمیت میں تین گنا اضافہ ہوگیا ہے۔

49 سال پہلے آج کے دن ہم نے مکمل سوراج حاصل کرنے کا عزم کیا۔

1950ء میں آج ہی کے دن ہم نے بھارت کو ایک جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا اور اپنے لئے ایسا آئین بنایا جس میں انصاف، آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے اعلیٰ نصب العین کو شامل کیا گیا تھا۔

دو سال پہلے لگ بھگ اسی دن ہم نے آئین میں دیئے گئے جمہوری نظام کی طرف دوبارہ سفر شروع کیا۔

اس سالگرہ کے مقدس موقعہ پر ـــــ

آیئے! ہم سب اپنی آزادی کی بحالی کے لئے بھارت کے عوام کا شکریہ ادا کریں۔

آیئے! ہم ان لوگوں کے خوابوں کی تکمیل کے لئے کوشش کریں، جنہوں نے آزادی اور مساوات کے لئے اپنی جانیں قربان کیں۔

آیئے! ہم سب عہد لیں کہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کے حصول کے لئے تیزی سے کوشش کریں گے۔

davp 78/408

(اداریہ)

اُردو داں
اُردو دوست — ڈاکٹر چنا ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش
اُردو نواز

ستمبر ۱۹۷۸ء کے شمارے میں اُردو کے مسائل کے تعلق سے پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اُردو کا انٹرویو شائع کیا گیا تھا جس میں پروفیسر صاحب سے ہم نے ایک سوال پوچھا تھا کہ "آندھرا پردیش کے چیف منسٹروں نے ماضی میں اُردو زبان کے تعلق سے جو اعلانات کئے تھے وہ یقیناً حوصلہ افزا رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اہم اعلانات کو عملی شکل ہنوز نہیں دیا جا سکا۔ اب جبکہ ڈاکٹر چنا ریڈی صاحب ریاست کے چیف منسٹر ہیں جو نہ صرف اُردو کے پرستار ہیں بلکہ ان کی تعلیم بھی اُردو میڈیم ہی کے ذریعے ہوئی ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب بعجلت ممکنہ ایسے اقدامات منظور کریں گے جن سے اُردو زبان کے دیرینہ اور جائز حقوق کا کما حقہ تحفظ ہو سکے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہمارے اس سوال کے جواب میں پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب نے کہا تھا۔

"آپ کی اس تمنا میں میں بھی شریک ہوں۔ انجمن کوشش کر رہی ہے کہ اُردو والوں کے مطالبات کو ایک مرتبہ پھر چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا جائے۔"

خوشی اس بات کی ہے کہ اُردو کے مسائل کے تعلق سے چیف منسٹر صاحب سے جو اُمیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری ہوتی نظر آ رہی ہیں جس کا ثبوت چیف منسٹر صاحب کے وہ تاریخی اعلانات ہیں جو انہوں نے اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب بعنوان "ریاست میں اُردو کے مسائل، اُردو تعلیم اور نظم و نسق" کا مکمل جائزہ لیتے ہوئے چیف منسٹر صاحب نے نہایت ہی واضح اور غیر مبہم انداز میں جن فیصلوں کا اعلان کیا ہے وہ اُردو زبان کے حق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر چنا ریڈی نے ریاستی قیادت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ ان کے دور حکومت میں اُردو کے ساتھ مزید انصاف کیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے وعدہ کی تکمیل کی طرف پہلا قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی سالانہ گرانٹ میں مزید تین لاکھ کا اضافہ کیا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اُردو اکیڈیمی کے تعمیری پروگراموں کیلئے مالیہ کبھی مزاحم نہ ہوگا اور حسب ضرورت مالیہ فراہم کرنے میں وہ کبھی پس و پیش نہیں کریں گے۔ چیف منسٹر صاحب کی یہ کھلی تقریر نہ صرف ان کے اُردو داں، اُردو دوست اور اُردو نواز ہونے کا ثبوت ہے بلکہ لسانی اقلیتوں کے تعلق سے ان کی وسیع النظری اور ان کی حکومت کے رویئے کو بھی واضح کرتی ہے۔ چیف منسٹر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"جمہوریت کی کامیابی کی کسوٹی اقلیتوں کے ساتھ انصاف ہے۔ اقلیتیں خواہ وہ لسانی ہوں کہ مذہبی اگر کسی ریاست میں مطمئن ہیں تو سمجھئے کہ اس ریاست میں جمہوریت کامیاب ہے۔"

ڈاکٹر چنا ریڈی نے اُردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ترقی و استحکام کیلئے ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا اور ساتھ ہی اُردو پڑھنے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی ہوتے جانے پر [illegible] تشویش کا اظہار بھی کیا اور اس ضمن میں [illegible]۔ [illegible] اُردو والوں کی جانب سے ڈاکٹر چنا ریڈی کی خدمت میں [illegible] پیش کرتے ہوئے غالب کے الفاظ میں یہ دعا کرتے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ناصر کرنولی

الفاظ و محاورات اخذ کئے جائیں تو آپ کا اندازہ بے جا ہوگا اُردو ابھی کہاں کی عملی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بد معاش، بازار، لوٹ چالان وغیرہ لے لئے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ پنجابی ہونے کے ناطے اقبال پنجابی زبان کی بے جا حمایت کر رہے ہیں ایسا نہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے پنجابی کے حوالے سے بات کی ہے لیکن پس منظر میں وہی عمومی اصول کارفرما ہے جسے زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت کا مسئلہ۔ اسی عمل سے زبانیں ترقی پاتی ہیں۔ زبان میں نئے الفاظ کو نیا خون بند خون کے حیات بخش سرخ خلئے سمجھنا چاہیئے کہ اس سے زبان معاصر زندگی کے معاشرتی تقاضوں اور تمدنی امور سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے مولوی عبدالحق کو ۱۱ نومبر ۱۹۳۶ء کے ایک مکتوب میں اسی خیال کا اظہار کیا۔

" زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے "

اسی طرح سردار عبدالرب نشتر کے نام ۱۸ اگست ۱۹۲۳ء کے مراسلہ میں جو لکھا ہے زبان کے بارے میں محمد اقبال کا اپنا موقف [illegible] سمجھا اور [illegible] ہے

" زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں تو زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔

وہ اہل قلم جو زبان کو سومناتھ کا مندر سمجھتے ہیں اور خود کو اس کا پجاری۔ انہیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ زبان ایک بت نہیں۔ بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ ہے۔ وہ انسانی ذریعہ جو انسانوں کی مخصوص ضروریات کے مطابق انسانوں کے لئے انسانوں نے وضع کیا ہے۔ اسی لئے " دیوبانی " غرق ہے۔ کیونکہ دیوبانی بننے کا مطلب ہے انسانوں اور زندگی کے متنوع مظاہر حیات بخش اثرات سے رابطہ منقطع کرنے کے مترادف ہوگا۔ سنسکرت کی مثال نمایاں حیثیت رکھتی ہے اقبال نے اپنے ایک مضمون " قومی زندگی " میں قانونِ ارتقا کے نقطۂ نظر سے بات کرتے ہوئے اس کا زبانوں پہ اطلاق کر کے زبان میں نئے الفاظ کی اہمیت اور ضروریات کا احساس کرایا ہے۔

" ایک زمانہ تھا کہ جب یونانی یا لاطینی اور سنسکرت وغیرہ زبانیں [illegible] مگر اب ایک عرصہ سے یہ زبانیں بے جان ہو چکی ہیں۔ ان کی موت کا راز اسی قانون کا عمل ہے اور خود پنجابی زبان جس کو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں اس سے روز بروز متاثر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سینکڑوں الفاظ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے روزمرہ استعمال میں ہیں مگر اس زبان میں موجود نہیں۔ اظہار خیالات کے جدید طریق ہماری عقلی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں یہ زبان ان کے ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے حالات میں یہ لازم ہے کہ اس زبان کا حشر وہی ہو جو اور قدیم زبانوں کا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اور اس پر یہ مضمون ختم کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کا فنی منصب اس سے واضح ہو جاتا ہے وہ فنی منصب جس کی تشریح اس کی نثر سے بھی ہوتی ہے۔ ●●

عاتق شاہ

افسانے فکر و نظر کے مرکز ہیں

(ایک ریڈیائی تقریر)

یہ صحیح ہے کہ افسانے فکر و نظر کے مرکز
ہیں، لیکن وہ ہر چیز جو افسانے کے نام سے پیش
کی جاتی ہے افسانہ نہیں ہوتی۔ ویسے ملک کے
اخبارات و رسائل میں آئے دن درجنوں
افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان میں
سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جو قاری کی توجہ کو
اپنی گرفت میں لے لیں۔ شائد ایک آدھ افسانہ
نکل جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ایک عام
قاری اخبار یا رسالہ کو میز پر پھینکتے ہوئے
کندھوں کو جھٹکا دے کر یہی کہتا ہے کہ
یہ کیا بکواس ہے!

قاری کے اس اندازِ فکر کو کبھی نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پسند
یا ناپسندیدگی کی وہ وجہ نہ بتا سکے جو ایک نقاد
کے یہاں کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس
سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قاری کے پاس بھی ایک
کسوٹی ہوتی ہے جسے وہ علمی اور ادبی زبان
میں اپنی پسند یا ناپسند کا [illegible] کیا تھا
[illegible] کے علاوہ پیش نہیں کر سکتا۔ مگر دنیا
کی کسی زبان کا کوئی افسانہ نگار قاری کی ذہنی
اور شعوری سطح سے منحرف نہیں ہو سکتا جو لکھنے اور
پڑھنے کے عمل میں ان کا [illegible] برابر کا شریک
ہے یہی وہ تعلق ہے جو افسانہ نگار کو قاری
سے قریب کر دیتا ہے اور ساتھ ہی افسانہ
نگار کی ذمہ داریوں میں ایک گونا اضافہ
ہو جاتا ہے اور جب وہ ان ذمہ داریوں
کو پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کے
افسانے فکر و نظر کے مرکز بن جاتے ہیں۔ مگر
یہ کیسے اور کیونکر ممکن ہے؟

یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور
سوال ابھرتا ہے کہ آخر افسانہ نگار کی
ذمہ داریاں کیا ہیں؟

ظاہر ہے ان سوالوں کا جواب صرف
اسی وقت ممکن ہے جب ہم بنیادی طور پر
یہ سمجھ لیں کہ آخر افسانہ کیا ہوتا ہے؟

اب تک دنیا کی مختلف زبانوں کے
بڑے بڑے نقادوں نے افسانے کی مختلف
تعریفیں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ افسانہ اختصار
اور ایجاز کا فن ہے کسی نے کہا کہ افسانہ
وہ ہے جسے کم سے کم ایک گھنٹہ میں پڑھ
لیا جائے اور کسی کو اس بات پر اصرار
ہے کہ افسانے میں وحدتِ کردار اور مکالمہ
ہونا چاہئے۔ کوئی اس حد تک رعایت دینے
تیار ہو جاتا ہے کہ افسانے میں کچھ ہو یا نہ ہو
لیکن اس میں افسانہ پن ہونا چاہیئے۔ لیکن
کہنے والا خود نہیں جانتا کہ افسانہ پن یا
افسانہ "جیسی" شئے آخر کیا ہے؟ اور
بعض حضرات افسانے کے کلائمکس پر کوئی
نہ کوئی چونکا دینے والی بات چاہتے ہیں
دوسرے الفاظ میں وہ افسانے میں
ڈرامائی عنصر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بہر حال افسانے
کے تعلق سے نقادوں کے یہ خیالات جھلکتا
ہے کہ افسانے کے کسی نہ کسی پہلو کی طرف
نشاندہی کرتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے
کہ یہ افسانے کی مکمل اور واضح تعریف نہیں
اور سچ پوچھئے تو دنیا کا کوئی نقاد افسانے
کی واضح اور مکمل تعریف نہیں کر سکتا۔
اگر زندگی کی تعریف ممکن ہے تو افسانے
کی تعریف بھی ممکن ہے اور کوئی زندگی کی
تعریف نہ کر سکے تو وہ افسانے کی تعریف کس
طرح کر سکے گا؟ یہ نہ افسانے کا المیہ ہے
اور نہ زندگی کا بلکہ نقاد کا المیہ ہے۔ جو [illegible]
اور [illegible] کی مدد سے ادب کی کسی صنف کو
ناپ کر کوئی قانون اور فارمولا وضع کرنے کی
کوشش کرتا ہے اور پھر دنیا کے کسی نہ کسی حصے
میں کوئی [illegible] فنکار پیدا ہوتا ہے۔ اور ان
وضع شدہ قوانین کو روندتا ہوا آگے بڑھ
جاتا ہے پھر نقاد کے لئے ایک نئی مصیبت
آ کھڑی ہوتی ہے پھر وہ اپنی [illegible] اور پیمانہ
لے کر بیٹھ جاتا ہے ناپ تول اور پیمائش کا یہ
سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔
جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض

کیا کہ زندگی کی تعریف ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کے بے شمار رنگ ہیں۔ اور افسانہ زندگی کے اسی ایک رنگ، ایک پہلو اور ایک گوشے کے اظہار کا نام ہے۔ افسانہ نیا اور پرانا، جدید اور قدیم نہیں ہوتا۔ افسانہ' افسانہ ہوتا ہے اور وہ اپنے عصر کو پیش کرتا ہے۔

افسانہ بالکلیہ اٹھارہویں صدی کی دین ہے۔ انیسویں صدی میں افسانے نے عالمی ادب کے جھرمٹ میں ایک صنف کی حیثیت سے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اور ہندوستان میں انگریزی زبان کے توسط سے یہ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں پہنچا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ہمارے ملک کی سیاسی' سماجی' معاشی اور تہذیبی زندگی تہس نہس ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک سماج مر رہا تھا اور دوسرا سماج اسی کی کوکھ سے جنم لے رہا تھا۔ ہر طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی روشنی پھیل رہی تھی۔ ایسے میں افسانہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے کینوس پر ابھرا۔ اور جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اردو نے افسانے کو نہ صرف گلے سے لگایا بلکہ اسے اپنے دل کی گرمی، نگاہ کا پیار، جذبوں کا لوچ، لہجے کی ملائمت، گفتگو کا سلیقہ اور آواز کی شیرینی عطا کی۔ اور آج اردو افسانہ اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ اس قابل ہے کہ اسے عالمی افسانوں کے مقابلے میں رکھا جائے۔

یہاں یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اردو افسانہ اپنی کم سنی میں ارتقاء کے کن کن زینوں کو طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا۔ اور نہ مجھے یہ بتانا ہے کہ آزادی کی لڑائی میں انگریز سامراج کے خلاف اردو افسانے نے کتنا اہم پارٹ ادا کیا۔ اور آزادی کے بعد اب وہ کن قوتوں کے خلاف اپنی لڑائی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہی نہیں میرا مقصد ان افسانہ نگاروں کے نام گنانا بھی نہیں جنہوں نے اردو افسانے کو اپنا خون جگر دیا۔ اور محض اس لئے کہ یہ میری تقریر کا موضوع نہیں۔ میں تو آپ کے سامنے صرف ایک ہی نقطہ کو پیش کرنا چاہتا تھا اور پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آخر افسانہ فکر و نظر کا مرکز کیوں بن جاتا ہے؟

میرے پاس اس سوال کا مختصر ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ آدمی خواہ اس کی زندگی کتنی ہی تباہ کیوں نہ ہو زندگی سے پیار کرتا ہے۔ اور جہاں کہیں اسے زندگی کی کوئی لہر کوئی بات اور کوئی کہانی ملتی ہے اس کی نگاہ خود بخود اس طرف اٹھ جاتی ہے۔ افسانہ چونکہ سو فیصد زندگی سے عبارت ہے اس لئے آج کا سائنسی ذہن ان داستانوں کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا جنہیں جانے یہاں ایک صدی پہلے اور بیرونی ملک میں اس سے کچھ پہلے بڑے شوق سے سنا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح اگر آج کے افسانے کو اس دور میں پیش کیا جاتا تو اس کا وہی حشر ہوتا جو آج داستان کا ہوا۔ اور کوئی افسانے کو نہ سنتا۔ کیونکہ اس دور میں انسان کی محنت کا کوئی معاوضہ اور واضح تصور نہیں تھا اور ایک طلسمی فضا میں عوام الجھے ہوئے تھے اور داستان گو مجبور تھا کہ شہزادوں اور شہزادیوں کے قصے سنائے تاکہ بادشاہ' نواب' راجا اور بڑے بڑے امراء کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ کیونکہ بے روزگاری کی دو دھاری چمکتی ہوئی تلوار ہمیشہ اس کے سر پر لٹکتی رہتی تھی۔ اس لئے اس نے بڑی ہوشیاری سے سوداگر جیسے کردار کے ذریعے اپنی بات پیش کی۔ اور کبھی طوطا' مینا اور بے زبان جانوروں کے توسط سے سچ کے چہرے سے جھوٹ کا پردہ اٹھایا۔ یہ وہ علامتیں تھیں جو اس دور کی ضرورت تھیں۔ علامتیں کسی فرد یا فن کار کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ اپنے دور کی پیداوار ہوتی ہیں اور یہی سماجی ارتقاء اور اس کے تسلسل کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ادیب' کا فرد یا دانشوروں کا کوئی گروہ اس بات کی کوشش کرے کہ اپنے ذہن کی اختراع کی ہوئی علامتوں میں بات کرے تو کوئی اسے نہیں سمجھے گا۔ یہ نازک مرحلہ عوام کی آزمائش کا نہیں بلکہ فن کار کی آزمائش کا ہوگا اور جہاں اسے عوام رد کر دیں گے۔

بات داستان گوئی کی ہو رہی تھی۔

لیکن جب صنعتی انقلاب آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے داستان گو کا فاقہ [illegible] شخصی حکومتیں اور بادشاہتیں ختم ہو گئیں تو تنخواہ یاب داستان گو محلوں سے نکل کر گلی کوچوں میں آ گیا۔ داستان گو کی موت اور افسانہ نگار کی پیدائش ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ

ہے۔ اس کے ساتھ ہی عالمی ادب کی اس نئی
صنف میں ایک عام آدمی کا کردار ابھرا جو کسی
کارخانے میں مزدور تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے
والا کسان تھا۔ دفتر کا کلرک تھا۔ اسکول کا
ٹیچر تھا۔ شہر کی چمکیلی سڑکوں پر بدحال گھومنے
والا بے روزگار تھا جس کا ایک نام تھا۔
ایک چہرہ تھا۔ اور جس کی اپنی ایک زندگی تھی
اور جو خواب دیکھتا تھا۔ ایک خوشحال گھر کے
چاہنے والی بیوی کے۔ اور خوبصورت صحتمند
بچوں کے۔ اس طرح سینکڑوں بے نام انسانوں
کو پہلی بار ایک نام ملا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ
یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہی عام آدمی
جہاں افسانے کا ہیرو ہے وہیں افسانے کا
قاری بھی ہے اور کوئی ایماندار افسانہ نگار
قاری کو جھٹلا کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ورنہ
افسانے کے بے جان کردار خود افسانہ نگار سے
پوچھنے لگتے ہیں کہ بھائی! تم نے ہمارے متعلق کیا
اوٹ پٹانگ لکھ دیا۔ اگر تم ہم پر قلم اٹھانا
ہی چاہتے تھے تو ہم سے ملتے۔ بات کرتے، ہمارے
دکھ سکھ کی باتیں سنتے۔ لیکن ہم سے ملاقات کئے بغیر
ہی اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوئے تم نے ہمارے
بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھ دیں جن میں سے ایک
بھی سچ نہیں۔ تمہاری مضحکہ خیز تحریر پڑھ کر
ہمیں ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ آخر ہمارے
بارے میں اس طرح جھوٹ بولنے کا حق تمہیں کس
نے دیا؟

یہیں سے افسانہ نگار کی ذمہ داری شروع
ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ
ان کی صحیح عکاسی کرے۔ لیکن زندگی کو من و
عن پیش کرنے کا نام بھی افسانہ نہیں کیونکہ
افسانہ کسی کیمرے سے نکالی ہوئی محض ایک
تصویر کا نام نہیں اور نہ افسانہ نگار ایک
فوٹوگرافر ہوتا ہے بے شک اسے اس بات کی
پوری آزادی ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی رخ
کو اپنے پڑھنے والے کے سامنے رکھے۔ وہ چاہے
تو ایک کروڑپتی کی بیٹی کا کسی کارخانے میں کام
کرنے والے مزدور سے معاشقہ کروا سکتا
ہے یا کسی کروڑپتی کو جو ان کو سڑکوں پر جھاڑو
لگانے والی میونسپل کارپوریشن کی ایک مزدور
عورت کی محبت میں گرفتار بھی کروا سکتا ہے
اور ان کی شادی یا جدائی پر کہانی کو ختم بھی
کر سکتا ہے۔ لیکن اس کہانی میں زندگی اور
سماجی رشتوں کے پیچیدہ عمل کی وہ سچائی نہیں
ہوگی جس کے علم کے بغیر افسانہ نگار اپنے کرداروں
سے انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بے جان اور
میکانکل قسم کی کہانی ہوگی جس کے تمام فقرے
اور الفاظ مردہ ہوں گے اس میں کہانی جیسی
خوبصورتی تو ہوگی لیکن زندگی کی سچائی نہیں
ہوگی!

اصل میں افسانہ نگار کے رویئے کو
بڑا دخل ہے جو افسانے میں بلاواسطہ یا
بالواسطہ کرداروں کے توسط سے یا ان کے
تضاد سے اپنے نقطۂ نگاہ کو پڑھنے والوں
کے سامنے رکھتا ہے لیکن افسانہ نگاروں کا ایک
گروہ ایسا بھی ہے جو اس نقطے کو نہیں مانتا
ایسے افسانہ نگار صرف اردو زبان میں نہیں
بلکہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں موجود
ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی نقطۂ
نگاہ نہیں، کوئی مقصد نہیں، کیونکہ ہم فن
کار ہیں۔ اور سچا فن کار ہمیشہ غیر جانبدار
ہوتا ہے!

سیاست میں اس لفظ کا اپنا ایک
مفہوم ہے لیکن ادب کی دنیا میں غیر جانبداری
کا اعلان ایک کھلا فراڈ ہے۔ ایسے افسانہ
نگار انسانی رشتوں کے تقدس کو نہیں مانتے۔
اس لئے ان کے پاس اچھے، برے، شریف
بدمعاش، ظالم، مظلوم، قاتل اور مقتول
سب برابر ہیں۔ اگر وہ ان میں کوئی فرق محسوس
بھی کرتے ہیں تو اپنے افسانوی کرداروں کے
باہمی تضاد سے اسے دکھانا ضروری نہیں
سمجھتے۔ کیونکہ ان کا اپنا خیال ہے کہ وہ صرف
زندگی کو پیش کرتے ہیں اور اس سے زیادہ
کچھ نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ وہ افسانہ لکھنے کی زحمت
ہی کیوں گوارا کرتے ہیں جب کہ ان کا اپنا کوئی
مقصد اور کوئی نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا؟

صرف زندگی کی ہو بہو تصویر پیش
کر دینے کا کیا مطلب جب کہ ہر شخص اسے
ہزار بار دیکھ چکا ہے۔ اور دیکھ رہا ہے
اس طرح پھر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے
کہ ایسے افسانہ نگار آخر قاری کو کیا دکھانا
چاہتے ہیں؟

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے
میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ سچا فن کار

غزلیں

احمد فراز

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزم مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کارواں نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس طرف ہم سفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کے مری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فراز
کہ وہ اٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

پروین شاکر

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمیں انکار کے نشے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

دریچے میں نے بھی وا کر لئے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرفِ تعلق ہو اضافی
محبت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پہ چھا رہی ہوگی سفیدی
کوئی خانہ خراب آنے کو ہے پھر

رشید کامل

رشتۂ دل بھی کسی دن خواب سا ہو جائے گا
تیرے میرے درمیاں وہ فاصلہ ہو جائے گا
پیلی پیلی رت جدائی کی اچانک آئے گی
قربتوں کا سبز موسم بے وفا ہو جائے گا
آئینے رنگوں کے خالی چھوڑ جائے گی دھنک
حیرتیں رہ جائیں گی، منظر جدا ہو جائے گا
کیا نشانہ ٹھیک بیٹھے گا ہوائے تیز میں
جو کماں سے تیر نکلے گا، خطا ہو جائے گا
تیری پیشانی پہ بھی پڑ جائیں گے تلخی سے بل
میری سچی بات پر تو بھی خفا ہو جائے گا
گھر سے نکلوں گا، ہتھیلی پر لئے اجلا چراغ
علم ہے کالی ہوا کا سامنا ہو جائے گا
آنے والے جانے والوں کا بدل ہوتے نہیں
پُر نہیں ہوگا جو پیدا اک خلا ہو جائے گا
ٹوٹ جائے گا در و دیوارِ زنداں کا غرور
ایک آواز آئے گی، قیدی رہا ہو جائے گا
میں نہیں تو اور رہ جائے گا کوئی چھاؤں میں
آج کا چھوٹا سا پودا کل بڑا ہو جائے گا
آستینوں سے نکالیں گے، جیالے آفتاب
بول بالا روشنی کے شہر کا ہو جائے گا
چاند کو ڈھونڈیں گی آنکھیں پھر نہ سورج کو رشید
چاند سورج سے تعلق دوسرا ہو جائے گا

احمد فراز، پروین شاکر اور رشید کامل کی یہ تازہ غزلیں "قوم" کے لئے ایک ادب دوست نے روانہ فرمائی ہیں جنھیں ہم قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

(ادارہ)

وہ جفاکار نہیں

اسلم عمادی

وہ جفاکار نہیں جس نے تبسم توڑا
ایک اک کانچ کے چہرے کے نشانات مٹے

وہ نزاکت، وہ نفاست کہ ہر اک پیرِ تورخ
گفتگو کرتے تکلف میں کہ لب کھلنے نہ پائیں
اور آواز نہ بڑھ پائے معتزر سے کبھی

وہ تبسم بھی کچھ اس طرح بکھر کر ٹوٹا
جس کی اک ایک ادا ایسے لٹی یاد نہیں

ہم پہ الزام ہے حساس بہت ہیں
بلکہ

وہ جفاکار نہیں !!!

مشورہ

انہیں پکارو جو کھو چکے ہیں
ہم اپنے امکان پر کھڑے ہیں

ابھی تو ہر طرح مل سکیں گے !!

تنکے کا سہارا

نجم الہدیٰ

وہ ترے ترشے ہوئے لب، تری معصوم آنکھیں
ناک ستواں سی دکھتے ابرو و چشم جادو
[illegible] تری پیشانی پہ
[illegible] ہوئی پیشانی تری
چاند سا چہرہ ترا میرے اندھیرے گھر میں
جیسے سائل کو طلائی کوئی سکہ مل جائے
اس میں ڈوبے ہوئے کچھ بول ترے میٹھے سے
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے یہ خواب ترے
دیکھتا ہوں میں تری راہ نہ جانے کب سے
عمر کوتاہ کے چالیس برس بیت گئے
میری امیدوں کے محود ہوئے ہیں
میری آنکھوں کے نور

کون جانے مری تقدیر میں تو ہے کہ نہیں
کس طرح مجھ کو یقیں آ جائے
میری تخییل کی دنیا میں جو ابھرے ہیں نقوش
دہر کے "واقعہ خانہ" میں بسا ٹھہر پائیں گے ؟
کاش ایسا ہو کہ تیرا یہی موہوم وجود
زخم کھائے ہوئے دل کا مرے مرہم ہو جائے
لمحہ لمحہ میری بجھتی ہوئی شمعِ ہستی
تیرے آنے سے ذرا دیر کو لو دے اٹھے
سخت حالات کا کچلا ہوا لاچار بدن
تجھ کو گر پائے تو اک بار توانا ہو جائے

اور معصوم سا، ننھا سا یہ کومل سا وجود
ڈوبتے شخص کو تنکے کا سہارا ہو جائے
کون جانے کہ تو اب آئے بھی میرے گھر میں
تجھ کو پروان چڑھانے تلک جی پاؤں گا
اور دستورِ جہاں کے مصداق
میری پیری کا "عصا تو" ہو گا !!

ظہور نظر

(افسانہ)

گرم ہتھیلیاں سرد ہاتھ

کئی دنوں سے موسم بے حد سرد تھا اور صبح کے وقت بہت گہری دھند پڑتی تھی کمرے سے نکل کر صحن کے گلی میں کھلنے والے دروازے تک پہنچتے ہی اُسے آنکھوں پر کچھ زیادہ ہی زور دینا پڑا۔ دھند اتنی گہری تھی کہ آسمان تو آسمان زمین بھی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

گھر بار چھوڑنے سے پہلے وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ کون سی دھند زیادہ گہری ہے [illegible] دروازہ کھول کر گلی میں آ جانے کے بعد بھی وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ راستہ دیکھنے کے لئے آنکھوں پر زور دینا پڑتا تو اسے باہر کی دھند زیادہ گہری معلوم ہوتی لیکن جب آنکھیں ذہن کے اندر [illegible] کی نئی ٹائپسٹ کا چہرہ اور دل میں [illegible] چاہ کا سورج ابھرتا تو اسے [illegible] کی دھند زیادہ گہری لگتی۔

گلی سے سڑک تک پہنچنے میں آج اسے معمول سے زیادہ وقت لگا۔ دھند آج کچھ زیادہ ہی گہری تھی اور اوپر سے بھی کچھ زیادہ گھبرانے کی وجہ سے آنکھوں کے باہر والے کونے باہر کی طرف اور اندر والے اندر کی طرف اتنے کھنچے کہ اس کا پورا چہرہ تن گیا۔

سڑک پر آنے جانے والی کاروں کی ہیڈ لائٹیں جل رہی تھیں [illegible] رفتار کا انداز سست اور سہما سہما سا تھا۔ وہ مغرب کی طرف جا رہا تھا ایک دم اس کے ذہن میں مشرق کی طرف دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، سورج دیکھنا چاہتا تھا وہ لیکن جب اس نے گردن گھما کر مشرق کی طرف دیکھا تو وہاں سورج کا نام و نشان نہیں تھا مشرق اور مغرب اسے ایک ہی طرح کے لگے اس نے آنکھوں پر اور زور دے کر سورج تلاش کرنے کی کوشش کی تو ڈھیلوں نے آنکھوں سے نکل کر سڑک پر گر جانے کی دھمکی دے دی۔ اس نے گھبرا کر چہرے کا رُخ پھر مغرب کی طرف پھیر لیا اور اپنی سانس اور دھڑکن کے درمیان ہونے والا مکالمہ سننے لگا۔

دھڑکن کے بولنے کا انداز خالصتاً ڈرامائی تھا لیکن سانس کا لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا جیسے پہلی بار اسٹیج پر آئی ہو۔ دھڑکن کہہ رہی تھی، "دھند کو اتنا گہرا بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ سورج بے بس ہو کر رہ جائے اور مشرق و مغرب کی تمیز مٹ جائے سمتیں بے سمت ہو جائیں اور اجالا بے شکل ہو جائے۔"

سانس نے کہا، "وقت کے اختیارات بہت وسیع ہیں وہ چاہے تو اُجالے کو بے شکل ہی نہیں سیاہ بھی کر سکتا ہے سمتوں کو یکجا کر دینا تو کوئی بات ہی نہیں وہ چاہے تو دریا الٹے بہنے لگیں، سمندر ریگزار بن جائیں اور ریگزار سمندروں میں تبدیل ہو جائیں۔"

دھڑکن اور سانس کے درمیان مکالمہ بازی کا یہ سلسلہ اسٹینڈ تک جاری رہا، جب بس آئی۔ دھڑکن کہہ رہی تھی، "کائنات کو قدرت سے وقت کے اختیارات کم کرنے کی اپیل کرنی چاہیئے۔" سانس نے جواب میں جو کہا وہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا بس پر سوار ہونے کی دھکم پیل میں سانس کا لہجہ کچھ زیادہ اکھڑ گیا تھا۔

آفس میں قدم رکھتے ہی اس کی کھنچی ہوئی آنکھوں کے کونے سمٹنے لگے اور چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا آفس کی ہر کمرے کی لائٹیں پوری آب و تاب سے روشن تھیں۔ سب کھڑکیاں اور سب دروازے بند تھے سنٹرلی ہیٹیڈ ہونے کی وجہ سے پورا آفس کسی محبت بھری آغوش کی طرح گرم تھا اس نے بیٹھنے سے پہلے اوور کوٹ اتار کر اپنی کرسی کی پشت پر لٹکا دیا اور نئی ٹائپسٹ کی طرف دیکھتے ہوئے حوصلہ جمع کرنے لگا۔ عین اسی لمحے اسے باس کے کیبن سے باہر آویزاں ایک بزر کی آواز سنائی دی اور بزر پر لگا ہوا نیلے رنگ کا ننھا سا بلب روشن ہو گیا۔ بلب کا رنگ دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن معتدل ہو گئی جو بزر کی آواز سن کر تیز ہو گئی تھی۔ استعمال کرنے والی بزر پر بجنے والے

ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی لوح
پر مسز برنٹ کی تصویر ابھر آئی۔ بیچاری
بڑھیا جو کسمپرسی کی حالت میں خیراتی ہسپتال
میں پڑی تھی اور اس کا دولت مند شوہر پرمسرت
زندگی گزار رہا تھا، مسز برنٹ کا خیال رہ رہ
کر اسے پریشان کر رہا تھا۔ جب وہ خود وہاں
تھی تو ہر لحاظ سے اس کا خیال رکھتی تھی دوسرے
مریضوں کی نسبت اس پر زیادہ توجہ دیتی لیکن
اب وہ بیچاری نہ جانے کس حالت میں ہوگی۔

ایک روز جب وہ نہ رہ سکی تو اپنے
فلیٹ سے نکل کر مسٹر برنٹ کے دروازے
پر پہنچ گئی۔ گھنٹی کے جواب میں جب مسٹر برنٹ
نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک عورت کو دیکھ
کر اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اس نے اجڈ
سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا چاہتی ہو؟"

"میں مس وینڈل ہوں۔" اس نے اپنے
غصے پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں جواب
دیا "میں بالڈون اسٹیٹ ہسپتال میں تمھاری
بیوی کی تیماردار تھی۔"

"ایک ہفتہ پہلے جب میں وہاں گیا تھا
تو وہ بالکل ٹھیک تھی کیا تم اس کے بارے میں
کوئی نئی اطلاع لے کر آئی ہو؟"

"جی نہیں، مجھے سرکاری طور پر یہاں
[illegible] سے ریٹائر ہو چکی
ہوں، ابھی یہ سوچ کر چلی آئی تھی کہ......"

مس وینڈل خاموش ہو گئی [illegible] بیان
[illegible]

اور حقیقت تو یہ تھی کہ مسٹر برنٹ کے غیر
مناسب رویہ اور سرد مہری سے وہ کچھ سہم
سی گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش وہ
یہاں نہ آئی ہوتی۔ وہ اسی کے بارے میں
سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کس طرح مسٹر برنٹ
کے رویے میں کچھ تبدیلی آگئی۔ اس نے لہجے
میں نرمی پیدا کرتے ہوئے اسے اندر آجانے
کو کہا اور وہ کچھ سوچ کر دروازے سے اندر داخل
ہوگئی، مکان گو دو تین کمروں پر ہی مشتمل تھا
مگر نہایت نفاست اور سلیقے سے آراستہ
کیا گیا تھا گھر کی ہر چیز سے امارات ٹپکتی
تھی، مس وینڈل کو پہلی بار اچھی طرح اندازہ
ہوگیا کہ مسٹر برنٹ کس قدر دولت مند شخص
تھا اس کے ذرائع آمدنی کیا تھے؟ اس
کے بارے میں اس نے کبھی سوچنے کی زحمت
نہیں کی، اسے تو مسز برنٹ کی خوش قسمتی
پر رشک آرہا تھا جس نے زندگی اس
قدر خوشحالی اور آسائش میں بسر کی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اگر مسز برنٹ کو یہاں
لے آئے تو اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی۔"
مس وینڈل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے
خیال ظاہر کیا۔

"وہ جہاں ہے وہیں اچھی ہے تمھیں
کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔" مسٹر
برنٹ کے لہجے میں پھر سرد مہری آگئی۔

"میرا خیال ہے تمھیں اس سے زیادہ
[illegible] لگاؤ نہیں؟"
[illegible]

پھر برنٹ اسے گھور کر رہ گیا وہ جب تک اس
قدر بداخلاق ثابت ہوا تھا کہ اس نے
مس وینڈل کو بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا ممکن
ہے اس نے یہ سوچا ہو کہ مس وینڈل گداز
صوفے پر بیٹھ کر دوبارہ اٹھنا ہی بھول
جائے چند لمحے وہ اسی طرح کھا جانے والی
نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر [illegible]
سے بنے ہوئے آتشدان کے قریب پہنچ کر بولا
"میں کہہ چکا ہوں کہ وہ جہاں ہے وہیں
اچھی ہے۔"

مس وینڈل اس کے لہجے پر توجہ دیئے
بغیر ملحق ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچ گئی اور
پردہ ایک طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ "میں
تمھارے پڑوس میں رہتی ہوں۔ میرا
فلیٹ تمھاری اس کھڑکی کے بالکل سامنے ہے"

مسٹر برنٹ نے اس اطلاع پر اس
طرح سر ہلایا جیسے اسے افسوس ہو رہا ہو۔
"تمھیں مسز برنٹ سے کیا ہمدردی ہے میں
سمجھتا ہوں تم بلاوجہ ہی تو یہاں نہ آئی ہوگی۔"

"اب تک تو میں خود بھی طے نہیں کر پائی
کہ یہاں کیوں آئی تھی لیکن یہ ضرور پوچھنا
چاہوں گی کہ اگر مسز برنٹ کو ہسپتال سے
ڈسچارج کر دیا جائے تو کیا اس کا کوئی ایسا
رشتہ دار ہے جو گھر پر اس کی دیکھ بھال
کر سکے؟"

"اس دنیا میں اس کا کوئی رشتہ دار نہیں
اور نہ ہی مجھے [illegible]
[illegible]

نشانات بھی اپنے کمرے میں بند رہی۔ وہ
اپنے آپ میں ہمت نہیں پا رہی تھی کہ اٹھ کر
کھڑکی یا دروازے سے باہر جھانک سکتی۔

دوسرے روز دوپہر تک کا وقت اس
طرح گزرا جیسے صدیاں بیت رہی ہوں۔ اس
کے اعصاب کا کھنچاؤ ناقابل برداشت حد
تک بڑھ گیا تھا۔ جب اس کی قوت برداشت
بالکل ہی جواب دے گئی تو وہ اپنے فلیٹ سے
باہر نکل آئی۔ اس کے قدم بے اختیار برنٹ
کے مکان کی طرف اٹھتے گئے۔

مکان کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے
جھانک کر دیکھا مس وینڈل والی بلڈنگ کا
نگراں کمرے میں بکھرے ہوئے استعمال شدہ
کیمرہ، فلش کے بلب اور کچھ دوسری چیزیں
جمع کر رہا تھا۔ اسے اپنی بلڈنگ کے نگراں کو
دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر
داخل ہو گئی۔

"او مس وینڈل! کیا تم اپنے فلیٹ
میں اکیلی بیٹھی گھبرا رہی تھیں؟" نگراں نے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ نہیں تو..."

"کیا مسٹر برنٹ تمہارا دوست تھا" نگراں نے
تفصیلات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے اس سے زیادہ قریبی
تعلقات نہیں تھے۔ لیکن پولیس کہاں ہے؟
پولیس کو خبر کر دی گئی ہے
یہاں اس کا کیا کام!"

"مگر یہ تو قتل کا کیس ہے اور
پولیس....."

"قتل! کیا تم نشے میں تو نہیں ہو" نگراں
نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا مسٹر برنٹ کو قتل نہیں کیا گیا؟"

"قتل۔ نہیں مس وینڈل، اس نے
خودکشی کر لی۔ آتشدان کی دیوار سے سر ٹکرا
کر، بیچارہ بیوی کی طرف سے بالکل ہی مایوس
ہو گیا تھا۔"

"لیکن کیا پولیس نے تحقیقات نہیں
کی، کسی سے پوچھا نہیں، کسی کو یہاں آتے
جاتے نہیں دیکھا گیا؟"

"پولیس نے تحقیقات ضرور کی تھی۔
لیکن کوئی انوکھی بات معلوم نہیں ہو سکی۔
نہ ہی کسی کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھا گیا
تھا۔ پولیس کی نظروں میں یہ خودکشی کا ہی کیس ہے"

مس وینڈل نے کوئی جواب نہیں دیا
وہ خاموشی سے اپنے فلیٹ میں واپس چلی آئی۔
یہ ایک ناقابل یقین سی بات تھی کہ پولیس نے
قتل کی واردات کو خودکشی کا نام دے کر
تفتیش ختم کر دی تھی۔ لیکن اچانک ہی اس
کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ بعض اوقات
پولیس مجرموں کو دھوکہ دینے کے لئے اس قسم کے
ہتھکنڈے بھی استعمال کرتی ہے۔ یہ سوچ
کر ہی اس کا دل کانپ اٹھا کہ جب پولیس کو
شمعدان پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملیں
گے تو وہ اپنے آپ کو قانون کے شکنجے سے
نہ بچا سکے گی۔ صرف شمعدان ہی نہیں۔ آتش
دان پر بھی اس کی انگلیوں کے نشان موجود
تھے۔ مسٹر برنٹ کے سر کے زخم کو چھونے کے بعد اس
نے اپنا خون آلود ہاتھ آتش دان کی دیوار پر
بھی صاف کیا تھا۔

اعصاب کی کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی
اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس ذہنی اذیت سے
نجات حاصل کرنے کے لئے بہتر تو یہی ہے کہ وہ
پولیس کی آمد سے پہلے ہی پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے
جرم کا اعتراف کر لے۔ جب وہ پولیس کو تمام
تفصیلات بتائے گی تو اس کی بات کا یقین کر لیا
جائے گا لیکن یہ سوچنے کے بعد بھی وہ اپنے فلیٹ
سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکی۔

دفعتاً اس کے ذہن میں بوڑھی مسز برنٹ
کا خیال ابھر آیا۔ اب اسے یقیناً کسی ایسے تیمار دار
کی ضرورت تھی جو چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال
کر سکے۔ تو کیا وہ مسز برنٹ کے سہارے اپنا مستقبل
سنوار سکے گی؟ اپنے اس احمقانہ خیال پر وہ
خود ہی مسکرا دی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مسز
برنٹ اپنے شوہر کے قاتل کو اپنی دیکھ بھال کے
لئے رکھ لیتی۔

دو دن گزر گئے۔ اس عرصہ میں وہ
مسلسل ذہنی اذیت میں مبتلا رہی۔ اسے ہر
وقت یہی دھڑکا لگا رہا کہ پولیس اب تک ہی
اس کے فلیٹ پر پہنچ کر اسے گرفتار کرنے ہی والی ہے لیکن
اس کے لئے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان دو دنوں
میں اس نے پولیس کی کارروائی کے بارے میں کچھ
نہیں سنا۔

تیسرے دن ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔
بوڑھی مسز برنٹ کو ہسپتال سے گھر لایا گیا

غبارِ خاطر

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

علامتی کہانی

برادرم ناصر

بہت شرمندہ ہوں کہ تمہارے اصرار کے باوجود علامتی کہانی کے موضوع پر اب تک کچھ نہ لکھ سکا اور یہ چند سطریں بھی شاید ایسی نہیں کہ "پونم" میں شائع ہوں۔ ان دنوں میری حالت کچھ عجیب سی ہے۔ بہت عرصہ تک ہمارے گلے سڑے سماج کی نیا گئی میں آتش نوا پیغمبروں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ لیکن اب اسی گرتی ڈھلتی دیوار کے سایہ میں سستا رہا ہوں، تھک گیا ہوں، آبلہ پائی چلنے نہیں دیتی اور پھر ہمارے شہر کی ریت بھی بدل گئی ہے۔ موضوعاتی اور نظریاتی تنقید کو لوگ ذات پر کیچڑ اچھالنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ مخدوم کے معاملہ میں سنگسار ہونے کے بعد ہمت نہیں ہوتی کہ دنیائے ادب میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والوں کے تعلق سے اتنا بھی کہہ سکوں کہ بھائی بڑائی زبردستی منوائی نہیں جاتی بلکہ دل جسے بڑا مان لیتا ہے وہی بلند قامت تخلیق کار ہوتا ہے۔ چند دنوں پہلے دفتر سیاست میں ڈاکٹر محمد حسن سے کچھ دیر بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ کرشن چندر اور بیدی کی نسل کے بعد جو بیچ میں کہانیاں اور افسانے لکھے گئے وہ اپنے پڑھنے والوں کو بالکل متاثر نہیں کر سکی ہے۔ ان کی اس رائے سے کسی کو اتفاق ہو کہ نہ ہو، میں تو ان کا ہم خیال ہوں۔ علامت کیا ہوتی ہے؟ ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں ہمارے ویژن کا امتزاج۔ مگر ہمارے نئے لکھنے والے نثر و نظم میں، محض چند مغربی ادیبوں اور شاعروں کے نام لے کر، اپنے ذہن کی گرہوں کی بھونڈی عکاسی ہی پر قناعت کر رہے ہیں کافکا اور لارنس کو کتنوں نے پڑھا ہے لیکن رسالہ کے پچھلے نصف درجن شماروں میں میرے دوست اقبال متین کے نئے کہانی والے مضمون پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ، کم از کم مجھے تو ایسا لگا کہ چند بڑے لوگوں کے نام لے کر لکھنے والے اپنے قاری کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں ہمارے ایک کرم فرما ہوا کرتے تھے۔ جناب احمد ہمیش! غالباً تم نے بھی انہیں دیکھا نہیں تو ان کی "مکھی" کی بھنبھناہٹ تو سنی ہوگی۔ یہ حضرت اپنے آپ کو لکھنے والوں کی نئی پیڑھی کا نقیب ثابت کرنے کی کوشش میں، گمراہی کی غلاظت میں اپنا قلم ڈبو کر لکھنے لگے اور خون دل میں انگلیاں ڈبو کے [illegible] سے واردات قرات و آفاق تحریر کرنے والوں کو وارپہ کھنچوانے کی تدبیریں سوچتے رہے۔ عذرا پاؤنڈ کافکا اور لارنس، ان کی نوک زباں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن کسی ادب کو ہضم کئے جانے سے متاثر کرنے کے سوا، کچھ نہ دے سکے۔ نئے علائم کی تلاش و دریافت کوہ کندن و کاہ برآوردن" سے کم نہیں۔ اپنا جگر خون کیجئے تو ایک آدھ نئی علامت ہاتھ لگتی ہے

میں نے اسی ہفتہ، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے خالق ڈاکٹر سبھاش مکرجی سے چند منٹ تک ملاقات کی تھی اور جب وہ اپنے تجربہ کی تفصیلات سناتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگے کہ کسی شادی شدہ جوڑے کے SPURM کو ڈیپ فریزر میں رکھ کر، مرد کے مر جانے کے بعد بھی عورت اپنے رحم میں اس محفوظ SPURM کو داخل کرا کے بھی مرحوم کے بچے کی ماں بن سکتی ہے تو میرا منہ کھلا رہ گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی سائینس فکشن سن رہا ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے! ہمارے کہانی نویس، کیا عہد حاضر کی کسی ایسی مریم کے لئے کوئی موزوں علامت وضع کر سکتے ہیں جس نے بیوگی میں بھی جائز بچہ کی ماں بننے کا اعزاز حاصل کیا ہو۔

میں افسانے اور کہانیاں بہت کم پڑھتا ہوں لیکن پچھلے دنوں مجھے پاکستانی ادیبہ رضیہ فصیح الدین کی ایک کہانی پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں، پاکستان کو ہجرت کرنے والی ایک سٹھیائی ہوئی پھوپھی ماں کا خاکہ پیش کیا گیا تھا جسے اس کے بھائی بہنیں، بھاوجیں، ان کے بچے غرض سبھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ اجنبی لوگوں کے "شہر کراچی" میں اپنے اس گھر

(باقی ص ۳۱ پر)

محمد اکرام اللہ خاں

فلمنامہ

وجے کپور منصور نے اپنی فلم "کال گرل"
بنائی تھی خواجہ احمد عباس سے خواہش کی کہ وہ
اس فلم کی کہانی لکھیں۔ خواجہ صاحب نے کہا "بھئی
میں نے آج تک کسی کال گرل کو نہیں دیکھا پھر کہانی
کیسے لکھوں۔" وجے نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آج
دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ایک عالیشان ہوٹل
کے باہر گھنٹوں کھڑے رہے سینکڑوں لڑکیاں
سامنے سے آتی جاتی رہیں لیکن ان کی سمجھ میں یہ
نہ آسکا کہ ان میں کال گرل کون کون ہیں۔ آخر
تھک ہار کر دونوں گھر لوٹ گئے۔ دوسرے
دن وجے پھر خواجہ صاحب کے ہاں پہونچے
اور کہنے لگے کہ "چلئے آج آپ کو کال گرل
دکھا دوں گا [illegible] اس سے ملا بھی دوں گا"
عباس صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے اور
پھر مسکرا کر کہنے لگے "بھئی وجے میں نے کل رات
کہانی لکھ لی ہے" وجے حیران تھا کہ آخر انھوں
نے کب کال گرل کو دیکھا اور کہانی کیسے لکھ لی۔
فلم [illegible] اور [illegible] تھا کہ فلم بزنس
کے اعتبار سے مایوس کن نہیں رہی۔

*

اسی طرح کا ایک واقعہ [illegible] ساتھ
[illegible] کی جب [illegible] تھی
[illegible] اکرام صاحب [illegible] کسی
طوائف کے کوٹھے پر چلتے ہیں۔" پہلا گھبرایا
کہ انھیں آج بیٹھے بٹھائے یہ ہو کیا گیا۔ یا تو
یہ عالم کہ ساری یونٹ سے کہہ دیا کہ جب
تک فلم مکمل نہ ہو جائے کوئی شراب نہ پئے
گوشت نہ کھائے ۔۔ یا پھر اب یہ اصرار کہ
چلو کسی طوائف کے کوٹھے پر چلتے ہیں۔ میرے
خاموش رہنے پر اصرار اور زیادہ بڑھ گیا
میں نے کہا عباس صاحب میں اسی شہر میں رہتا
ہوں اور آئندہ بھی مجھے یہیں رہنا ہے آپ
کا کیا ہے کل فلم بن جائے گی اور بمبئی چلے جائیں
گے۔ پھر اگر کسی جان پہچان کے آدمی نے
طوائف کے گھر آتے جاتے دیکھ لیا تو میری تو
شامت ہی آجائے گی۔ بڑی حیرانی سے
پوچھنے لگے ۔۔ کیا آج تک تم نے کسی
طوائف کو نہیں دیکھا؟ ۔۔ میں نے کہا کیوں
نہیں شادی بیاہ میں مجرا ہوتا ہے بس
وہیں دیکھا ہے ان کے کوٹھے پر آج تک
نہیں گیا۔ "پھر تو آج ضرور جانا ہے۔" بڑے
فیصلہ کن انداز میں عباس نے کہا۔ میں نے
ذرا اور سنجیدہ ہو کر پوچھا بندہ پرور آخر
یہ کیا مذاق ہے۔ مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے
گا آپ کہیں تو [illegible] چلے جائیں۔ خوب ہنسے
اور کہنے لگے بھئی اکرام صاحب آپ جائے
[illegible] میں بعد آپ کے
[illegible] آج کم از کم ہماری
[illegible] ۔ کل طوائف کے
کوٹھے کا سین لکھنا ہے بس یہی دیکھنا
ہے کہ وہاں کا نقشہ کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ
ایک دوست کی مدد سے پہلے ایک جگہ گئے
گانے کی فرمائش کی۔ عباس صاحب کی نظر میں
گانے والی کچھ جچی نہیں تھی۔ غور سے گانا
سنا ۔۔ باہر چلے آئے۔ کہنے لگے اس لڑکی کو
دیکھنے سے مجھے ایک کہانی مل گئی۔ اب ذرا
دوسری جگہ چلو۔ جب دوسری جگہ گئے تو
وہاں کے رکھ رکھاؤ سے بیزار ہو کر باہر
نکلے۔ کہنے لگے بھئی تمہارے شہر میں ایک بھی
طوائف کسی کام کی نہیں۔ جسے بھی دیکھو ایسا
محسوس ہوتا ہے آپ کے اشارے کی منتظر ہے
یہ کوٹھے تو مجھے جسم فروشی کے اڈے معلوم ہوئے ہیں
دوسرے دن انھوں نے کوٹھے کا سین لکھا وہ
کوٹھے کے گندہ ماحول سے بیحد متاثر تھے۔
ان کی فلم میں یہ منظر بقول خود ان کے جسم فروشی
کا اڈہ ہی نظر آنے لگا۔

* ہماری فلم انڈسٹری میں ایک اور اسٹوری
رائٹر ہیں وشوا متر عادل جنھیں پہلی مرتبہ
فلموں میں خواجہ احمد عباس کی سفارش سے
کام ملا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ضیاء
سرحدی فلم "ہم لوگ" بنا رہے تھے اور انھوں
نے وشوا متر سے اس فلم کے گیت لکھوائے
تھے۔ پھر انھوں نے کئی فلموں کی کہانیاں اور
مکالمے لکھے جن میں "شاردا" "آرتی" "گیت
گایا پتھروں نے" "شاگرد" اور بھی دوست
قابل ذکر ہیں۔ ایک گولڈن جوبلی فلم بنی تھی
"سنگم" جس کے مکالمے انھوں نے صرف تین
دن میں لکھ کر دے دیئے تھے۔ ایک ڈائر
یکٹر [illegible] کی خواہش پر انھوں نے دس

فلمی ڈائری

پچھلے مہینے ۱۴ر دسمبر کو راج کپور کے جنم دن پر آر کے اسٹوڈیوز میں تین فلموں (پروڈکشن نمبر ۱۹، ۲۰ اور ۲۱) کی مہورت ایک ساتھ انجام دی گئی۔ ان میں سے ایک فلم ۷۰ ایم ایم میں ہوگی جس کی ہدایت خود راج کپور دیں گے۔ دوسری دو فلموں میں ایک کے ہدایت کار رندھیر کپور ہوں گے اور دوسری کے راہول راویل۔ مہورت کے لئے موسیقاروں میں شنکر، آر ڈی برمن اور لکشمی کانت نے ناریل پھوڑے اور پھر مہورت شاٹس لیے گئے۔ اس موقعہ پر آر کے کی یونٹ کے چند لوگوں نے عقیدت سے راج کپور کے پاؤں چھوئے تو راج کپور نے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس کے پاؤں چھوئے۔ خواجہ احمد عباس نے مسکراہٹ کے ساتھ جب راج کپور سے دریافت کیا کہ اس نے تین فلمیں ایک ساتھ کیوں شروع کیں تو اس نے اپنی ہی فلم "شری ۴۲۰" کے ایک گانے کے بول دہرا دیئے "نکل پڑے ہیں دھن میں اپنی اپنا سینہ تانے منزل کہاں کہاں رکنا ہے اوپر والا جانے"۔ ان فلموں کی کاسٹ اور دوسری تفصیلات کا ابھی اعلان نہیں کیا گیا ہے۔ اس تقریب میں راج کپور کے ارکان خاندان اور دوست احباب کے علاوہ بہت سی فلمی شخصیتیں موجود تھیں لیکن ششی کپور کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

★

کرشنا شاہ کی ہند امریکی اشتراک سے بننے والی فلم "شالیمار" جس کے چرچے دن رات ہو رہے تھے ریلیز ہو چکی ہے لیکن فلمی نقادوں کا کہنا ہے کہ فلم ایسی شاہکار نہیں ہے جیسا کہ پبلسٹی میں "حقیقت سے" کے عنوان سے ظاہر کی جا رہی ہے۔ تکنیک اور فوٹوگرافی کے اعتبار سے تو فلم یقیناً قابل تعریف ہے مگر کہانی، اسکرین پلے اور کرداروں کی پیشکش کے لحاظ سے فلم میں اتنی جان نہیں ہے کہ تماشائیوں کو محظوظ کر سکے۔ رومانس اور کامیڈی کا فلم میں کوسوں پتہ نہیں ہے ایکشن سین صرف اوسط کہے جا سکتے ہیں دھرمیندر شروع سے آخر تک تیز طرار نظر آتا ہے لیکن زینت امان پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔ بیرونی اداکاروں میں ریکس ہیریسن قابل تعریف ہے لیکن اس کے مکالمے جنہیں قادر خان نے دہرایا ہے ہونٹوں کی نامناسب حرکتوں کی وجہ سے اس کے کردار کے اثر زائل کر دیتے ہیں۔ سلویا مائلس اور جان سیکسن بے مصرف ہیں مکالمے دلچسپ ہیں اور موسیقی اچھی ہے۔ فلمی نقادوں کی یہ رائے تماشائیوں کے رد عمل سے کس حد تک میل کھاتی ہے یہ تو باکس آفس کی رپورٹ ہی بتائے گی۔ لیکن اگر اس فلم کا حشر ہند روس اشتراک سے بننے والی پہلی فلم "پردیسی" جیسا نہ ہوا اور "شالیمار" باکس آفس پر ہٹ یا کم از کم کامیاب بھی ہو گئی تو پھر بیرونی ممالک کے اشتراک سے بننے والی فلموں کی ایک لہر چل پڑے گی۔ ویسے آج کل ایف سی مہرا روسی اشتراک سے ایک فلم "علی بابا اور چالیس چور" بنا رہے ہیں۔ اس فلم کی شوٹنگ تاشقند میں ہو رہی ہے جہاں اس کے لئے ایک غار بنایا گیا اور اس غار کو روشن کرنے کے لئے دوسری بہت ساری روشنیوں کے ساتھ ۴۲ بروٹ لائٹس کا استعمال بھی کیا گیا۔ بروٹ لائٹس کی یہ تعداد سارے ہندوستان میں استعمال ہونے والے بروٹ لائٹس سے دوگنی سے زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ہاں صرف ۲۰ بروٹ لائٹس ہیں۔

★

فرقہ وارانہ ہنگاموں کی روک تھام کرنے کے لئے کونسے ٹھوس اور مستقل اقدامات کئے جانے چاہئیں یہ تو ارباب اقتدار یا سیاست دان جانیں لیکن فلمی دنیا کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے فلموں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ علی گڑھ کے فسادات کے دوران اگر وہاں [illegible] کی فلم [illegible] بتائی جاتی تو وہاں ہندو مسلم اتحاد [illegible]

صورت نکل آتی۔ آزادی سے پہلے جب ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے تو اس فلم کی نمائش نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں سے نفرت و دشمنی کے زہر کو دور کرنے میں بڑی مدد کی تھی۔

★

لندن میں "اگاتھا" کے نام سے ایک فلم بنی تو مشہور خاتون جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی کے خاندان والوں نے فلمساز پر مقدمہ دائر کیا کہ اس طرح انکے خاندان کی نیک نامی متاثر ہو رہی ہے لیکن عدالت نے فیصلہ فلمساز کے حق میں دیا۔ جج شیکسپیئر کے اس خیال سے متفق تھا کہ "اک بھلا نام میں رکھا کیا ہے"۔

★

جب ایک فلمی ہفتہ وار نے یہ انکشاف کیا کہ شترو گھن سنہا اپنی سالگرہ کی پارٹی میں اس خوش قسمت لڑکی کے نام کا اعلان کرنے والا ہے جو اس کی شریک حیات بننے والی ہے تو پارٹی میں بن بلائے مہمانوں کا ایک ہجوم چلا آیا۔ شترو نے اس نام کا تو اعلان نہیں کیا لیکن فلمی ہفتہ وار کے ایڈیٹر کو شترو سے معافی مانگنی پڑی کیونکہ اس کی وجہ سے شترو کو ایک زحمت بے جا سے دوچار ہونا پڑا۔

★

ہیما مالینی کا سکریٹری آئی کے ...
فلم "ایک دو تین چار" بنا رہا ہے جس میں ہیما، ریکھا، پروین بابی اور شبانہ عظیم کے ساتھ دھرمیندر، دلیپ، نند، ششی کپور اور امجد خان کام کر رہے ہیں۔ اہل نے اعلان کیا ہے کہ یہ ہندوستان میں بننے والی سب سے بڑے بجٹ کی فلم ہوگی۔ فلمی حلقے سوچ رہے ہیں کہ ایک سکریٹری کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آگیا۔ کہیں اس طرح ہیما مالینی اپنے سیاہ کو سفید تو نہیں بنا رہی ہے

★

موسیقی اور جوئے کا کیا رشتہ ہے پتہ نہیں لیکن ایک فلمی پرچے کی اطلاع کے مطابق موسیقار کلیان جی آنند جی ان دنوں جوئے اور ریس کے دیوانہ وار رسیا بن گئے ہیں۔ اس پرچے کے مطابق اس موسیقار جوڑی نے کوئی ایک کروڑ روپیہ تاش اور ریس میں ہار رکھا ہے اور اب اپنے ہر فلم ساز سے معاہدے کی رقم پر ۲۵ ہزار زائد کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ ہار کی تلخی میں کچھ تو کمی ہو۔

★

رنجیت کے پاس عریاں اور جنسی رسائل اور فلموں کا کافی ذخیرہ ہے ایک دفعہ جب بندو کو رنجیت کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو رنجیت نے وہ نگاہوں کی جنت بندو کو بھی پیش کی۔ بندو کافی دیر تک ان رسائل اور فلموں سے محظوظ ہوتی رہی رنجیت اور بندو کا کہنا ہے کہ انہیں چونکہ فلموں میں ویلن اور ویمپ کے کردار ادا کرنے پڑتے ہیں اور ویمپ کے سین فلمانے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے انھیں اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی ان چیزوں سے دلچسپی لینا ضروری ہے۔

★

ساون کمار ٹک "ساجن بنا سہاگن" بنا رہے ہیں اور اپنی نئی ہیروئن کستوری کی زلفوں کے اس طرح اسیر ہو گئے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی سوچ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کستوری فلم میں "سہاگن" "بنا ساجن" کا حقیقی رول ادا کرے گی۔

★

موسمی چٹرجی نے اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایک تو ان کے کام کا ہے جس میں وہ فلموں کی شوٹنگ میں حصہ لیتی ہے ایک ونود مہرہ کے ساتھ اور ایک اپنے شوہر کے ساتھ۔ لیکن ونود مہرہ کی بیوی نے اُسے وارننگ دی ہے کہ وہ ونود سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے موسمی کے اپنے شوہر سے تعلقات بھی کافی کشیدہ ہیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں رائی سے پہاڑ بن گئی ہیں اور یہ پہاڑ کبھی بھی طلاق کے آتش فشاں میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ موسمی چٹرجی کے علاوہ امول پالیکر اور اسرانی کی گھریلو زندگی بھی کچھ ایسی ہی فضا سے دوچار ہے۔

★

راکھی کو گلزار سے قریب لانے کے لئے ان دنوں سنیل دت اور نرگس دت پوری سنجیدگی سے کوشش کر رہے ہیں مگر راکھی

فلمی تبصرہ

بشیر انور

"یاروں کا یار"

اشوکا آرٹ نیشنل کی گزشتہ کئی برسوں سے بننے والی فلم "یاروں کا یار" کے نام پر جائیں تو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے شریف النفس دلیر اور جری انسان کی کہانی ہے جو اپنے دوستوں کے کام آتا ہے، مظلوموں کی حمایت کرتا ہے دوستی کی خاطر اپنا سر کٹا سکتا ہے اور وقت پڑنے پر اپنے دوست پر قربان بھی ہو سکتا ہے ٹائیٹل دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے اوم، اللہ اور صلیب کا نشان دکھائے جاتے ہیں اور آواز ابھرتی ہے کہ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"...

تو خیال آتا ہے کہ فلم قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور سیکولرزم کے موضوع پر بنائی گئی ہوگی مگر جب جوں توں کر کے ساری فلم دیکھی جاتی ہے تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ بار بار ارادہ کرتے ہیں کہ بے سر و پا قسم کی فلموں سے حتی الامکان بچتے رہیں گے لیکن پھر بھی ناموں کے چکر میں پھنس ہی جاتے ہیں۔ ویسے فلم میں کوئی بڑے نام تو ہیں نہیں، پھر بھی لینا چندرا ورکر، شتروگھن سنہا، پریم ناتھ اور اے بھیم سنگھ (ڈائرکٹر) اور کلیان جی آنند جی وغیرہ کی ٹیم کو معمولی تو نہیں کہا جا سکتا۔ "یاروں کا یار" اس وقت بننی شروع ہوئی تھی جبکہ چندرا ورکر کی زندگی پر تاریک سائے نہیں پڑے تھے، شتروگھن سنہا ہیرو کے روپ میں ابھر رہا تھا اور پریم ناتھ بھلا چنگا تھا طویل عرصے کے بعد فلم جب ڈبوں سے باہر نکلی تو سب کچھ بدل چکا تھا، فلم کے ڈائریکٹر اے بھیم سنگھ تو پرلوک سدھار گئے تھے

فلم کی کہانی چھوت چھات کے اہم سماجی موضوع سے شروع ہوتی ہے پھر سکڑ سکڑا کر گھریلو واقعات کی ایک فارمولا ٹائپ فلم بن کر بڑھتی رہتی ہے جس میں چوری ہے سینہ زوری ہے، عشق کا چکر ہے، ماں کے آنسو ہیں، لڑائی جھگڑے ہیں ناچ ہیں گانے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بڑھتے بڑھتے کہانی جب پوری بڑھ جاتی ہے تو شتروگھن سنہا پھر اصل موضوع پر اپنا پالیسی بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ نیچ جاتی والوں کی پسماندگی کی اصل وجہ ان کی خاموشی اور بزدلی ہے اگر وہ ہمت سے کام لے کر ظلم سہنا چھوڑ دیں اور اعلیٰ ذات والوں سے برابری کی ٹکر لیں تو کسی کو ان سے نفرت اور حقارت سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی اس ہدایت کے بعد ایک گروپ فوٹو ہوتا ہے اور فلم ختم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے تماشائی کچھ جوش، ولولہ اور کسی قدر تشدد کے جذبات لے کر تھیٹر سے باہر نکلتے ہوں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کے طویل عرصے میں عملی زندگی میں نہ سہی، فلموں میں ابھی تک ٹھاکروں،

راجپوتوں اور زمینداروں سے ہمارا سابقہ پڑتا رہتا ہے جو بڑی بڑی شاندار حویلیوں میں رہتے ہیں، خاندانی امارات، برتری اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے ہیں، جن کی پوزیشن قانون سے بالاتر رہتی ہے اور جن کی زمینداری میں پولیس کا وجود ہی نہیں رہتا۔ فلم "یاروں کا یار" میں ایسا ہی ایک ٹھاکر (تیواری) ایک غریب اور محنتی ہریجن (پریم ناتھ) کو محض اس بات پر سخت سے سخت سزا دیتا ہے کہ انہوں نے مندر کے پوتر تالاب سے ایک گھڑا پانی لیا تھا۔ صرف اسی ایک منظر نامہ کو فلمانے میں جو حماقتیں سرزد ہوئی ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ مندر کے تالاب ٹھاکر کی حویلی اور پریم ناتھ کے گاؤں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا، چنانچہ برہمن پجاری ایک ہریجن کو تالاب سے پانی بھرتا ہوا دیکھ لیتے ہیں اور منٹوں میں اس کی اطلاع ٹھاکر کو دے دیتے ہیں لیکن ٹھاکر گاؤں پہنچنے کے لئے یہ فاصلہ گھوڑے کی پیٹھ پر طے کرتا ہے اور صرف گاؤں کو جلانے اور ہریجنوں کو سزا دینے کے لئے بہ نفس نفیس پورے لاؤ لشکر کے ساتھ یوں حملہ آور ہوتا ہے کہ گویا سکندر اعظم نے

تاکہ بھروس پر جبر شکائی کر دیکا ہو۔ مندر کے تالاب سے پانی لینے پر لوٹے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیتا اور پریم ناتھ کو اتنا مارتا کہ وہ عمر بھر کے لئے معذور ہو جائے۔ سراسر حماقت ہے پھر انتقام کی آگ میں جلتا ہوا معذور پریم ناتھ رات کے وقت ٹھاکر کی خوابگاہ میں داخل ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے قتل کر دے لیکن اچانک اس کا ذہن سوچتا ہے کہ ٹھاکر کو ایسی سزا دے جس سے وہ عمر بھر تڑپتا رہے چنانچہ وہ اس کے کمسن لڑکے کا اغوا کر لیتا ہے اور اسے بھیک مانگنا اور چوری کرنا سکھاتا ہے ٹھاکر کا یہی لڑکا بڑا ہو کر شتروگھن سنہا کے روپ میں ایک پیشہ ور چور بن جاتا ہے لیکن اناڑی پن کی انتہا دیکھئے کہ جب وہ ٹھاکر یعنی باپ کے زیور اور جواہرات چرانے جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ کام پورا ہونے پر فوری وہاں سے نکل جائے، ایک لاکٹ کا جس میں اس کی ماں کی تصویر ہوتی ہے اسی مقام پر بغور معائنہ کرتا ہے تاکہ کچھ اور نہ سہی کہانی آگے بڑھتی رہے بس ساری فلم اسی طرح کی حماقتوں سے بھری پڑی ہے۔

فلم "خوبیوں کی تلاش" اندھیرے میں کالی بلی کی تلاش کے مماثل ہے پھر بھی تان کر کچھ تعریفی الفاظ کہے جا سکیں تو ان کے مستحق پریم ناتھ، شتروگھن سنہا اور لینا چندرا ورکر ہی گوا ادا کار ہو سکتے ہیں۔ بھولی بھالی معصوم صورت والی لینا چندراورکر کو فلم میں معصوم ادائیں کرتے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ عین بہار کے موسم میں اس کی زندگی پر خزاں چھا گئی اور اسے مجبوراً فلمی دنیا سے سنیاس لے لینا پڑا۔ اندرانی مکرجی اور رمیش دیو کے کردار محض بھرتی کے ہیں تیوار(ی) غنیمت ہے۔ کلیان جی آنند جی نے ضابطہ کی تکمیل کرتے ہوئے ایسے ویسے چند گیت فٹ کر دیئے ہیں جن کا ذکر بھی فضول ہے۔

آخر میں ہمارے معاشی نظام پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے جس میں ایسے سرمایہ دار جو جائز و ناجائز وسیلوں سے کمائی ہوئی ڈھیر ساری دولت کو بجائے اس کے کہ قومی ترقیاتی اور سماجی بہبود کے کاموں میں مشغول کریں۔ اس سے مزید روپیہ پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں اور نتیجہ میں سستی تفریح کے شائق محنت کش عوام کو اس طرح کی واہیات فلمیں دیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے

—(بقیہ سلسلہ: فلمنامہ)—

دس منٹ کے ۲۲ چیف انسپکٹر ایگل کے نام سے لکھے جو ریڈیو سیلون پر بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ اس پروگرام کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وشوامتر عادل نے اسی نام سے ایک فلم بنا ڈالی جو چھ سال سے ابھی تک نامکمل ہے فلم کی کاسٹ میں سنجیو کمار بھی شامل ہے۔ اب سوچا یہ جا رہا ہے کہ فلم کو مکمل کر کے ریلیز کر دیا جائے کیونکہ اس کی کہانی کچھ اس طرح کی ہے کہ جہاں کوئی منظر ختم ہوا وہیں فلم پر بھی "دی اینڈ" کا ٹائٹل لگ سکتا ہے۔ فلم کی اس تاخیر کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں۔ بقول ان کے وہ میں ایک آرٹسٹ ہوں بزنس مین نہیں اور اس بات کو مجھے پہلے ہی سے جان لینا چاہئے تھا۔ غرض جب بھی یہ فلم ریلیز ہوگی انسپکٹر ایگل کے ریڈیو پروگرام کی طرح بے حد مقبول ہونے کی توقع ہے ★

قابل کاشت اراضی میں اضافہ
پیدا کرلینے کی تجویز ہے۔
LETTER No. 309/ADVT/Cu/79
DT. 8-3-1979

قابل کاشت اراضی میں اضافہ

آندھرا پردیش کے منصوبہ جاتی اخراجات میں کچھ عرصے سے آبپاشی پراجکٹوں کے لئے بھاری حصہ مختص کیا جارہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اراضیات کو سیراب کرنے کی گنجائش مہیا کی جائے۔

منصوبہ جات دوران میں ۲۸ء۲۱۳ کروڑ روپیوں کی تخمینی لاگت کے بڑے اور وسط پراجکٹ کی عمل آوری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ چھوٹی آبپاشی کے تحت ۲۰ء۲ ملین ہیکٹر کی امکانی گنجائش میں سے ۷۶ء۱ ملین ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش اب تک پیدا کی جاچکی ہے۔

سال ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران میں ۶۸۰ء۲۶ لاکھ روپیوں کے اخراجات سے مزید ۴۲۰۰۰ ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کرلینے کی تجویز ہے۔

D.G., I & P.R. 44

LETTER No: 309/ADVT/C4/79

DT. 8-3-1979

قابل کاشت اراضی میں اضافہ

آندھرا پردیش کے منصوبہ جاتی اخراجات میں کچھ عرصے سے آبپاشی پراجکٹوں کے لئے بھاری حصہ مختص کیا جارہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اراضیات کی سیرابی کے لئے گنجائش مہیا کی جائے۔

درج فہرست علاقوں میں ۲۱٫۶۸ کروڑ روپیوں کی تخمینی لاگت کے چھ اوسط پراجکٹ کی عمل آوری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ چھوٹی آبپاشی کے تحت ۲٫۶۲ ملین ہیکڑ کی امکانی گنجائش میں سے ۱٫۷۶ ملین ہیکڑ اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش اب تک پیدا کی جاچکی ہے۔

سال ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران میں ۶۸۰٫۲۶ لاکھ روپیوں کے اخراجات سے مزید ۴۳۵۰ ہیکڑ اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کرلینے کی تجویز ہے۔

D.G., I & P.R. 44

LETTER No : 309/ADUT/C4/79

DT. 8-3-1979

اقبال متین

افسانے کا افسانہ

جب میری عمر اٹھارہ سال تھی اور میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میں نے ایک کہانی "چوڑیاں" ۱۹۴۳ء میں لکھی تھی۔ یہ کہانی میری پہلی کہانی ہے۔ بگڑے ہوئے طالب علموں کی طرح میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کرنے کے شوق نے دہلی اور آگرہ کی سیر کرائی۔ آخرش مارچ ۱۹۴۴ء میں امتحان کیلئے لاہور پہونچ گیا۔
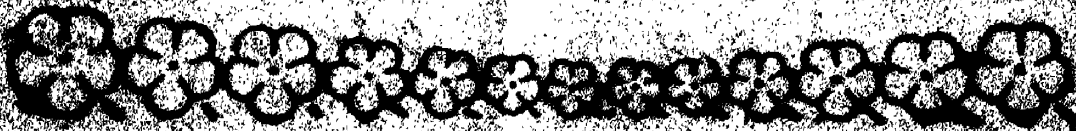
لاہور پہنچا تو امتحان شروع ہونے سے قبل احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملنے کے لئے 'ادب لطیف' کے دفتر جا دھمکا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جن دنوں لاہور کے "بک اسٹالس پر 'ادب لطیف' کا وہ سالنامہ چھپ کر آچکا تھا جس میں ندیم صاحب کی معرکے کی کہانی 'ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" شائع ہوئی تھی اور "کرشن چندر" کی — " ان داتا " — یہ سارے رسالے میرے پاس محفوظ تھے جو بعد میں منگریال ضلع عادل میں پولس ایکشن کی نذر ہوگئے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اُن دنوں کے صفِ اول کے لکھنے والوں میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اُس وقت تک تین چار کہانیاں لکھ لی تھیں — پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آٹھویں نویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے 'ادب لطیف' 'ادبی دنیا' 'ساقی' اور 'نگار' سے ہٹ کر کسی رسالے پر نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ جواں مرگ شاعر 'لطیف ساجد' میرے عزیز ترین دوستوں میں تھے ہم نے سُن رکھا تھا کہ احسان دانش جن کا اُس زمانے میں طوطی بولتا تھا، روزانہ کئی سو صفحات کا بالالتزام مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم نے عہد کیا اور اسکول سے بھاگ کر کتب خانہ آصفیہ میں دن گزارنا ہمارا معمول ہو گیا۔ ایک راز دار ملازم تھا 'شیخ حسین' جانے اب کہاں ہے۔ کھانا وہیں لے آتا۔ جنون کی حد تک پڑھا۔ کچھ ہضم کیا، کچھ پچا نہیں — لیکن وہی دن حاصل زندگی تھے — کتابوں سے اتنا پیار کیا تو کتابوں نے بھی کچھ نہ کچھ ہماری

ہی دیا۔ اسی اعتماد نے معیار کی پہچان عطا کی۔ چنانچہ نوٹ بک ہاتھ میں تھامے تین یا چار کہانیوں کا اثاثہ ساتھ لئے ادب لطیف کے دفتر پہنچ گیا۔

قاسمی صاحب نہیں تھے۔ نذیر چودھری صاحب ملے۔ کہا قاسمی صاحب شام کو ملیں گے۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ کام کیا ہے — سوچا — بھلا یہ ملنے ہی نہ دیں گے۔ ہمت کی — کہا —

'ادب لطیف' کے لئے کہانی دینی تھی۔

تیوری چڑھا کر کہا — "چھوڑ جائیے۔ میں انھیں دے دوں گا — وہ دیکھ لیں گے"

"چوڑیاں" کا مسودہ چونکہ نوٹ بک کے علاوہ ایک اور کاغذ پر بھی میں نے فیر کر رکھا تھا — نذیر صاحب کے حوالے کیا اور منٹ بھر ٹھہرے بغیر بھاگ آیا کہ شاید وہ کچھ اور سوالات کر بیٹھیں۔

اِس شام جا نہ سکا۔ دوسرے دن پہنچا تو احمد ندیم قاسمی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ میں نے اُن کی تصویریں رسالوں میں دیکھی تھیں — پہچان گیا۔ نہایت ادب سے سلام کر کے کھڑا رہا۔ بڑی شفقت سے پوچھا — کہئے میں نے طوطے کی طرح کہنا شروع کیا۔ میرا نام اقبال متین ہے۔ حیدرآباد

کل نذیر ہم دھریکا صاحب کو دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ آپ کو دے دیں گے۔ آپ نے وہ کہانی دیکھ لی ہوگی۔

قاسمی صاحب نے مجھے سر سے پیر تک پھر پیر سے سر تک دیکھا میں اور بھی سٹ پٹایا۔ شاید میری گھبراہٹ کو سمجھ کر وہ مسکرائے۔ کہا۔

"بیٹھ جائیے"

میں بیٹھ گیا۔

پوچھا۔ لاہور کیسے آنا ہوا۔

میں نے کہا۔ میٹرک کا امتحان دینے آیا ہوں۔

کچھ اس طرح ہنسے جیسے سارا راز جان گئے ہوں — میں بھی اس ہنسی کا مفہوم سمجھ گیا کہ قاسمی صاحب نے مجھے نٹ کھٹ طالب علم مان لیا ہے۔

کہنے لگے — ہم لوگ تو اس پر رشک کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ جیسی درسگاہ حیدرآباد کو حاصل ہے۔ اور آپ لوگ امتحان دینے لاہور آتے ہیں۔!!

مجھے کچھ سوجھا نہیں۔ کہا —

جی۔ جی اس بہانے سے کچھ تفریح بھی ہو جاتی ہے، تعلیم بھی — اور شہر شہر کی سیر کرنے سے بھی تو آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے

— مجھے اندازہ تھا کہ میں بات بنا رہا ہوں۔ وہ بھی جانتے ہوں گے۔ اس زمانے میں گزرے ہوئے۔ طالب علم اکثر جست لگانے کے لئے پنجاب اور علیگڈھ کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ یہ امتحان آسان تھے آسان ہی ہوں گے۔ بلکہ پنجاب میٹرک میں تو ان دنوں اعلیٰ ریاضی کے ایک پرچے کی تکمیل بھی ضروری تھی۔ جو مجھ جیسے طالب علم کے لئے بلائے جاں تھی۔ آسانی بس یہی تھی کہ سلسلہ وار آٹھویں اور نویں جماعتوں کے امتحان کامیاب کئے بغیر آپ راست میٹرک کے امتحان میں بیٹھ سکتے تھے۔ جن دنوں کئی خانگی ادارے کام کرتے تھے عابڈ روڈ پر ایک [illegible] انسٹیٹیوٹ تھا۔ اُن دنوں اس ادارے کا بہت بول بالا تھا — یہ ادارہ عابڈ روڈ پر پیالیس ٹاکیز سے متصل اس جگہ تھا جہاں اب کوئی بنک کھڑا ہے۔ میں اسی ادارے کا طالب علم تھا۔ ادارے کا ذکر نکلا تو اب کتنی ہی یادوں نے دامنِ دل تھام لیا ہے۔ نعیم عشرت اور اسد گڈو ہم تینوں لاہور میں انارکلی پر ایک ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ خوب گزری تھی —

دن میں کئی کئی بار قریب و دور سے گلوکارہ خورشید کی آواز کانوں میں رس گھولتی برسو رے۔

کالے بادلوا پیا پردیس برسو
برسو رے — برسو رے

اس آواز میں اور ساتھ ساتھ گیت کے بول میں جو پیاس چھپی تھی، جو آگ چھپی تھی وہ دشتِ دل کو اور سراب آسا کر دیتی — وہ چہرہ جسے میں نے تصور ہی تصور میں وطن سے دور ہو کر اُن دنوں اتنا دیکھا تھا کہ ہر حسین چہرے پر اسی ایک چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ کتنی ہی کوشش کے باوجود کہ بچ نکلوں، میری آنکھیں بھگو دیتا تھا، اور میں ہار کر نعیم عشرت اور اسد گڈو سے خود کو چھپاتا پھرتا کہ اُن کے قہقہے مجروح نہ ہوں۔ یہ داستان طویل ہے پھر کبھی لکھوں گا۔

اسد تحصیلِ علم کے بعد نیل فلاور ہائی اسکول میں پڑھانے لگے تھے [illegible] زمانہ نے بہت ستایا۔ معیشت سے ہار گئے اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ چھوٹی سی جان تھے، چپ کے سے اٹھ گئے۔ اللہ بخشے کیسے میاں قسم کے آدمی تھے نعیم عشرت بہت تنگ کرتا تھا۔ بس مسکرا دیتے اور کہتے نگوڑے۔ نگوڑے نعیم عشرت نے زندگی کا شعار عیش و عشرت ہی بنا رکھا ہے۔ اس محکمہ سے وابستہ ہیں جہاں قدم قدم پر ساقی گری کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن وہ شہد مانگیں جسے اللہ دے اسے [illegible]

عشرت نے بھی نہیں چکھا۔ حقّہ مذکو منہ بھی نہ لگایا۔ ان سب سے منہ موڑ کر آگے بڑھتا ہوں ورنہ یادیں راستہ روکتی ہیں۔ چلئے پھر ادب لطیف کے دفتر چلتے ہیں۔

ہاں تو قاعدے اور تمیز سے میں کرسی پر ٹک گیا جیسے نیم نشستہ ہوں۔

قاسمی صاحب پھر مخاطب ہوئے "آپ نے میٹرک کا امتحان کامیاب کرلیا ہوتا۔ افسانے تو بعد میں بھی لکھے جا سکتے ہیں۔"

یہ مشفقانہ پند و نصائح میرے لئے نامانوس نہ تھے۔ میرے بزرگوں نے بھی یہی سب کچھ کہا تھا جب کہ مجھے بچپن ہی سے شاعری کا چسکا تھا۔

میں نے کہا — جی میں امتحان کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔ یہ کہانیاں تو پہلے لکھ لی تھیں۔

پوچھا۔ "آپ نے اپنا نام کیا بتلایا؟"

میں نے کہا۔ اقبال متین کہا آپ حیدرآباد کے لوگ ق کو خ کیوں بولتے ہیں؟

مجھے ایک دم سوجھی — میں نے کہا جس طرح آپ پنجاب کے لوگ ق کو ک بولتے ہیں۔

کھل کر ہنسے — کہا جواب تو مکمل ہے۔

"احمد ندیم قاسمی" کی ادب میں قد آور شخصیت کے آگے مجھ ہیچ کس و ہیچ مداں طالب علم "اقبال متین" کا شمار ہی کیا ہوسکتا تھا۔ لیکن ان کا کھل کر ہنسنا میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے بہت تھا۔

پوچھا — "اس نوٹ بک میں کیا لکھ رکھا ہے؟"

میں نے کہا — "تین کہانیاں ہیں"

کہنے لگے — یہ نوٹ بک چھوڑ جائیے۔ میں دیکھ لوں گا۔

میں نے تعمیل حکم میں نوٹ بک حوالے کی اور اجازت لے کر چلا آیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ذہن و دل پر ایک بوجھ دھرا تھا جو اُتر گیا۔

اس کے بعد امتحان ختم ہونے تک کئی چکر لگائے۔ قاسمی صاحب نہیں ملے۔ نذیر چودھری صاحب نے بتلایا کہ وہ اپنے گاؤں گئے تھے۔ وہاں ڈاکوؤں نے انہیں کاٹ کھایا ہے اور انہیں بخار ہے۔ رہ گئی کہانیوں کی بات وہ تو وہی کچھ بتلا سکیں گے۔

قاسمی صاحب سے ملاقات کا اب امکان ہی نظر نہ آتا تھا۔ امتحان ختم ہو چکا تھا۔ ایک روز شام کو انارکلی پر بڑے بڑے پوسٹر نظر آئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کسی ہال میں مشاعرہ تھا۔ فیض احمد فیض۔ حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی کے نام پوسٹر پر جلی حروف میں لکھے تھے۔ سوچا شاید قاسمی صاحب سے یہاں مل سکوں۔ مشاعرہ گاہ جا پہنچا۔ ویسے بھی مشاعرہ سننے کا اشتیاق تو گھٹی میں پڑا تھا۔ اس پر قاسمی صاحب سے ملاقات کے شوق نے مہمیز لگائی تو جوں توں کرکے ڈائس کے قریب تک رسائی ہو ہی گئی — لیکن مل نہ سکا۔ ہمت نہ ہوئی۔ یہیں احمد ندیم صاحب کو پہلی بار سنا اور دوسری بار دیکھا۔ خوب داد حاصل کی انھوں نے — فیض احمد فیض کو بھی قریب سے دیکھا اور سنا۔ وہ فوجی وردی میں تھے۔ شاعر لگتے ہی نہ تھے۔ ڈائس پر آئے تو یوں لگا جیسے سامعین پر کنٹرول کرنے آئے ہوں کہ شعراء کو تہذیب سے سنیں۔ دو تین چیزیں سنائیں۔ کیا سنایا ذہن میں گڈمڈ ہے۔ وثوق سے یاد نہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان دنوں فیض صاحب کی بہت سی نظمیں مجھے ازبر تھیں۔ آج سوچتا ہوں تو ہر نظم انہیں کی زبان سے سنی ہوئی لگتی ہے — پھر حفیظ جالندھری صاحب کا نام آیا اور لوگوں نے پکارنا شروع کیا۔ "رقاصہ" "رقاصہ" — "رقاصہ" جب انھوں نے سنانا شروع کیا۔

تب پتہ چلا کہ اُن کی مشہور نظم "مقامہ" کی فرمائش ہو رہی تھی۔ قصہ مختصر قاسمی صاحب کو دیکھ سکا۔ مل سکا، مل نہ سکا۔

دو تین روز تک ہم جانشوں کے ساتھ ادیبوں کی سرکردگی میں گھومنے پھرنے کا انتظام تھا۔ جی چاہتا تھا۔ سب سے بچھڑ کر ادب لطیف کے دفتر پر چوکیدار بن بیٹھوں ۔۔ دل کہیں لگتا ہی نہ تھا۔ بس یہی احساس ستائے جاتا تھا کہ اپنی نوعمری کی ساری پونجی لٹا دی ہے۔ عجیب طرح کی ادبی مسلط تھی۔ بے حاصلی کا رنج۔ کھو دینے کا غم۔

بے مرام لوٹ آیا۔ کہاں لاہور اور کدھر حیدرآباد۔ اب بھلا شنوائی ہو بھی تو کس طرح۔ خطوط لکھے جواب ندارد۔ اسی کوشش میں رہا کہ نیا قافلہ جب امتحان کے لئے لاہور جائے تب کسی سے نوٹ بک منگوالوں گا۔

جون ۱۹۴۵ء کی ایک شام لطیف ساجد خوش خوش بھاگے بھاگے آئے۔ کہنے لگے مبارک ہو تمہاری کہانی چوڑیاں ادب لطیف میں چھپ گئی [illegible] لیکن نام کی جگہ صرف لطیف [illegible] [illegible] [illegible] بدنام ہونے میں بھی نام ہونے کا

پہلو تو چھپانے نکالی رکھا تھا۔ لیکن یہاں تو گمنام ہونے میں نام ہوتا تھا میں نے خط لکھا ۔۔ جواب ملا۔

افسانہ ہمیں پسند آگیا تھا۔

ہم نے چھاپ دیا۔

مسودہ پہ نام ہی نہ تھا۔

ہم نے سوچا جس کی چیز ہو گی وہ خود آواز دے لے گا۔ لکھنے والے تھے نذیر چودھری۔

اس نوٹ بک کی اور دو کہانیاں کے بعد دیگرے "ادبی دنیا" اور پھر "ادب لطیف" ہی میں بالترتیب چھپیں۔ ("سنہری لکیریں" - ادبی دنیا فروری ۱۹۴۶ء) - (مرگھٹ، ادب لطیف جون ۱۹۴۶ء) ۔ کیوں کہ نوٹ بک میرے ایک دوست غلام دستگیر جمیل نے لا دی تھی۔ جو کسی کام سے لاہور ہو آئے تھے۔ ان دنوں ادبی دنیا کے مدیر تھے صلاح الدین احمد اور ادب لطیف کی ادارت فکر تونسوی نے سنبھال لی تھی۔ فکر تونسوی سے محبت کی داستان میں پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے دو تین کہانیاں ہندوستان کے نیا دور اور افکار میں لکھیں۔ اور پھر تین

کی ہنسی بجا کر سو رہا ۔ آزادی کے بعد آنکھیں کھولیں اور اپنی کھوئی ہوئی کہانی کی تلاش میں نکلا پڑا۔۔ محبت کی اس تلاش نے روند کر رکھ دیا۔ دفتری ترقیاں تنزل سے بدلیں۔ کیوں کہ میں کسی قیمت پر بھی شہر حیدرآباد چھوڑنے تیار نہ تھا جیسے کہانی خود قریوں سے آکر شہروں میں بس گئی ہو ۔۔ کہانی نے مجھے کیا دیا اور مجھ سے کیا لیا یہ داستان طویل ہے۔ اب تو جان کے ساتھ ہی یہ آزار جائے گا۔

"حسرت، آنکھ اور ادراک کے آئینے میں"

(رؤف خیر)

آنکھ :۔ (اچھا "کلیاتِ حسرت موہانی مع حالات وتبصرہ" !۔ دیکھوں تو سہی کیا لکھا ہے۔میں نے حسرت کو پڑھا ہے۔ اور میرا ایسا خیال ہے کہ حسرت جہاں خود کو مصحفی و مومن و نسیم کی اک کڑی کہتے ہیں اتنے اہم بہرحال نہیں کہ بجائے خود ایک حیثیت کے مالک کہلائے جاسکیں خیر۔ آج اتفاقاً موقع مل رہا ہے تو چلو لگے ہاتھوں پڑھ ہی ڈالوں ۔۔۔ کہاں ہے میری عینک ؟

ادراک :۔ جی کیا کہا عینک؟! ہماری تو یہ گذارش ہے کہ آپ کسی عینک کے بغیر ہی حسرت موہانی کو پڑھیں۔ عینک لگانے کے بعد حسرت تو کیا دنیائے ادب کے کسی بھی شاعر کا کلام اس خود ساختہ زاویۂ نظر کی وجہ سے اسی رنگ کا نظر آئیگا جیسا کہ آپ کی عینک کا رنگ ہے۔

آنکھ :۔ مگر مجھے عینک کے بغیر پڑھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

ادراک :۔ اتنی تکلیف تو آپ کو اٹھانی ہی ہوگی۔ خلوص نظر کا تقاضہ ہی یہی ہے۔

آنکھ :۔ خیر دیکھیں تو سہی ۔۔ حسرت موہانی میں ایسی کیا خوبی ہے ؟

ادراک :۔ پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ " حسرت ہمارے آخری کلاسیکل شاعر ہیں "

آنکھ :۔ گویا حسرت میرے عہد سے قریب ہیں۔ میر و مصحفی تک پہنچنے کا پہلا زینہ میرے لئے حسرت موہانی ہی رہیں گے۔

ادراک :۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گذرا، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ غزل گوئی کوئی کرے غزل کا معیار حسرت موہانی ہی رہیں گے "۔ اور تو اور فراق گورکھپوری نے تو حسرت کو " بادشاہِ متغزلین " تسلیم کیا ہے ۔۔۔ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ....!

آنکھ :۔ بس بس لے ان مشاہیر کی آراء سے مرعوب کرنے کی کوشش تو نہ کیجئے اس قسم کے حضرات سے متاثر ہونے کی اہلیت مجھ میں ذرا کم رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو ان لوگوں نے جس کسی پہ قلم اٹھایا ہے اسے کسی نہ کسی خطاب سے ضرور نوازا ہے۔

ادراک :۔ تو کیا آپ کے خیال میں ان صائب الرائے ناقدوں نے حسرت کے ساتھ محض خوش عقیدگی کا اظہار کیا ہے ؟

آنکھ :۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم دوسروں کے زاویۂ نظر کی بات کیوں کریں۔ حسرت کے فکر و فن پر ہم اپنے طور پر کیوں نہ سوچیں ! آپ نے مجھے تو عینک لگا کر پڑھنے کا مشورہ دیا تھا اور اب یہی عینک آپ کی آنکھوں پر کیوں چڑھی بیٹھی ہے ؟

ادراک :۔ ایسا ہے تو لیجئے حسرت کے شعر ہی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔

آنکھ :۔ ارشاد !

ادراک :۔ اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

آنکھ :۔ شعر تو واقعی خوب ہیں۔ مگر ان میں عمومیت ہے۔ کوئی خاص تاثر والی بات نہیں !

ادراک :۔ تو پھر یہ شعر سنیئے

یہ حسرت کا خاص رنگ ہے ۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

اس غزل کا کمال یہ ہے کہ اسے انشائی اور استفہامیہ دونوں طرح پڑھ کر لطف اٹھایا جاسکتا ہے ۔

آنکھ :— خوب ! ایسا لگتا ہے کوئی فلم دیکھ رہے ہیں ۔

ادراک :— جی — فلم !! — کیا یہ تعریف ہے یا اپنی دانست میں آپ نے کوئی طنز کیا ہے ؟

آنکھ :— میرا عرض کرنا یہ تھا کہ اشعار میں حسرت موہانی نے تو جیتی جاگتی منہ بولتی تصویریں کھینچ کے رکھدی ہیں ۔ اتنی کامیابی کے ساتھ یہ منظر کشی، یہ پیکر تراشی اور اس قدر پیارے شمائل ہیں ! جو اپنا انسانی نفسیات کی صحیح عکاسی ہے ۔ ایسا لگتا ہے خالص گھریلو ماحول کا عشق او حقیقی زندگی کی عکاسی ہے ۔ ایک متوسط طبقہ کی سچی تصویر جیسا کہ ... [illegible]

کے پرکھر آنگن سے ہوتی ہوئی یہ دور کے بعض شاعروں کے چہروں سے نمایاں ہے ۔ مثلاً جاں نثار اختر کا یہ کہنا کہ اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر ۔ یا پھر

آہ یوں جیسے تنہا بیٹھے تم ہاتھ پہ رکھدیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دو کانوں پر

ادراک :— ہاں تو یہ جو شیٹ گھریلو قسم کی محبوبہ ہے اس سے اردو غزل کو روشناس کروانے کا سہرا حسرت کے سر ہے ۔ دوسرے معنوں میں یہ حسرت موہانی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو ایک حقیقی محبوب عطا کیا ۔ اس سے پہلے محبوب کا تصور مختلف تھا کہیں عطار کے لونڈے تھے تو کہیں پُر پیچ و خم والے تو کہیں کوچہ رقیب میں سر کے بل جانے کی بات

آنکھ :— یہ تو اب آپ زیادتی کرنے لگے عطار کے لونڈے سے دوا لینے والا

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بھی تو کہتا ہے طرۂ پر پیچ و خم پر نظر رکھنے والا یہ بھی تو کہتا ۔ ہے کہ

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

ادراک :— مگر اتنا ضرور ہے کہ اس دور کی غزل میں محبوب " بازاری عورت " کے روپ میں جلوہ گر ہے ۔

آنکھ :— ان تمام باتوں سے قطع نظر میر و غالب و مومن کی بڑائی بھی اس میں ہے کہ انھوں نے حقائق کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے ریاکاری سے کام نہیں لیا ۔ جبکہ میں نے سنا ہے کہ حسرت موہانی کی عشقیہ شاعری ایسی ہے جیسی ریاض خیرآبادی کی شاعری یعنی ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں ۔ حسرت نے بس خیال آرائی کی ہے ۔ اور پھر مصحفی و انشاء و جرات و مومن سے فیض بھی اٹھایا ہے جس کا اعتراف وہ خود بھی کر چکے ہیں ۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض
طرز حسرت یہ شوخیٔ انشاء
رنگِ جرات مرے بیان میں ہے

ادراک :— دیکھئے ۔ فیض اٹھانے کا جہاں تک سوال ہے اردو ادب میں مذکورہ شعراء کا جو اثر ہے اس سے صرف نظر کرنا بے حد مشکل ہے فیض تو سبھی اٹھاتے ہیں بلکہ بقول راشد آذر اساتذہ کا بھلا ہو کہ استفادہ سے کے مگر کوئی شخص اقرار کر لیتا ہے ۔ اور کوئی اخفائے حال سے کام لیتا ہے مگر انکار نہیں کرسکتا ۔ اور پھر حسرت نے جس معشوق کو اردو ادب سے روشناس کروایا ہے ۔ اسے تو نظر انداز ہی نہیں کیا جاسکتا ۔ حسرت نے جو شعر کہے ہیں ۔

محض خیال آرائی کے زور پر کہی بھی نہیں جا سکتے ۔

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے
اور بھری دوپہر میں کسی کا کوٹھے پہ آنا
پردے کا کونا کھینچنے پر دوپٹے سے کسی کا منہ چھپا لینا

وغیرہ وغیرہ یہ ساری ایسی باتیں ہیں جو یقیناً اس کیفیت سے گزرے بغیر کہی ہی نہیں جا سکتی تھیں۔ اسی طرح حسرت پر یہ بھی الزام ہے کہ انھوں نے کوئی عشق وشق کیا ہی نہیں بلکہ مولانا ہی بنے رہے ۔ اب کیا ضرور ہے کہ ہر شخص جوش ملیح آبادی بنا یادوں کی برات ساتھ لیئے پھرے یا اختر شیرانی کی طرح سلمیٰ گھڑے ۔ یا میرا جی کی طرح گوشت کھانے کے بجائے ہڈیوں کا ہار گلے میں لٹکائے پھرے ۔ حسرت کے بارے میں سنی سنائی باتوں کے جواب میں خود حسرت کا مقطع پیش ہے ۔

باوجود ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

آخر کیوں ؟ ۔ حسرت کا اُسے " عہد ہوس " اور اس " عہد ہوس " کو بھی " فسانہ " قرار دینا ، میرے شبہ کی نفی نہیں کرتا ۔ ادراک ہے ۔ یقیناً اس شعر میں گمراہ کرنے کے عناصر بھی ہیں ۔ مگر حقیقت اتنی ہے کہ حسرت کا محبوب ایک پردہ نشین ہے جو اگر کبھی باہر نکلے بھی سر راہ مل بھی جاتا ہے تو ہونٹ کاٹ کر فوراً جدا بھی ہو جاتا ہے ۔ خوف رسوائی سے یہ حال نہ صرف یہ کہ ان کے محبوب کا تھا بلکہ خود حسرت کو بھی اپنے پندار کا خیال تھا ۔ مگر تنہائی کی بات الگ تھی خلوت و جلوت کا فرق حسرت کے پاس ہے ۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اور پھر واقعہ یہ ہے کہ حسرت جس دور میں سانس لے رہے تھے اس کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ وہ صرف اسی معشوق کا دم ہی بھرتے رہتے ۔ ان کے لئے مقامات آہ و فغاں اور بھی تھے ۔ اک ایسا عاشق شخص جس کی ساری زندگی جہد مسلسل میں کٹ رہی ہو ، جس کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بی اے کا سٹوڈنٹ ہونے کے باوجود جسے علیگڈھ کالج سے نکال دیا جائے ۔ (اگرچہ کہ انھیں بی ۔ اے کا امتحان دینے سے روکا نہیں گیا) اور پھر اُسی دوران بی ۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی جو " اردوئے معلیٰ " جیسے بیباک پرچے کی بنیاد رکھکر سیاسی و ادبی دونوں میدانوں میں زبردست تہلکہ مچا دیتا ہو اور ۱۹۰۶ء ہی میں جو سودیشی تحریک کا زبردست مبلغ بن کر مختلف مقامات کا دورہ کرتا ہو اور لوگوں کو سودیشی مال کے استعمال کی ترغیب دیتا پھرتا ہو ۔ جو انجمن خدام کعبہ اور ہلال احمر کی تحریکوں میں حصہ لیتا ہو ۔ جو ترکوں سے نظریاتی ہمدردی کے ثبوت میں ہندوستان میں چندے جمع کر کے ترکی بھیجتا ہو ۔ اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون " مصر میں انگریزوں کی حکمت " شائع کر کے جیل چلا جاتا ہو ۔ اس کا اظہار کیئے بغیر کہ وہ مضمون اس نے نہیں لکھا بلکہ مولانا اقبال سہیل نے لکھا تھا ۔ اور جو جیل سے واپسی پر جیلوں کی سنگین روئداد کے عکس کو اردوئے معلیٰ کے آئینے میں پیش کر کے انگریزوں کی الجھنوں میں اضافہ کرتا ہو ۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ اس محاذ سے تو کچھ زیادہ ہی گولہ باری ہو رہی ہے تو سرجیمس میسٹن نے اردوئے معلیٰ پریس کے نام تین ہزار روپے کی ضمانت ادا کرنے کی ایک ہفتے کی نوٹس دے دی ۔ اور ۱۲ رمئی ۱۹۱۳ء کو یہ نوٹس علیگڈھ کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس نے حسرت پر تعمیل کی ۔ جس کے جواب میں اردوئے معلیٰ کا پریس جو صرف اور صرف حسرت کی ذات پر مشتمل تھا ۔ یعنی جس پریس کے پرنٹر حسرت ، مالک حسرت ، سنگ ساز حسرت ، مشین مین حسرت حتیٰ کہ بعض اوقات اس کے کاتب بھی خود حسرت ہوا کرتے تھے ، بند ہو گیا ۔

سودیشی تحریک کی عملی مثال یہ کہ

خود حسرت نے اک سودیشی سٹور کی
بنیاد ڈالی جس پر مولانا شبلی نعمانی
نے کہا تھا "تم آدمی ہو یا جن"،
پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشین
(POLITICIAN) بنے اور اب
بنئے ہو"۔ تو عرض کرنے کا مقصد
یہ تھا کہ حسرت کی شاعری کے پیچھے
اتنے سارے عوامل کارفرما تھے۔ نرا عشق
ہی نہیں تھا حسرت نے عشق کے علاوہ
ان سارے عصری مسائل کو اپنی غزل
میں برتا ہے اور یہ عصری آگہی حسرت
سے پہلے غزل میں کم برتی گئی۔

آہنگ :- مگر بعض حضرات کا خیال
ہے کہ غزل میں مسائل ترقی پسندوں نے
اور ترقی پسندوں میں بھی مجروح سلطانپوری نے پہلے پہل برتے ہیں۔

ادراک :- غزل خواہ وہ کسی دور
کی ہو کسی شاعر نے کہی ہو اس میں
عصری آگہی کا پایا جانا بے حد ضروری
ہے۔ جس میں عصری آگہی نہیں ہوتی
وہ شاعر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہر شاعر
کی عصری حسیت الگ ہوتی ہے اور اسے
برتنے کا سلیقہ بھی ہر شاعر کا اپنا
ہوتا ہے خاص طور پر حسرت نے ایک
بے حد ذکی الحس اور فعال شخصیت
پائی تھی لہذا ان کے عہد اور جہد کا
ایک ایک واقعہ ان کی غزل میں موجود
ہے۔ کیا آپ کے خیال میں حسرت [illegible]
نے یہ اشعار یوں ہی کہہ دیئے ہونگے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

کیا ان اشعار کے پیچھے ان کے
عہد کی آگ دکھائی نہیں دیتی؟ —
میں نے کہا نا کہ حسرت جس دور میں
سانس لے رہے تھے اس کا تقاضہ
یہ نہیں تھا کہ صرف یہ کہتے کہ

مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں
لے لیا آغوش میں اس کی [illegible]

بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

آہنگ :- حسرت موہانی کا یہ پہلو
بڑا کھلتا ہے کہ انھوں نے حروف تہجی
کو نوازنے کی نیت سے بھی غزلیں کہی
ہیں تاکہ دیوان مرتب کرتے ہوئے کوئی
حرف ردیف بننے سے رہ جائے چنانچہ
اس استادی کے چکر میں وہ اپنے
رنگ سے ہٹتے نظر آتے ہیں۔

ادراک :- چلئے شکر ہے آپ
نے حسرت کے رنگ کو الگ تو کیا۔
گویا حسرت کی پہچان کی ایک صورت
نکل آئی —— ہر حرف تہجی میں غزل
کہنے کی شکایت ایسی ہی ہے جیسے
حسرت سے یہ شکوہ کرنا کہ انہوں نے کوئی
آزاد نظم نہیں کہی —— [illegible]
حسرت کو اس کے عہد سے الگ کر کے
دیکھ سکتے ہیں — تقریباً سبھی اساتذہ
دواوین اسی ترتیب پر قائم ہیں اور کیونکہ
ظاہر ہے حسرت بھی روایت کے پاسدار تھے
لہذا حسرت نے بھی اسے اپنایا۔ مگر ہمیں
دیکھنا یہ ہے کہ آیا حسرت نے ایسی
ردیفوں میں صرف استادی دکھائی ہے
یا واقعی کوئی شعر بھی نکالا ہے۔ مثالیں
طوالت کا باعث نہ ہو جائیں اس لئے
دو ایک شعر ذیل میں پیش ہیں۔

تسکین مدعا کیلئے اک دعا ہے تلخ
ظاہر میں گرچہ وہ سخن آشنا ہے تلخ

کیوں نہ ہو اپنے اشتیاق میں فرق
آگیا آپ کے مذاق میں فرق

کچھ نہ ابدال سے پہنچا ہے نہ اوتاد سے فیض
جسکو پہنچا ہے سو پہنچا ہے تری یاد سے فیض

آہنگ :- حالانکہ یہ وہی حسرت ہیں۔
جو سوتے جاگتے اپنے شیخ ہی کے خواب دیکھا کرتے تھے
بلکہ بیشتر غزلوں میں "[illegible]" کا اشارہ [illegible]
اور وہی حسرت اب ابدال و اوتاد کی
نفی بھی کر دیتے ہیں۔ بہر حال اک طرفہ
تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی۔

ادراک :- یہ تو خیر عقیدے کا
معاملہ ہے وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے یا یہ
بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی عقیدہ ہی نہ ہو
اس کے علاوہ حسرت کمیونزم سے بہت
قریب ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء
میں حسرت ہی کی کوششوں سے پہلی آل
انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کانپور میں منعقد

ہوئی تھی تو عقائد کی بنیاد پر کسی کے فن کو پرکھنا سراسر نادانی ہے۔ اب کیا فرد یہ چاہتے ہے کہ ہر ادیب و شاعر اتباعِ قرآن و سنت کی جیتی جاگتی تصویر ہو، پنجوقتہ نماز بھی پڑھتا ہو — بعض شاعر تو خدا کو مانتے ہی نہیں اب ہم کیا جوشؔ کی تمام شاعری پر خطِ تنسیخ کھینچ دینگے یا ن۔ م۔ راشد کو محض اس لئے شاعر تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ پکا مادہ پرست تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی لاش تک کو الکٹرک بھٹی میں جلا دینے کی وصیت کی جس پر عمل بھی ہوا۔ اگر ہم اسی طرح عقائد کی روشنی میں چلیں گے تو ترقی پسندوں کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟ ان کے عقائد کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں مگر ان کے ادبی (CONTRIBUTION) سے انکار تو کیا ہی نہیں جا سکتا۔

آنکھ:- یہ عقائد کی بات خواہ مخواہ ہماری گفتگو میں در آئی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری گفتگو پر پانی پھر جائے اور عقائد کی بحث چھڑ جائے جو یقیناً ہمارا منشاء نہیں۔ تو میرا عرض کرنا یہ تھا کہ ہر حرفِ تہجی کو ردیف بنا کر دیوان میں غزل شامل کرنے کے رویے سے حسرت کو یقیناً کوئی فیض نہیں پہنچا۔ یوں دو چار شعر با معنی ہو گئے ہوں مگر غالب اکثریت انہی اشعار کی ہے۔ جن میں بلا مبالغہ استادی دکھائی گئی ہے بلکہ استادی میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حسرت نے بہت تعلیاں کی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میرؔ
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں
کلام دیکھ لیا سن لیا ہزاروں کا

بلکہ حسرت تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ؂

ہو کے بے خود کلامِ حسرت سے
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اس قسم کی تعلیاں کھلتی ہیں۔

ادراک:- میرؔ و غالب کو تو خیر جانے دیجئے اپنے ہی اطراف و اکناف کے کسی شاعر کا دیوان اٹھا لیجئے۔ یا تو انانیت کا دعویدار نظر آئیگا یا پھر ایسی اوٹ پٹانگ نظم کہے گا۔ یا اس کا عنوان کچھ ایسا عجیب و غریب ہوگا کہ لوگ خواہ مخواہ ہی سہی اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے ہر چند کہ اس کے پٹارے میں آخری تماشہ نام کی کوئی چیز ہوگی ہی نہیں برخلاف اس کے حسرت جس نے واقعی اردو ادب کو سنجیدگی کے ساتھ "دور" اس قسم کی تعلیاں کرتا نظر آئے تو آپ کم از کم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کی فضا میں تہلکہ مچا دینے کے لئے جہاں کئی سیاسی، صحافتی، ادبی اقدامات کئے ہیں وہیں یہ تعلیاں بھی کی ہیں۔ اس زمانے میں جگرؔ، اصغرؔ اور فانیؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ جگرؔ کا وہ شہرہ تھا کہ ؂

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے
اور جگرؔ کو شراب نے مارا

عوام الناس جگرؔ کے دیوانے تھے۔ اصغرؔ کے اک اک شعر کو سو سو معنے پہنا کر صوفی قسم کے حضرات وجد میں آ کر بے حال ہو رہے تھے۔ فانیؔ کی غزل تو ہر کس و ناکس گنگناتا پھر رہا تھا — تو ایسے میں حسرت سے اس بات کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسی تعلیاں کیں۔ ہم یہ کیوں بھول لیں کہ ان تعلیوں سے ہٹ کر بھی تو "حسرت" اک وجود رکھتے ہیں۔

آنکھ:- ہاں یہ تو ہے۔

ادراک:- ہے نا! — چلئے اتفاقِ رائے کا اک پہلو تو نکل آیا — اس مرحلے پر ہم اس گفتگو کو ختم ہی کر دیں تو بہتر ہے۔ ورنہ حسرت تو اس پہلو دار شخصیت کا نام ہے جس کے ہر پہلو پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہاں بھی اتفاقِ رائے ہی کا پہلو نکل آئے۔

مضامین صاف اور خوشخط روانہ فرمائیں۔
(ادارہ)

غزلیں

پروفیسر حسرتؔ سہروردی

تیری زمیں سے دور تیرے آسماں سے دور
جی چاہتا ہے جا کے رہیں لامکاں سے دور

تاریکیوں کی خیر مناؤ کہ دوستو
شمس و قمر بھی رہتے ہیں اپنے مکاں سے دور

اتنا الجھ گیا ہوں سلجھنا محال ہے
شاید تمہاری یاد بھی ہے آستاں سے دور

ہم رہرواں کو حیف کہ قائل ہیں دوستو
یکساں ہے کارواں میں رہیں کارواں سے دور

وہ طور کے تھے قریب ابھی کل کی بات ہے
رہنے لگے ہیں اب جو وہم و گماں سے دور

دل ہی نہیں رہا تو خزاں کیا بہار کیا
اجڑا گھر بساؤ بہار و خزاں سے دور

وہ آئیں یا نہ آئیں کروں گا نہ انتظار
حسرتؔ چلا ہے گردشِ دورِ زماں سے دور

—٭—

جرمؔ محمد آبادی

اظہارِ رنج و غم میں نہ ہرگز خلل پڑے
خاموش ہو زباں تو آنسو نکل پڑے

ساقی نے ظرف دیکھ کے تقسیم کی تھی مے
اس احتیاط پر بھی ہزاروں ابل پڑے

ہنسنے کی اور ہنسانے کی ہوتی ہے اک حد
اتنا نہ گدگداؤ کہ آنسو نکل پڑے

اہلِ خرد مآلِ سفر سوچتے رہے
دیوانے سوئے منزلِ مقصود چل پڑے

میری طرح اٹھاؤ جو سختی راہِ عشق
آنسو کا ذکر کیا ہے کلیجا نکل پڑے

اے جرمؔ مرشدوں کی مقدس کی سرزمیں
جب سرکشانہ بات کے معنے نکل پڑے

—٭—

مہدیؔ پرتاپ گڑھی

سامنے ہے دشت صحرا، زندگی اے زندگی
اور میں ہوں آبلہ پا، زندگی اے زندگی

خیر و شر کا معرکہ جب بھی زمانے میں ہوا
چھوڑ کر آگے مجھکو تنہا، زندگی اے زندگی

غیر بھی مجھ سے گریزاں اور اپنے بھی خفا
مت بنا مجھکو کھلونا، زندگی اے زندگی

نسلِ نو طے کر رہی ہے اندھی راہوں کا سفر
دے نئے منزل کا نقشہ، زندگی اے زندگی

دھوپ ہے حدِ نظر تک اور انسانوں کے سر پہ
ابر کا ٹکڑا نہ سایا، زندگی اے زندگی

اپنے قدموں سے کچل کر اُس کو آگے بڑھ گئی
جو گرا ہرگز نہ سنبھلا، زندگی اے زندگی

جبر ہی رہتا ہے کا ہر روپ تو ہے ساحرہ
تیرے چہرے پہ ہے چہرا، زندگی اے زندگی

مہدیؔ اُس کی جستجو میں لاکھ کولمبس بنا
جو تھا اک اندھا جزیرہ، زندگی اے زندگی

—٭—

اسعد شفق بدایونی

آخری تحفہ

جاں نثار اختر کی نظم "آخری لمحات" سے متاثر ہو کر ۔ دختر جاں نثار اختر عزیزہ سلمیٰ کے نام
نظم میں تقریباً (۲/۱ ۲) سال قبل کہی تھی جو غیر مطبوعہ ہے (کہ۔ب)

" تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دور کو تہذیب و آگہی دی ہے "
یہ شعر "آخری لمحہ" کا ایک تحفہ ہے
میں آج پھر اسی لمحے کی چھاؤں میں بیٹھی
ادھوری نظم کی تکمیل کرنے بیٹھا ہوں
کہ جاں نثار سے میرا اٹوٹ رشتہ ہے
تم ایک ایسے بڑے باپ کی نشانی ہو
کہ جس نے مر کے بھی سوغاتِ زندگی دی ہے
تم ایسے نور کا چشم و چراغ ہو جس نے
ادب کو گھر سے زیادہ ہی روشنی دی ہے
وصول کر کے غزالوں سے اس نے قرضِ حیات
وطن کو اپنے "گھر آنگن" کی شاعری دی ہے

......

بہت اداس تھا صفیہ کے انتقال کے بعد
کہیں اماں نہ ملی اس کو "زیرِ لب" کے سوا
لگا کے سینے سے سلماں کو اور جاوید کو
بھٹک رہا تھا وہ دشتِ بہار میں تنہا
حقیقتوں سے وہ ملتا رہا حجاز کے بعد
تمہاری آنکھ سے اس نے بہار کو دیکھا
تمہارے دم سے ہی چہرے پہ رونق آتی تھی
سبھی سمجھتے تھے بیمار کا ہے حال اچھا

تبسم حیات کی منظر کشی کے بعد بھی وہ
الٹ کے از سرِ نو دیکھتا تھا دنیا کو
وہ سوچتا تھا کہ تم جب بھی مسکراؤ گی
وہ اپنے کربِ مسلسل کو بھول جائے گا
گلے میں ڈال کے باہیں جو جھول جاؤ گی
وہ آسمان کے تارے بھی توڑ لائے گا "
سہارا لے کے تمہارے حسیں تبسم کا
وہ دشتِ غم کو حسیں گلستاں بنائے گا
حوادثات کی زد سے تمہیں بچانے میں
وہ اپنی جان کی بازی بھی ہار جائے گا
وہ جاں نثار تھا اور جاں نثار اب بھی ہے
تمہی چمن میں برنگِ بہار اب بھی ہے
وہ داغ داغ اجالوں میں رنگ بھرتا ہے
دلوں میں یاد کے زینوں سے وہ اترتا ہے
کبھی کبھی اسے احساس یہ بھی ہوتا تھا
دو چار سانس ہی اب رقصاں ہیں اس کے جیون میں
اسے یہ علم تھا خود اس کی زندگی کا شجر
برائے نام ہی تازہ ہے گھر کے آنگن میں
تمہیں یقین تھا مگر اس درخت کا سایا
ضرور رقص کرے گا تمام گلشن میں

....

تھا کس کو پتہ، تھی کس کو خبر سایہ یہ بچھڑنے والا ہے
پتے یہ بکھرنے والے ہیں، بوٹا یہ اجڑنے والا ہے
تا چند اجل یوں ہی بیٹھا بس آنکھ مچولی کھیلے گی؟
بے وقت یہ ہم سے لڑ کر یوں خون کی ہولی کھیلے گی؟
اک روز یقیناً اے بیٹی خود موت کو بھی موت آئے گی
اس وقت وہ کر کے یاد ہمیں شرمائے گی پچھتائے گی
سچ پوچھو تو جیون سے بڑھ کر احسان اجل کا ہے ہم پہ

اٹھنے کی مدد، گر اٹھنے کو زمیں، ننگوں کو کفن تو دیتی ہے
جیون کا بھروسہ کیا بیٹی، کپڑے بھی اتار کے لے جائے
خود منہ کا نوالہ چھن جائے، حق سب کا مار کے لے جائے
گلشن میں تہی داماں ہے سحر، شب دامنِ گل پہ قابض ہے
نالاں ہے مشامِ جاں اس کی، گو نکہتِ گل پہ قابض ہے
دولت کی غلط تقسیموں نے انسان کو بھی تقسیم کیا
بھگوان کو بھی تقسیم کیا، ایمان کو بھی تقسیم کیا
کتنے ہی رشی اور منیوں کے، کتنے ہی پیمبر، نبیوں کے
اشلوک پہ پانی پھرتا ہے آیات کا دم گھٹ جاتا ہے
دنیا ہی دنیا ہے تو اگر کیا خاک ہمیں یاد آئے گی؟
اک روز تو تیشہ چمکے گا، اک روز زمیں پھٹ جائے گی
تم مریم و سیتا کی کھا کر سوگند بڑھو آندھی کی طرح
ظلمت کے پرخچے اڑ جائیں، دشمن پہ گرو بجلی کی طرح
آنچل کو بھی پرچم بننے کا اب وقت مناسب آیا ہے
صد شکر عموں کی طاقت کا محفوظ بڑا سرمایا ہے
بے روح جماعت سے بیٹی اک فرد کی طاقت کافی ہے
جنت کی غلامی سے بیٹی دوزخ کی حکومت کافی ہے

....

یوسف حسین ہے نہ زلیخا حسین ہے
چہروں میں غور و فکر کا چہرا حسین ہے
سارے چمن میں ایک ہی غنچا حسین ہے
سچ پوچھئے تو بیٹی غنیرا حسین ہے
احساں جتانے والوں کی پر ہول چھاؤں سے
بے برگ و بار پیڑ کا سایا حسین ہے
شامل ہے اینٹ اینٹ میں ہم مرشوں کی خاک
محلوں سے گھاس پھوس کی کٹیا حسین ہے
خالی رسوئی گھر کے ہیں برتن تو کیا ہوا
ہیرے سے بھی بدن کا پسینا حسین ہے

گلدو نہیں، بہار نہیں، گلستاں نہیں
منزل کی سمت دوڑ تا رستا حسین ہے
موتی نہیں، زمرّد و لعل و گہر نہیں
فاقے میں ایک خشک نوالا حسین ہے
دورانِ زیست میں نہ رہی قدر وقت کی
مرتے سمے تو "آخری" لمحہ حسین ہے
سارے سیاسی کھیل مبارک سہی مگر
بچوں کا ویسے گھر میں تماشا حسین ہے
بھاری صدی صدی پہ ہے اک لمحۂ حیات
تاریخ سے زیادہ فسانا حسین ہے
راتوں میں پھیری والے کی آواز بھی ہے ساز
سناٹے میں ہر ایک نظارا حسین ہے
"حسرت برس رہی ہے یہ کس کا مزار ہے"
کس دل سے میں کہوں کہ یہ کتبا حسین ہے

....

وہ جاں نثار تھا، جاں کی نہ تھی اسے پروا
خدا کرے کہ تم اس بوجھ کو سنبھال سکو
اسی کے نقشِ قدم پہ چلو تو منزل ہے
دعا ہے تم بھی نیا راستہ نکال سکو
حیات سازِ مسلسل، حیات رقصِ دوام
ہر ایک عقدۂ مشکل کو تم کھنگال سکو
بیاہ ہوگا تمہارا تو اس گھڑی بیٹی
ضرور "آخری لمحہ" کو چھاپ کر بانٹو
یہ رخصتی بھی، نصیحت بھی، تہنیت بھی ہے
جدید نظم، غزل اور معذرت بھی ہے
دراصل "آخری لمحہ" ہے "آخری تحفہ"
یہ جاں نثار کی، کاوش کی ایک سی نظمیں
یہ جاں نثار کے فکر و عمل کا گلدستہ

یہ فکر کاوشِ پدری کا ایک مجموعہ
تمھارے حق میں یہ گجرا بھی اور سہرا بھی
یہ نظمیں تم کو غمِ زیست کا پتہ دیں گی
یہ بھولی بسری ہوئی یاد کو صدا دیں گی
کبھی جو باپ کو تم یاد کرکے روؤگی!
یہ نظمیں دستِ دعا بن کے حوصلہ دیں گی
اندھیری رات میں جب بھیگ جائیں گی آنکھیں
سرِ مژہ یہ دیئے صبر کے جلائیں گی

"اب میرے پاس کوئی وقت نہیں
آج جو ہے وہ کل نہیں ہوگا"
میری آواز کے نہیں الفاظ
یہ تو گونگے کی اک صدا سی ہے

اب مرے پاس کوئی اشک نہیں
زندگی میری کربلا سی ہے
دل ہے مصلوب، دار پر نظریں
دور تک ذہن میں اداسی ہے
مستعار اشک، مستعار آنکھیں
میرا رونا بھی کس حساب میں ہے
تجربہ اور مشاہدہ سب کچھ
اتنی وسعت کہاں کتاب میں ہے
مہر میں ہے نہ ماہ میں بیٹی!
روشنی آدمی کی ذات میں ہے
جیب بھی اب قمیص میں نہ رہی
میری گردن کسی کے ہاتھ میں ہے
مرکے بھی فائدے میں ہے اختر
رنگ و بو اس کی کائنات میں ہے
کاش اس میں کوئی خیانت ہو
زندگی موت کی امانت ہے

زندگی کتنی خوبصورت ہے
اک نفس ہی سہی غنیمت ہے
روز مر مر کے جی رہا ہوں میں
جانے کب میں بھی رو بیٹھ جاؤں گا
("ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو")
آج رونے دو مجھے
خشک برسات بہانے دو مجھے
دور سے ہاتھ ملاتے ہیں کئی لوگ مگر
یہ پتہ بھی نہیں وہ لوگ کہاں رہتے ہیں
پھر بھی محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمزاد ہیں وہ
رشتہ داروں کی عبث قید سے آزاد ہیں وہ
بس وہی داخلی دنیا کے مکیں لگتے ہیں
بیوی بچے ہیں فقط خارجی دنیا والے
وہ مغنی ہو کہ نقاش ہو یا سنگ تراش
فلسفی ہو کہ، وہ صوفی ہو کہ، شاعر کہ رشی
بس انھیں سے میرا روحانی تعلق ہے بہت
وہی انساں ہیں میری امتِ غم میں داخل
حال و مستقبل و ماضی کا مرقع ہے ادب
شعر و فن یہ تو زمانے کی کوئی قید نہیں
لازماں ہے یہ بقولِ مخدوم
ایک بکواس ہے تقسیم جدید اور قدیم
وحدتِ کل ہے ادب، وحدتِ ہستی ہے ادب
شاعری اصل میں اچھی یا بری ہوتی ہے
جاں نثار آج بھی ہے کل بھی تھا، کل بھی ہوگا
میر و غالب کی طرح، حافظ و سعدی کی طرح
تم خدا کے لئے آنسو نہ بہانا بیٹی
تم کو بھی مجھ کو اک روز تو مرنا ہے ضرور
زندہ رہنا ہے تو "اس زہر کو پینا ہوگا" *

* "پیام ہے وہ زہر جو ہر ایک پیمبر نے پیا ؛ کبھی سقراط نے مانگا کبھی شنکر نے پیا" (امیر حسن کا شعر)

افسانہ

بڑی بیماری

اکرام جاوید

اُس شام رشید ماموں کے ساتھ جب نورو سیٹھ میرے گھر آیا تو میں بے حد پریشان ہوگیا۔ مجھ سے زیادہ پریشانی میری بیوی کو لاحق تھی۔ گاؤں سے اُڑتے اُڑتے یہ بات شہر تک پہنچی تھی کہ نورو جذام کے مرض میں مبتلا ہوگیا ہے۔ لوگ اس سے ملنے جلنے میں احتیاط برتنے لگے تھے۔ یہاں شہر میں بھی سارے عزیز و رشتہ دار محتاط ہو گئے تھے۔

رشید ماموں ایک سائے کی طرح نورو کے ساتھ لگے رہتے۔ خاندان کے ہر فرد نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی ...... مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ نورو کے ہم نوالہ و ہم پیالہ بنے رہے۔ لوگوں نے تنگ آکر نورو کے ساتھ ساتھ خود رشید ماموں کا سماجی بائیکاٹ شروع کر دیا ...... ان حالات میں وہ شہر کے کسی رشتہ دار کے ہاں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اس لئے وہ میرے ہاں آ گئے تھے۔ اور گھر آئے ہوئے مہمان کو گھر سے نکالنا مجھ سے ناممکن تھا ۔ !

میری پریشانی کو جیسے رشید ماموں کی جہاں دیدہ نگاہوں نے بھانپ لیا۔ نورو کو دیوانخانے میں بٹھا کر وہ اندر دالان میں آ گئے جہاں سہمے ہوئے خوفزدہ بچوں کا خیال کئے بغیر میری بیوی مجھے شرافت بالفاظ دیگر میری بزدلی پہ لعنت و ملامت کر رہی تھی۔ اور مجھے غیرت، جوانمردی اور بچوں کے مستقبل کا واسطہ دے کر نورو کو گھر سے نکال باہر کرنے کی اُلتجا کر رہی تھی۔ رشید ماموں کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔

"کیوں کیا بات ہے نذیر میاں؟" رشید ماموں دھیمی آواز میں بولے "میں سمجھ گیا۔ شاید جمیلہ بی بی کو نورو کا آنا ناگوار گذرا ہے؟"

"جی - یہ بات نہیں ہے"

میں شرم و ندامت سے زمین میں جیسے دھنس کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہی تو ہے رشید ماموں" جمیلہ سنبھل کر بولی "آپ جانتے ہیں ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور گھر میں ایسی بیماری والے آدمی کا آنا کتنی خطرناک بات ہے" "یہ بڑی بُری بیماری ہے"

"یہ بات غلط ہے بی بی"

رشید ماموں پر اعتماد لہجے میں کہنے لگے "جگر کی خرابی کی وجہ بیچارے کے ہاتھ پاؤں کیا سوج گئے کہ سارے گاؤں میں قیامت آگئی" وہ رک کر بولے "میں اس قدر خودغرض اور غیرت مردار آدمی نہیں ہوں بی بی"

"حیرت ہے" جمیلہ تذبذب میں پڑ گئی "گاؤں میں تو سب یہی کہتے ہیں"

"کہنے والوں کو کون روک سکتا ہے"

رشید ماموں تلخی سے مسکرانے لگے "وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نورو کو بیوقوف بنا کر اس کی دولت کو لوٹ رہا ہوں"

وہ قدرے تیز لہجے میں بولے "بات صرف اتنی ہے کہ نورو پہلے ایک غریب آدمی تھا۔ اور ادرک پیاز کے دھندے سے لکھ پتی بنا ہے۔ لوگ کسی کو گرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی بلندی برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ اور اب زراعت کے کاروبار میں نورو میرا ساتھ دے رہا ہے۔ اس لئے بھی لوگ جلتے اور حسد کرتے ہیں" !

"تو اسے وہ بیماری نہیں ہے" !
میری بیوی کے ذہن میں شک کا آخری
شعلہ بھڑک کر گل ہو گیا۔
"قطعاً نہیں" رشید ماموں
نے یقین دلایا۔ آج چار سال سے میں
اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا' کھاتا پیتا
ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اُسے
وہ بیماری نہیں ہے۔ تم میرے اپنے
لوگ ہو سوچو تو میں کس طرح ایسے آدمی
کو تمہارے ہاں لا سکتا ہوں یہ بات معقول
تھی۔ میری بیوی قائل ہو گئی۔ اِس
طرح نورو کے لئے ہمارے گھر کے ...
دروازے کھل گئے۔ !

رشید ماموں اور نورو نے
مل کر ایک لاری خریدی تھی۔ اور
اطراف واکناف کے دیہاتوں سے شہر میں
اناج اور گڑ کی سپلائی کا کاروبار شروع
کیا تھا۔ اِس سلسلے میں تقریباً ہر ہفتہ
وہ دونوں شہر آتے اور میرے ہاں ٹھہرتے
تھے۔ وہ چاہتے تو کسی سرائے یا ہوٹل
میں بھی ٹھہر سکتے تھے۔ لیکن ہوٹل میں
ٹھہرنا اور کھانا دونوں ہی کو ناپسند تھا۔
اور ہوٹل کا خرچ بھی ان کے خیال
میں اسراف کا ذیل میں آتا تھا۔
وجہ کچھ بھی ہو وہ دونوں میرے ہاں
ٹھہرتے تھے۔ نورو کے ساتھ ساجھے
میں کام کرتے ہوئے رشید ماموں
کی حالت سنبھل گئی تھی۔ باپ دادا کی
کمائی تو کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ ایک
زمانے میں تو وہ پائی پائی تک کے
محتاج ہو گئے تھے۔ سیٹھ نورالدین
عرف نورو اگر ساتھ نہ دیتا تو جانے
ان کی کیا حالت ہو جاتی۔ دوست
وہی ہے جو ضرورت پر کام آئے۔
اور نورو نے بُرے وقت میں ساتھ
دے کر دوستی کا حق ادا کیا تھا۔
رشید ماموں نورو کے اِس احسان
کو مانتے تھے۔ اِس لئے دنیا بھر کی
مخالفت کے باوجود وہ نورو کے
ساتھ اس کے ہمزاد کی طرح رہتے
تھے۔ مجھے ان کی دوستی پر رشک آتا
تھا۔ میری بیوی بھی ان دونوں کی
دوستی سے کافی متاثر ہوئی تھی۔

" آپ کے سارے دوست
تو بس مطلبی یار ہیں۔ کاش آپ بھی
کوئی نورو جیسا دوست پیدا کر سکتے"!
وہ حسرت سے کہا کرتی اور میں خفت
سے مسکرا دیتا تھا۔ !

نورو کی حالت روز بروز ابتر
ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے گورے لمبوترے
چہرے کا رنگ تانبے جیسا سرخ ہو
گیا تھا۔ جلد کھردری' چہرہ بھاری اور
ہاتھ پاؤں متورم ہو گئے تھے۔ ان
دنوں وہ بے حد افسردہ دکھائی
دیتا تھا۔ ایک دن رشید ماموں نے
انکشاف کیا کہ نورو کو گٹھیا بائی کا
مرض ہو گیا ہے۔ چند ماہ بعد نورو نے
شہر آنا بند کر دیا۔ رشید ماموں
اکیلے ہی آیا کرتے اور جب بھی آتے
تاسف بھری آواز میں سناتے کہ ..
نورو بہت بیمار ہے۔ !

برسات کی ایک شام رشید ماموں
کے ساتھ نورو بھی آ گیا۔ اُسے دیکھ کر
میں چکرا گیا۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا
تھا۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے اور
ناک دب سی گئی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں
کی انگلیاں بھی پھولی پھولی سی دکھائی
دیتی تھیں۔ اور حیرت کی بات یہ کہ
اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔ اس
رات ہمارے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے
نورو کافی جھجکتا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس
نے اب کی بار مجھ سے مصافحہ بھی نہیں کیا۔
رات میں سونے کے لئے اس نے بستر
بھی استعمال نہیں کیا۔ میں نے اصرار
کیا تو وہ حد درجہ افسردگی سے بولا۔

"نذیر میاں آج رات ہمیں سونا
کہاں ہے" اس کی گھٹی گھٹی سی آواز
میں بلا کا درد تھا۔ "میں نے لاری اور
اپنا حصہ رشید بھائی کو فروخت کر دیا ہے
ہماری شراکت ختم ہو چکی ہے۔ حساب
کتاب کی خاطر میں شہر آیا تھا۔
یقین مانئے بڑی مجبوری سے آیا ہوں"
" نورو سیٹھ۔ کاروبار ختم ہو سکتے ہیں
لیکن دوستی کہاں ختم ہو سکتی ہے" ! میں

نے واد طلب نگاہوں سے رشید ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رشید ماموں بوکھلا گئے۔ خفت سے گردن جھکا کر خوامخواہ کھانسنے لگے۔ اور نورو نے غم و مایوسی سے کہا "اس منحوس بیماری نے مجھے تباہ کر دیا۔ میرا سارا اثاثہ ختم ہوگیا۔ بیوی بچے دوست رشتہ دار سب الگ ہوگئے۔ سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ دن رات موت کی دعا مانگ رہا ہوں۔ اور کمبخت موت نہیں آتی۔ نہیں آتی"

رشید ماموں کھانستے ہوئے دواخانے سے باہر نکل گئے۔ اور صورت حال کی المناکی کے احساس سے آواز میرے حلق میں دب کر رہ گئی۔!

رات میں دیر تک وہ دونوں حساب کتاب میں مصروف رہے۔ دونوں کبھی کبھی بلند آواز میں ایک دوسرے سے الجھتے اور بار بار نورو کی بیٹھی ہوئی آواز کسی زخمی کتے کی طرح ابھرتی "آپ جانیں اور آپ کا ایمان"!

دوسرے دن گاؤں جانے سے پہلے رشید ماموں مجھے اندر دالان میں لے گئے۔ اور بڑے راز دارانہ لہجے میں بولے "نذیر میاں۔ نورو نے جن برتنوں میں کھایا ہے انہیں استعمال نہ کرو" میں ایکدم چونک گیا۔ اور میری بیوی نے گھبرا کر پوچھا "کیوں؟"

"بات ہی ایسی ہے" رشید ماموں دھیرے سے بولے "نورو اپنا شہر میں ہے۔ اگر وہ یہاں آئے تو اس سے ہرگز مت ملو۔ اسے گھر میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے" "لیکن کیوں؟" میں نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ ۔۔ نورو کو جذام کی بیماری ہے۔ مجھے رات میں معلوم ہوا"

رشید ماموں نے جلدی سے کہا "اسی لئے میں نے اس کو کاروبار سے بھی الگ کر دیا ہے۔ اور پھر تم میرے قریبی رشتہ دار ہو۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تمہیں خبردار کر دینا میرا فرض ہے۔" کہتے ہوئے رشید ماموں چلے گئے

میری بیوی حیرت اور غصہ سے چیخ پڑی۔ اور میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق کھڑا سوچتا رہ گیا ۔۔۔!

* *

(افسانہ)

حرام

سید علی ارسلان

گھٹے ہوئے ماحول کے پروردہ ایک شخص کی کہانی جو بڑے گناہ سے بچنے کیلئے چھوٹے گناہ کو جائز سمجھتا تھا۔

اُس نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آخری بار اپنے دلکش سراپے کا جائزہ لیا۔ سنگھار میز سے بوتل اٹھا کر پرفیومس کی پھوار اپنے لباس پر ماری اور پھر شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی

وہ ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی خوشبو استعمال کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر خوشبو، لپ اسٹک اور ادائیں اعلیٰ درجے کی استعمال کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ شکار بھی اعلیٰ درجے کا نہ ملے۔

اپنے فلیٹ میں باہر سے تالا ڈال کر وہ اپنے اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس کا اڈہ شہر کا وہ مشہور و معروف سینما تھا جس میں زیادہ تر انگریزی کی گرما گرم فلمیں لگتیں اور جن کے پوسٹروں پر عام طور سے لکھا ہوتا "صرف بالغان کیلئے"

وہ مردوں کی نفسیات سے خوب واقف تھی۔ کم علم بلکہ بے علم تھی اس پر بھی نفسیات کی اتنی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔

اور اگر کہیں خدا نخواستہ پڑھی لکھی ہوتی تو نہ جانے کیا کیا قیامتیں ڈھاتی۔

وہ جانتی تھی کہ ایسی گرم گرم توے کی طرح تپتی ہوئی، فلمیں دیکھنے کے بعد مردوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔

وہ بھٹی میں پڑے ہوئے لوہے کی طرح سُرخ ہو جاتے ہیں اور پھر نارمل ہونے کے لئے انھیں برف کی سلیں چاہئے، ہوتی ہیں۔

ایسے ہی مرد، افروز کا شکار ہوتے تھے، وہ ان کے لئے برف کی سِل بن جاتی لیکن یہ برف کی سل بہت مہنگی ہوتی، برف کے ڈپو پر بکنے والی سلیوں سے کئی گنا زیادہ مہنگی،

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سینما میں "صرف بالغان" کے لئے کوئی فلم نہ لگتی بلکہ سینما والا منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے کوئی نہایت صاف ستھری اردو فلم لگا لیتا۔ یہ دن افروز کے لئے بیروزگاری کے دن ہوتے

وہ زیادہ لالچی نہیں تھی۔ اور فطرتاً بھی لالچی نہیں تھی۔ چنانچہ ان دنوں میں کوئی اور اڈہ دیکھنے کے بجائے آرام کرتی۔

آرام آخر ایک ضروری چیز ہے خاص کر ایسی مشین کے لئے جسے پھر مستقل کئی ہفتے بغیر رکے چلنا ہو۔

تجربہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ تجربے کرتے کرتے انسان خود ہی بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ افروز بھی اب کافی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ شکل دیکھ کر اندازہ لگا لیتی کہ اس شخص کی جیب کا وزن کتنا ہوگا۔

شروع شروع میں جب اُس نے کاروبار شروع کیا تو اناڑی پن کے باعث کئی دفعہ مار کھا گئی، وہ خوبصورت کاروں کو دیکھ کر ریجھ جاتی اور بعد میں معلوم ہوتا کہ کار والے کی جیب اُس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے کیونکہ وہ کار ڈرائیور ہے مالک نہیں۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کار کے مالک تک کا جیب غبارے کی مانند ہلکی نکلی۔

لہٰذا اب افروز ظاہری آن بان کے بجائے اپنے ذاتی تجربے پر انحصار کرتی اور کامیاب رہتی۔

وہ سینما کے گیٹ کے پاس ایک دیوار کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ آخری شو ختم ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔

اس نے پرس میں سے چھوٹا آئینہ نکال کر اپنی نوک پلک درست کی اور شکار پر جھپٹنے کے لئے تیار ہو گئی۔

شو ختم ہوا اور انسانوں کا ریلا

رہا وہ سنیما سے برآمد ہونے لگا۔ افروز دیکھتی رہی۔ رنگ برنگے، کالے گورے موٹے دبلے، لمبے چھوٹے، امیر غریب سب لوگوں کو دیکھتی رہی۔ اس کا۔۔ کاروباری اصول تھا کہ اپنا شکار ہمیشہ خود پسند کیا کرتی تھی، دوسروں کی پسند پر خود شکار نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سنیما کے گیٹ سے نکلتے ہوئے لوگوں کو دیکھا وہ ہر آدمی کی شکل اور تاثرات دیکھ کر اندازہ لگایا کرتی تھی، کہ اس شخص کے کوائف کیا ہیں۔

چنانچہ اس نے سمجھ لیا کہ تیزی سے نکل کر آنے والا وہ موٹا سا لیکن شائستہ سا آدمی یقیناً شادی شدہ ہے جبھی تو وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر اپنی کار میں گھس گیا۔ اور تیزی سے رور نہ ہوگیا۔ افروز کو یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ تین نوشتہ شکل لڑکے جو خوش لباس بھی تھے، طالب علم ہیں، انھوں نے افروز کو ایسی نظروں سے گھور کر دیکھا جیسے ابھی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالیں گے اور افروز کو ایڑی سے چوٹی تک کے لئے خرید لیں گے۔ مگر افروز جانتی تھی کہ بظاہر دولت مند نظر آنے والے یہ نوجوان جیبوں میں سوائے سنیما کا ناکارہ ٹکٹ اور تھوڑی بہت ریزگاری کے، کچھ نہیں رکھتے اور انھوں نے فلم بھی آپس میں چندہ کرکے دیکھی ہوگی۔ افروز کا یہ اندازہ بھی درست تھا وہ تینوں اسے گھورتے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے گذر گئے۔

پھر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ٹہلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ جذبات سے تمتمایا ہوا تھا۔ افروز سمجھ گئی کہ یہ موٹی آسامی ہے اور اس کی جیب بھی دُبلی نہیں۔ وہ افروز کے قریب آکر رکا اور سرگوشی میں بولا۔

"چلوگی؟"

جواب میں افروز مُسکرادی۔ اس نے ایک ہاتھ افروز کے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ریٹ ہے؟"

افروز نے لغزت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "کیا کہہ رہے ہو مسٹر؟ ہوش میں تو ہو" وہ غرّائی۔ اس سے پیشتر کہ افروز کی آواز بلند ہوتی اور وہ کچھ اور بھی کہتی، وہ شخص کان دبائے چپ چاپ تیزی سے نکلا چلا گیا۔

"ہونہہ۔ کیا ریٹ ہے" افروز بڑبڑائی۔ کنجوس مکھی چوس۔ عورت کو بھی کپڑے کا تھان سمجھ رکھا ہے۔ حرامی ریٹ پوچھتا ہے"

وہ کافی دیر کھڑی رہی اور اس دوران بہت سے تیتے ہوئے مردوں نے اس کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی بھی پسند نہ آیا۔

پھر اپنے بالکل قریب موٹر سائیکل رُکنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی نوجوان لڑکا تھا جو ابھی موٹر سائیکلوں کے اسٹینڈ سے اپنی موٹر سائیکل نکال رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ" لڑکے نے نہایت سنجیدگی اور رعب سے حکم دیا۔ وہ ذرا ہچکچائی لیکن نہ جانے لڑکے کی آواز میں اور اس کے گھورنے میں کیا بات تھی کہ وہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"کہاں جاؤ گے؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"جہاں تم لے جاؤ گی" اس نے پہلے کی سی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو چلو پھر" اور افروز نے اسے اپنے فلیٹ کا پتہ بتا دیا۔ اس کے بعد وہ لڑکا ایک لفظ بھی نہ بولا۔ افروز کو خاصی الجھن ہونے لگی۔ اس نے لڑکے کے کان پر منہ لا کر کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نہ ہم نکاح کرنے جارہے ہیں اور نہ ہی محبت شروع کرنے کا کوئی ارادہ ہے لہٰذا نام بتانا کوئی ضروری بات نہیں" لڑکے نے جواب دیا۔ لیکن اب اس کے لہجے میں وہ ٹھنڈک نہیں تھی جو پہلے افروز کو محسوس ہوئی تھی۔ غالباً۔ افروز کے بدن کا لمس لڑکے کے لہجے تک پہنچ گیا تھا۔

لڑکے کے اس جواب پر وہ جھلا گئی اور اس نے طے کر لیا کہ اب وہ ہرگز نہیں بولے گی۔

موٹر سائیکل جب ایک موڑ پر مڑنے لگی تو افروز نے اپنے دونوں ہاتھ لڑکے کی کمر کے گرد حائل کر دیئے۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" لڑکے کو شاید گدگدی ہونے لگی۔

"کام کیا کرتے ہو؟" لڑکے کے بات کرنے پر وہ بول پڑی۔

"تم میری سسرالی نہیں ہو جو رشتہ طے ہونے سے پہلے اس قسم کی چھان بین کرتے ہیں۔ خاموش بیٹھی رہو۔"

افروز کو غصہ تو بہت آیا نہ جانے کیوں اُسے اس لڑکے میں کچھ کچھ کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ تھوڑی دیر گزر گیا۔ افروز سے رہا نہ گیا۔ "دنیا میں اکیلے ہو؟"

"خدا نہ کرے" وہ جلدی سے بولا۔ ماں باپ ہیں، بہن بھائی ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔"

"بیوی بھی ہو گی؟" افروز نے ذرا سی شہ پا کر گفتگو طویل کرنے کی... کوشش کی۔

"وہ ہوتی تو تمہارے پاس کیوں آتا؟" لڑکے نے سرد لہجے میں بولنے کی کوشش کی لیکن افروز بھی ایک جہاندیدہ تھی سمجھ گئی کہ سرد لہجے کی مصنوعی تہہ میں کتنے انگارے پوشیدہ ہیں۔ اس کے ہاتھ ابھی تک لڑکے کی کمر کے گرد حائل ہوئے تھے۔ اور انہی ہاتھوں نے کسی تھرمامیٹر کی طرح بتایا کہ لڑکے کے جسم میں تپش کی رو دوڑنا شروع ہو گئی ہے۔ اور جب کسی جھٹکے پر افروز لڑکے سے ٹکرائی تو لڑکے کے بدن میں کپکپی سی دوڑ جاتی۔

افروز سمجھ چکی تھی کہ یہ بیس بائیس سالہ لڑکا بھی مردوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے اندر جذبات کا آتش فشاں رکھنے کے باوجود ظاہر یہی کرتے ہیں کہ جیسے وہ بے حد پرسکون ہیں یہاں تک کہ اپنی عارضی طور پر خریدی ہوئی عورت پر بھی اپنے جذبات کا منفی طریقے سے اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس سے ایسا سلوک کرتے رہتے ہیں۔ جیسے اس پر احسان کر رہے ہوں بیوقوف یہ نہیں جانتے کہ خود اس وقت وہ اپنی ہی خریدی ہوئی کرائے کی عورت کے زیر احسان ہیں۔

لڑکے کی نفسیات سمجھتے ہی افروز کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیچارہ مرد۔ زیر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو زبر سمجھتا رہتا ہے۔

مگر افروز کا تجربہ یہ بھی کہتا تھا کہ ایسے مرد بڑے چھپے رستم ہوتے ہیں اوپر سے جتنے مہذب اور شریف لگتے ہیں، اندر سے اتنے ہی کمینے اور جنگلی نکلتے ہیں۔ عورت سے کسی بھیڑیئے کی طرح پیش آتے ہیں اور مفتوح کی طرح سلوک کرتے ہیں۔

اِن تمام اندازوں کے باوجود افروز کو کچی عمر کا یہ نوجوان لڑکا اچھا لگ رہا تھا جانے کیوں؟

لیکن صرف اچھا لگ رہا تھا، اُسے اس لڑکے سے عشق نہیں ہوا تھا کیونکہ افروز کے بزنس میں عشق کی گنجائش ہرگز نہیں تھی۔ اس قسم کے کاروبار میں عشق کی گنجائش ہوتی بھی نہیں۔ اگر کچھ احمق لڑکیاں پھر بھی گنجائش نکال لیں تو بعد میں پچھتاتی ہیں۔ چنانچہ یا تو بزنس کر لو یا پھر عشق۔ اور افروز کو بزنس زیادہ پسند تھا۔ اس لئے کہ بزنس سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور عشق ضرورتیں چھین لیتا ہے۔

موٹر سائیکل ایک زوردار جھٹکے سے رک گئی اور اس جھٹکے کے ساتھ ہی افروز کا بدن پورے زور سے لڑکے کے جسم سے ٹکرایا۔ افروز نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ لڑکے کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا ہے۔ اس نے ایک زبردست جھرجھری لی تھی۔

ستارہ بلڈنگ آ گئی تھی۔ افروز کا فلیٹ اسی بلڈنگ میں تھا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے افروز نے لڑکے کا ہاتھ تھام لیا۔ لڑکے کا ہاتھ استری کی طرح گرم تھا۔ افروز نے سوچا کہ

ابھی کچھ دیر بعد یہ استری اس کے بدن کی سلوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہوگی مگر پھر بھی سلوٹیں کم ہونے کے بجائے بڑھ جائیں گی۔ ہر استری اس کے جسم کی شکنوں میں اضافہ کر دیتی تھی۔ چونکہ اب وہ بالکل نئے کپڑے کی طرح کرکرا اور کلفدار نہیں رہی تھی۔ مسلسل استعمال کی وجہ سے جسم میلا اور شکن آلود ہو چکی تھی۔

اپنے فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے لڑکے کا ہاتھ چھوڑا، پرس میں سے چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی لڑکا ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔ غالباً اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دے رہا تھا یا پھر یہ کہ یہاں آکر پچھتا رہا تھا۔

افروز نے لائٹ جلا کر پیچھے دیکھا اور لڑکے کو نہ پاکر دروازے پر آ گئی۔

"ارے! تم ابھی تک باہر ہی کھڑے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے بلایا ہی نہیں تھا۔"

افروز ہنس پڑی۔ "میرا اندازہ ہے کہ یہ تمہاری زندگی کا پہلا اتفاق ہے اور میرے اندازے غلط نہیں ہوتے۔"

"مگر تمہارا یہ اندازہ بالکل غلط ہے۔ اور ابھی تمہارے کئی اندازے غلط ثابت ہونا ہے۔" لڑکا ابھی تک اندر نہیں آیا تھا۔ "میری زندگی کی پہلی عورت نہیں ہو۔ تمہارا نمبر انیسواں ہے۔"

افروز نے پھر قہقہہ لگایا۔ "اس کے باوجود تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ہم جیسے میزبانوں کے گھر میں آنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر بولا "لیکن تم جیسے میزبانوں کا سابقہ ایک ہی قسم کے مہمانوں سے پڑتا ہے۔ شاید میں اُن سے کچھ مختلف ہوں۔"

"ہونہہ ....." افروز منہ پھیر کر بولی۔ "یہاں آنے والے سب لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔ ہر آنے والے کے تیور بھی ہوتے ہیں، خواہشات وہی ہوتی ہیں، انداز ایک جیسا ہوتا ہے سب خریدار ہوتے ہیں۔ پیسہ پھینکتے ہیں اس پیسے کے عوض سکون کی رات گزارتے ہیں اور رات کے ساتھ ہی خود بھی رخصت ہو جاتے ہیں۔" افروز کی آواز میں درد گھل گیا۔

"بہرحال۔ تم نے مجھے اندر آنے کی اجازت ابھی تک نہیں دی ہے۔" لڑکا شاید اُس کی تقریر سے بیزار ہو گیا تھا۔

"اوہ - ہاں ہاں - بالکل اندر آؤ۔ تمہارا ہی گھر ہے، کم از کم آج رات کے لئے تو تمہارا ہی ہے۔"

لڑکا خاموشی سے اندر آ گیا۔ ابھی تک نہ وہ مسکرایا تھا اور نہ اس نے کوئی غیر ضروری بات کی تھی۔ افروز کی کوشش کے باوجود وہ رُوکھا رُوکھا تھا اور اب افروز کو اس کے اس رویّے سے کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی وہ اس سے باتیں کرے، ہنسے بولے مگر وہ لڑکا اس کے ہر مذاق کا جواب انتہائی فلسفیانہ.. انداز سے دیکر اُس کے، گفتگو طویل کرنے کے تمام راستے بند کر دیتا تھا۔

لڑکا اندر آ گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

افروز نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور لڑکے کے پاس آنے کے بہانے ایک بار پھر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو گئی۔ وہ تمام ہتھیاروں سے لیس تھی۔

وہ صوفے پر آ کے لڑکے پر لاڈ کے انداز میں اس سے جڑ کر بیٹھ گئی۔ لڑکے نے پھر جھرجھری لی۔ افروز اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔

لڑکے کا چہرہ شدّتِ جذبات سے لال بھبوکا ہو چکا تھا۔ اور اعصاب کھنچے ہوئے تھے، اس کی کنپٹی کی ایک رگ مسلسل پھڑک رہی تھی اور وہ اضطراب کے عالم میں صوفے کے فوم کو مسل رہا تھا۔ افروز دل ہی دل میں مسکرائی۔ اس کی انگلیاں لڑکے کے بالوں سے ہوتی ہوئی اس کی گردن

پہ پہنچایں اور افروز کو سہلاتے ہوئے انگلیاں
پھر رینگنے لگیں۔ افروز نے کن انکھیوں سے
دیکھا۔ لڑکے کے ہاتھوں کی گرفت
صوفے کے فوم پر مضبوط ہوتی جارہی تھی
اور اس کا تنفس تیز ہو چلا تھا۔ لو گرم
ہورہا تھا۔ پھر افروز نے گرم لہجے پہ قرب
لگانے کی ٹھان لی۔ وہ اٹھ گئی۔

"میں ذرا کپڑے تبدیل کرلوں۔"
اتنا کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔
لڑکا اسے سرخ سرخ آنکھوں سے جاتا
دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب شب خوابی
کے شوخ لباس میں باتھ روم سے برآمد
ہوئی تو اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے آگ
کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو افروز کے قالب
میں ڈھال دیا گیا ہو۔ لڑکے کی آنکھیں
دہک اٹھیں۔

شب خوابی کا یہ شوخ لباس ہر
آنے والے کی پذیرائی کے لئے نہیں تھا۔
یہ اہتمام تو وہ صرف اپنے "دل پسند"
مہمانوں کے لئے کیا کرتی تھی۔ اس لڑکے
کی تو بات ہی اور تھی، یہ تو بہت ہی زیادہ
"دل پسند" تھا۔

"کچھ پیو گے؟" اس نے لڑکے
سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں پیتا۔"

"کمال ہے۔ دولت مند ہو۔ جوان
ہو۔۔ اور خود مختار بھی اس کے باوجود
نہیں پیتے۔"

"ہاں اس کے باوجود نہیں پیتا۔"
لڑکے کی نظریں افروز کے جسم پر گڑی
ہوئی تھیں۔

وہ پھر آکے لڑکے پر ڈھیر ہو گئی
اور اس بار لڑکے نے بھی وحشت کی
بلندیوں کو چھو لیا۔ وہ اپنے آپ پر
قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے افروز کو اپنے
بازوؤں میں سختی سے جکڑ کر اس کے
ہونٹوں پر اپنے لبوں سے ایک گہری
مہر لگادی۔ پھر اس کے ہاتھوں نے بھی
جنبش کی اور بھٹکنے لگے۔ پھر اس پر جنون
طاری ہو گیا۔ اس نے افروز کے جسم
سے تمام چھلکے اتار پھینکے اور اسے۔۔۔
بازوؤں میں بھر کر مسہری پر آ گیا۔ اس
کے جلتے ہوئے ہونٹ افروز کے چہرے
اور گردن کو جگہ جگہ سے داغ رہے تھے۔
افروز پر غنودگی طاری ہونے لگی، اس
کے دماغ پر جیسے کسی نے شراب چھڑک
دی۔ وہ لڑکا اس کے حلقۂ احباب کا
انکشاف ثابت ہو رہا تھا۔ شاید اس
لئے کہ وہ اسے شروع ہی سے اچھا
لگ رہا تھا پہلے پہلے محبوب کی طرح
ہر چند کہ وہ نہ تو محبوب تھا اور نہ ہی
پہلا۔ وہ مدہوش ہوتی گئی۔

اور پھر جب افروز نے ہاتھ بڑھا
کر ٹیبل لیمپ بجھانا چاہا تو لڑکے نے
اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں؟" وہ لڑکھڑائی آواز
میں بولی۔ "گناہ تو ہمیشہ اندھیرے ہی میں
کیا جاتا ہے۔"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ روشنی
مت بجھاؤ۔"

"چلو جیسی تمہاری خوشی۔ روشنی
میں ہی سہی۔" افروز نے اپنا ہاتھ واپس
کھینچ لیا۔ اور دوبارہ نشے میں ڈوب گئی۔
لیکن پھر اس کا سارا نشہ، سارا سرور
ہرن ہو گیا۔ لڑکا اس کا ایک طویل بوسہ
لینے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" افروز نے
کسی ایسے بچے کی طرح سوال کیا جسے اس
کا من پسند کھلونا دے کر کھیلنے سے پہلے
ہی چھین لیا گیا ہو۔

"کچھ نہیں۔" لڑکے نے میز پر سے
موٹر سائیکل کی چابی اٹھاتے ہوئے جواب
دیا۔ اس کی آواز برفانی ہواؤں کی طرح
یخ بستہ تھی۔ اس نے ایک سگریٹ نکال
کر سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔
اب اس کے چہرے پر وحشت اور جنون
کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ بے حد پرسکون
لگ رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔۔۔۔"

"واپس اپنے گھر۔" اس نے پتلون
کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک موٹی
سی گڈی نکالی اور مسہری پر پھینک دی۔

"مگر ... کیوں جا رہے ہو؟" افروز اپنی اس توہین پر تلملا گئی۔ گویا ایسا لگ رہا تھا جیسے لڑکے نے اس کے حسن پر، اس کے شباب پر تھوک دیا ہو۔ اس نے نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھا تک نہیں۔ "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی؟"

"نہیں، تم ایک اچھی اور پرجوش ساتھی ثابت ہوئیں۔ لیکن میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی تمہارا مقصد کہاں پورا ہوا ہے؟"

"تم جس کو مقصد سمجھ رہی ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور میں اتنا زیادہ گنہگار بننا نہیں چاہتا۔" وہ چٹخنی کھولنے لگا۔

"تو اب تک تم نے جو کچھ کیا وہ کونسا ثواب تھا؟" افروز سلگ اٹھی۔

"مانتا ہوں کہ یہ بھی گناہ ہے۔ لیکن چھوٹا گناہ ہے۔ بڑے گناہ سے بچنے کے لئے اگر چھوٹا گناہ کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ مجھے تو اس چھوٹے گناہ نے ہی سیراب کر دیا ہے۔ پھر بڑا گناہ کیوں کروں؟"

"لیکن تم نے یہ چھوٹا گناہ بھی کیوں کیا؟" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ "تم یہاں آئے ہی کیوں؟"

"سنو نرگس" وہ بیٹھ گیا اور سرگوشی میں ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "میں بھی ایک انسان ہوں، ایک مرد ہوں اور ستم یہ کہ نوجوان ہوں میرے بدن میں بھی آتش فشاں ہے، میرے اندر بھی جذبات کا لاوا کھولتا ہے۔ مگر میں ایک عزت دار گھرانے کا فرد ہوں، مشرقی معاشرے کا جزو ہوں، گھٹے ہوئے ماحول کا پروردہ ہوں۔ جہاں یہ گناہ سمجھا جاتا ہے اور ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں گناہ عظیم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، اپنے ماں باپ کا اعتقاد بھی بحال رکھنا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں اپنے ابلتے ہوئے خون سے مجبور ہوں۔ اپنے بدن کے فطری تقاضوں کے آگے جھک ضرور جاتا ہوں لیکن گھٹنے نہیں ٹیکتا۔ اپنے منہ زور جذبات کے لاوے کو بہنے نہیں دیتا مبادا سب کچھ بھسم ہو جائے۔ لہٰذا بڑے گناہ کا راستہ چھوٹے گناہ سے روک دیتا ہوں۔ اگر یہ بھی نہ کروں تو خدا جانے کیا ہو جائے۔ میں نے جسم کی بھٹی میں پگھل کر کھولتے ہوئے جذبات کے لاوے پر بند باندھ دیا ہے، چھوٹے گناہ کا بند۔ اور پرسکون ہوں، آسودہ ہوں۔ میرا ضمیر ہلکا ہے امید ہے اب تم میری بات سمجھ گئی ہوگی!"

اس نے جانے کیلئے قدم بڑھائے۔

افروز نے پرنم آنکھوں سے نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھا یہ اس کی قیمت سے چار گنا زیادہ رقم تھی وہ تیزی کے ساتھ اٹھی اور نوٹوں کی گڈی اس کے منہ پر مارتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

"اٹھاؤ اپنے یہ نوٹ۔ میں بھی حرام کھانا پسند نہیں کرتی" وہ

محمد اکرام اللہ خان

فلم نامہ

ہر شخص اچھی فلموں کی ضرورت پر زور دیتا ہے لیکن کسی اللہ کے بندے نے آج تک اچھے سینما ہال کی ضرورت پر کبھی اظہار خیال نہیں کیا۔ حالانکہ سینما ہال ہی وہ جگہ ہے جسے ہم فلموں کی ٹکسال کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ ان جگہوں سے فلموں میں لگائی ہوئی رقم فلمسازوں کو واپس ملتی ہے۔ سینما اب انڈسٹری کی تعریف میں آچکے ہیں لوگ لاکھوں روپیہ لگا کر سینما ہال تعمیر کرتے ہیں لیکن اس کی نگہداشت میں وہ دلچسپی نظر نہیں آتی جو سینما بنانے میں دکھائی جاتی ہے۔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک ہزاروں سینما گھر موجود ہیں جن سے لاکھوں آدمیوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ہندوستان ہی وہ واحد مقام ہے ساری دنیا میں جہاں تفریح کے لئے صرف سینما کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ کم سے کم صرفے پر ڈھائی گھنٹہ کے لئے "اعضیں ہنسی، مذاق موسیقی، گانے اور زندگی کی مختلف جھلکیاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سینما کے ذریعے عوام کی تفریح ہی نہیں ہوتی بلکہ اس سے حکومت کو بھی ٹیکس کی شکل میں کروڑوں روپیہ کا فائدہ ہوتا ہے۔

تفریحی ٹیکس جو ہر ٹکٹ پہ لیا جاتا ہے اس کی آمدنی گذشتہ سال کے اعلان کے مطابق صرف آندھرا پردیش میں آٹھ کروڑ روپیہ ہوئی تھی۔ اس سے سارے ہندوستان کی آمدنی کا اندازہ لگائیے گا۔ اس طرح تمام ٹیکس ادا کر کے ڈسٹری بیوٹر کے حصہ کی رقم نکالنے کے بعد بھی سینما والا اپنے لئے ایک قابل لحاظ منافع نکال لیتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ کروڑوں روپیہ کا منافع کمانے والی یہ انڈسٹری اپنے سرپرستوں یعنی فلم دیکھنے والوں کو کیا دیتی ہے اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ:۔

- سینما کے ٹکٹ مجبوراً لوگ بلیک میں خریدتے ہیں اور پولیس والے اس کا تدارک نہیں کرتے۔
- سینما کا اسٹاف خود اپنے طور پر بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے اور سینما کا مالک اس کا کوئی سدباب نہیں کرسکتا۔
- سینما کا مالک مقررہ سیٹوں سے زائد سیٹیں ڈال کر اپنی آمدنی غیر قانونی طور پر بڑھا لیتا ہے اور سینما دیکھنے والے اس پر اعتراض نہیں کرتے۔
- ٹکٹ لینے کے لئے لائن بنانا ضروری ہے لیکن اس کی پابندی کی کسی کو پرواہ نہیں ہوتی۔
- سینما کے دوران سگریٹ نوشی کی ممانعت ہوتی ہے لیکن اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔
- پھٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی سیٹوں پر بیٹھنا نصیب ہوتا ہے لیکن مالک سینما کو پرواہ نہیں ہوتی۔
- لارل اور ہارڈی کی پرانی فلموں کے ٹکڑوں کو جمع کر کے ایک فلم بنائی جاتی ہے اور اس طرح عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔
- سینما میں لائٹ اور ساؤنڈ اتنا خراب ہوتا ہے کہ نہ تو فلم ہی اچھی طرح دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی گانا ہی سمجھ میں آتا ہے پھر بھی لوگ مجبوراً برداشت کر لیتے ہیں۔
- فلموں کی مقبولیت بڑھانے کے لئے وقفہ وقفے سے ایک ادھ نئے گانے یا نئے سین کا اضافہ کر دیا جاتا ہے
- ہال کے اندر گندگی، پیشاب خانوں میں سڑن اور بدبو سے دم گھٹنے لگتا ہے لیکن سینما والوں کو صفائی کا کوئی خیال نہیں رہتا۔
- پہلے بڑے درجوں کے ٹکٹ بیچنا شروع کیا جاتا ہے اور پھر کم درجوں کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے ہیں
- امرتسر میں ایک سینما والے نے فلم بینوں کا ہجوم دیکھتے ہوئے پورے سینما کا ایک ہی ٹکٹ رکھ دیا تھا تاکہ عوام کو لوٹا جاسکے۔

[illegible] والوں کو شکایت رہی
کہ وہ فلم اطمینان سے نہ دیکھ سکے کہ وہ
مارننگ شو میں لگی تھی اور جب فلم شروع
ہوتا تو وہ یا تو دفتروں میں ہوتے یا
مدرسوں میں۔

ہ سینما کے مالک اپنے اسٹاف کو مقررہ
شرح سے کم تنخواہ دیتے ہیں جس کی بدولت
اسٹاف بھی بغیر ٹکٹ چور دروازے سے لوگوں کو
سینما دکھاکر پیسے وصول کر لیتے ہیں۔

ہ ہر تین سال میں سینما ورکرز
لیبر آفس میں درخواست دیتے ہیں کہ ان کی
تنخواہ کی شرح پر نظر ثانی کی جائے اور ہر
تین سال بعد سینما والے پولیس کمشنر اور
کلکٹر سے رجوع ہوتے ہیں کہ انھیں سینما کے
ریٹ بڑھانے کی اجازت دی جائے۔

ہ سینما کا مالک اپنے سینما کو ہفتہ
واری کرایہ پر دوسروں کو دیدیتا ہے
اس کا آمدنی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لئے
وہ سینما کی دیکھ ریکھ سے غافل ہوجاتا ہے۔

ہ بعض سینماؤں میں پیشاب خانے
اتنے کم ہوتے ہیں کہ لوگ سڑکوں اور گلیوں
میں غلاظت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہ ایرکنڈیشنڈ کے اسپیشل ریٹ
وصول کرکے ایرکنڈیشنس نہیں چلاتے
اس لئے کہ بجلی کا صرفہ ہوتا ہے

یہ سب باتیں ہیں تو چھوٹی چھوٹی
سی لیکن کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اس کا
ذمہ دار کون ہے یقیناً ہمارا سماج اور
ہمارا معاشرہ ہے اور اس کے ذمہ دار
ہم اور آپ ہی ہیں۔ اس لئے کہ آج
تک کسی بھی زیادتی کے خلاف احتجاج
کرنے کی ہمیں توفیق نہیں ہوئی۔ اگر
آپ اور ہم مل کر ان زیادتیوں کے خلاف
کوئی قدم اٹھائیں تو کیا یہ ایک خدمت
نہ ہوگی سماج اور معاشرہ کو بہتر بنانے
کے لئے؟

— ہ —

گذشتہ مہینے ہماری فلم انڈسٹری
میں وہ واقعہ ہوا جس کی مثال آج تک
نہیں ملتی۔ سنا ہے کہ ذرا سی تکرار پر
شترو گھن سنہا اور سنجے خان میں زبردست
لڑائی ہوئی چنانچہ ایک رات شترو گھن
سنہا نے دوست احباب اور کچھ غنڈوں
کو ساتھ لیکر سنجے خان کے مکان پر
دھاوا کر دیا تھا کہا جاتا ہے کہ پستول سے
گولیاں بھی چلائیں، مکان اور فرنیچر کو
نقصان پہونچا لیکن معاملہ آگے بڑھنے
سے پہلے ہی منوج کمار اور دلیپ کمار کی
مصالحت کی بدولت ختم ہوگیا۔

— ہ —

آج سے ۲۶ سال پہلے محمد رفیع
نے فلموں میں گانا شروع کیا تھا اور آج
تک انھوں نے ۲۶ ہزار گانے ریکارڈ
کروائے ہیں جو لتا منگیشکر کے ریکارڈوں
کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ خاموش
طبیعت اور ملنسار محمد رفیع اپنے خوبصورت
سے مکان میں بڑی پرسکون زندگی گذارتے
ہیں انھوں نے ناصر خان مرحوم سے لیکر
رشی کپور، امیتابھ بچن، امجد خان اور دلیپ
کمار وغیرہ کے لئے گانے گائے ہیں۔ چار
لڑکے ہیں اور چاروں باہر ہیں مختلف
ایرلائنس میں ملازم ہیں اور ایک
آکسفورڈ میں زیر تعلیم ہے۔ ساری دنیا
کا سفر کیا ہے ہر مقام پر اپنی آواز کا
جادو جگایا ہے حال ہی میں جنوبی افریقہ
گئے تھے جہاں انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ
کیا تھا جس کی بدولت جنوبی افریقہ
کے ایک اخبار نے ان کو "کنگ رفیع"
کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ●—

تماشائی

فلمی ڈائری

منوج کمار کی زبردست فلم "کرانتی"
بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔ منوج کمار تیزی سے
اس کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ منوج کی
اب تک کی فلموں میں منوج کا کردار مرکزی
اہمیت کا حامل ہوتا تھا جب کہ کرانتی
میں اس کے ہر کردار نے انتہائی اہم
رول ادا کیا ہے۔ دلیپ کمار، منوج کمار
ہیما مالینی، شتروگھن سنہا، ششی کپور
پروین بابی، پریم چوپڑہ، پردیپ کمار
مدن پوری اور دوسرے بہت سے اداکاروں
نے اپنے چھوٹے بڑے کردار نہ صرف بڑی
خوبصورتی سے نبھائے ہیں بلکہ فلم کے
مجموعی تاثر کو ابھارنے میں اہم حصہ
ادا کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس فلم کے
ڈھائی گھنٹے کے ایڈٹ کئے ہوئے
حصے دیکھے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ فلم
ہندوستانی فلمی تاریخ کا ایک ناقابل
فراموش باب ہوگی۔ ویسے اس فلم
کی کہانی ہمارے ملک کی تاریخ کے
ایک ناقابل فراموش دور سے تعلق رکھتی
ہے جبکہ ہندوستانی غلامی کی زنجیر کو
توڑ پھینکنے کے لئے تن من دھن
کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ کرانتی
نہ صرف ہندوستان کی عظیم فلموں میں
سے ایک ہوگی بلکہ دنیا کی عظیم فلموں
"GONE WITH THE WIND"
اور DR. ZHIVAGO
وغیرہ کے ساتھ اس کو شامل کیا
جاسکے گا۔ اس فلم کی موسیقی بھی انتہائی
دلکش ہے ابھی اس فلم کی سو دن
کی شوٹنگ باقی ہے جسے منوج کمار
بڑی تن دہی اور محنت سے مکمل
کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

*

ٹینا، راکھی اور زینت
بمبئی کی ہوٹلوں میں کیبرے رقص پیش
کر رہے ہیں۔ فلمی ستارے اور ہوٹل
کے کیبرے رقص کیا کسی فلم کی شوٹنگ
کی بات ہو رہی ہے؟ جی نہیں بات
کسی فلم کی شوٹنگ کی نہیں ہوٹلوں
کے کیبرے رقص کی ہے۔ لیکن ٹینا منیم
راکھی گلزار اور زینت امان نہیں
ہیں بلکہ کیبرے کرنے والی لڑکیوں
کو فلمی ستاروں کے نام دے دیئے
گئے ہیں۔ تاکہ ان ناموں کی کشش
کیبرے کو زیادہ مقبول بنا سکے۔

*

جانی بابو قوال جن کی قوالیاں
سارے ہندوستان میں دھوم مچا رہی
ہیں اب قوالی کے میدان سے نکل کر
فلم سازی کے میدان میں داخل ہوگئے
ہیں۔ انھوں نے اپنی فلم "محفل یاراں"
کے لئے اے شمشیر سے معاہدہ کیا
ہے۔ جو اس فلم کو تحریر بھی کریں گے
اور ہدایت بھی دیں گے۔

*

۱۹۷۸ء کا فلم فیر ایوارڈ بہترین
اداکاری پر امیتابھ بچن کو دیا گیا ہے
"ڈان" میں اس نے دو مشکل
کرداروں کے رولز کئے ہیں۔ راجیش کھنہ
کو "سچا جھوٹا" میں فلم فیر ایوارڈ
دیا گیا تھا اور "سچا جھوٹا" میں
راجیش نے بھی اسی طرح کے دو رولز
ادا کئے تھے۔ ان دو رولز میں ایک
رول شہر کے مجرم کا ہے اور دوسرا
ایک سیدھے سادے دیہاتی کا
جو حالات سے مجبور ہو کر جرم کی
دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ راجیش
کو جب یہ ایوارڈ ملا تھا "سچا جھوٹا"
بمبئی کے سینما موتی میں چل رہی تھی
آج ڈان بھی موتی میں لگی ہوئی
ہے ان دونوں فلموں کی موسیقی
کلیان جی آنند جی کی ہے جو کافی
مقبول ہوئی ہے۔

*

دلی میں ایک سروے کیا گیا جس
میں ۷۹۳ عورتوں کی رائے لی گئی۔
سروے کا موضوع تھا کہ ہندوستانی
فلموں میں بوسہ بازی پیش کی جائے

یا نہیں۔

۱۶ سے ۶۰ سال تک عمر کی ۱۱۴ عورتوں نے بوسہ بازی کی حمایت کی۔ مگر ان کا خیال تھا کہ یہ بوسہ بازی ان اداکاروں کی ہونی چاہیئے جو اسکرین کی دنیا سے باہر یعنی اپنی حقیقی زندگی میں شوہر اور بیوی ہیں۔ دس عورتوں نے غیر شادی شدہ جوڑوں کی بوسہ بازی کو بھی موزوں قرار دیا۔ صرف ۸۹ عورتیں بوسہ بازی کے خلاف تھیں اس سروے سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ ہندوستانی عورتیں بوسہ بازی کے معاملے میں تیزی سے آزاد خیال ہو رہی ہیں۔

✽

پریم ساگر نے اپنی فلم کا نام "پریم دیوانی" رکھا۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہ نام دوسرے فلم ساز کے لئے "رجسٹرڈ" ہے۔ جب فلم اس نام سے تقسیم کاروں کو فروخت کر دی گئی تو دوسرے فلم ساز نے پریم ساگر کی فلم کے نام پر اعتراض کیا اور اپنے عنوان سے دست بردار ہونے کے لئے بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ پریم ساگر نے اپنی فلم کا نام "پریم پجارن" رکھ لیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد سا حرنے جو اس فلم کے گانے تحریر کر رہے تھے ایک گانا لکھا "ہم سے کرلو پیار ہم تیرے عاشق ہیں"۔ پریم ساگر کو اپنی فلم کا موزوں ترین نام مل گیا۔ انھوں نے "پریم پجارن" کو "ہم تیرے عاشق ہیں" بنا دیا۔

✽

خلیجی ریاستوں میں ہندوستانی باشندے نہ صرف بڑی بڑی تنخواہوں پر نوکریاں حاصل کر رہے ہیں۔ بلکہ ہندوستانی فلموں کے لئے ایک نیا مارکٹ بھی بنا رہے ہیں۔ ان ریاستوں میں کئی ہندوستانی فلموں کی نمائش ہو رہی ہے ابوظہبی اور دوبئی میں کئی ملیالم فلمیں زور و شور سے چل رہی ہیں کیونکہ یہاں کیرالا کے رہنے والوں کی کثرت ہے

✽

جرمن یونیورسٹی کی ایک ٹیم جو تین افراد پر مشتمل ہے۔ آج کل ہندوستانی فلموں کا سروے کر رہی ہے مشہور ہندوستانی فلموں کے متعلق اعداد و شمار جمع کر رہی ہے اور اس بات کا مطالعہ کر رہی ہے کہ یہ فلمیں غریب عوام پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس ٹیم نے بعض مشہور ہندی فلموں کے تعلق سے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بیحد دلچسپ ہیں۔

"ستیم شیوم سندرم" ایک ملغوبہ ہے "شالیمار" بے مزہ، وحشت ناک اور بے مقصد فلم "شعلے" زیادہ انگریزی فلموں کا چربہ "ہمارے تمہارے" بیکار فلم "جنون" تاریخی پس منظر میں ایک ایسی فلم جس کا تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

"ساجن بن سہاگن" فلم کم معجزہ زیادہ "مقدر کا سکندر" فلم میں کوئی کہانی نہیں ہے۔ مختلف ٹکڑوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

"دلہن وہی جو پیا من بھائے" کو اس ٹیم نے پسند کیا کیونکہ یہ صحیح ہندوستانی پس منظر میں پیش کی گئی ہے۔

✽

ٹامل ناڈو کی حکومت نے جب سے ٹامل فلموں کی نمائش کو لازمی قرار دیا ہے۔ مدراس میں ہندی فلموں کے لئے سینما نہیں مل رہے ہیں۔ تقسیم کار بھی ہندی فلموں کو خریدنے سے گریز کر رہے ہیں یہاں سینماؤں میں چار چار شو تو دکھائے جا رہے ہیں۔ تاکہ اس طرح ہندی فلموں کو کچھ وقت مل سکے۔

✽

"شالیمار" کی انگلش کاپی کو پاکستان میں نمائش کیلئے ۵۰ ہزار ڈالرس میں خریدا گیا ہے۔

تامل ناڈو کی حکومت فلموں کے عریاں پوسٹرز کی عام نمائش پر پابندی عاید کرنے پر غور کر رہی ہے۔ ریاستی وزیر اطلاعات نے بتایا کہ تقسیم کار ان احکامات کے خلاف عدالت سے "حکم التوا" بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ تامل ناڈو میں قابل اعتراض ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

★

فلم ساز ہدایت کار اکبر خان کی فلم "حادثہ" کی یونٹ جو تقریباً سو آدمی پر مشتمل ہے دوسری مرتبہ کشمیر میں شوٹنگ کے لئے روانہ ہو گئی ہے اس فلم میں اشوک کمار، رنجیتا، یوگیتا بالی، راکھی اور امجد خان اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ کہانی اسکرین پلے اور مکالمے ساگر سرحدی کے ہیں۔ اور موسیقی کلیان جی آنند جی کی ہے۔

اپیل

بچوں سے متعلق ہماری قومی پالیسی میں بچوں کو قوم کا انتہائی اہم سرمایہ مانا گیا ہے اور ان کی پرورش نیز بہبود کو ہماری ذمہ داری تسلیم کیا گیا ہے اس انسانی سرمایہ کا فروغ حکومت کا مقصد رہا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے پروگرام تیار کئے گئے ہیں بچوں کے بین الاقوامی سال کے باعث ہماری کارگزاریاں تیز تر ہوگئی ہیں اور حکومت کے قومی عملی منصوبے میں بچوں کو خوراک، صحت اور تعلیم کی فراہمی کے قدم اٹھائے گئے ہیں اس عملی منصوبے میں نہ صرف سرکاری اداروں بلکہ رضا کار تنظیموں کے رول کا بھی تعین کیا گیا ہے بیشتر خیال سے بچوں کی بہبود اور ترقی میں رضا کار اولوں سے اہم رول ادا کر سکتے ہیں بچوں کی پرورش انتہائی توجہ اور قیمت کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے جو کہ صرف رضا کار تنظیموں کے فرض شناس لوگ کر سکتے ہیں ان کی مدد کے لئے ہم نے بچوں سے متعلق قومی فنڈ قائم کیا ہے اس کا بنیادی مقصد ان رضا کار تنظیموں کی مالی امداد کرنا ہے جو بچوں کی بہبود کے پروگرام چلا رہی ہیں اور خصوصاً مندرج فہرست ذاتوں اور قبائل کے بچوں نیز نادار بچوں کی بہبود کے پروگرام چلا رہی ہیں۔

اس بات پر توجہ دینا قوم کی ذمہ داری ہے کہ اس کے بچوں کو جو مستقبل کی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں نشو و نما کی پوری سہولتیں ملیں۔ بچوں کے قومی فنڈ سے ہر شخص کو اس بات کا شاندار موقع ملے گا کہ وہ بنی نوع انسان کے مستقبل کی بہبود کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق عطیہ دے۔ میں کاروباری

(باقی صـــ پر)

فلمی تبصرہ

سُورگ نرک

بشیر انور

جنوبی ہند کے ممتاز فلم ساز بی۔ ناگی ریڈی نے جب ہندی فلموں کی طرف توجہ کی تو انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی کامیاب اور کامیاب ترین فلمیں بنا ڈالیں۔ اُن کی ایک تازہ فلم "سورگ نرک" ہندوستان کے کئی شہروں میں کامیابی کے ساتھ زیر نمائش ہے اس فلم کے ذریعہ ناگی ریڈی صاحب نے بھارت کی پڑھی لکھی مہیلاؤں کو یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بے بنیاد شک کی وجہ سے ایک سکھی جیون نرک بن جاتا ہے اور ناری کی تپسیا سے کیسے ایک دکھی گرہستی سورگ میں تبدیل ہو جاتی ہے (ویسے شوہروں کے لئے تو شادی کے بعد اور موت سے پہلے کی زندگی نرک بنا رہتا ہے)

کہانی شروع ہوتی ہے دو عزیز ترین سہیلیوں کے دعوؤں سے کہ وہ اپنی بیاہتا زندگی کس طرح بتائیں گی۔ پھر ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے دونوں سہیلیوں کو اچھے نوجوان خوبرو اور مالدار شوہر مل جاتے ہیں۔ موسمی چٹرجی کی شادی جیتندر سے ہوتی ہے جو کسی کالج میں پڑھاتا ہے لیکن گھر بیتوں کے سے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا ہے شبانہ اعظمی کی شادی ونود مہرہ سے ہوتی ہے جو واقعی ایک کھرا پکا بزنس مین ہے۔

اس طرح اصل کہانی اس مرحلے سے شروع ہوتی ہے جہاں دیگر بہت ساری ہندوستانی فلمیں ختم ہوتی ہیں ہیرو ہیروئن کی ملاقاتیں رومانس، ناچنے گانے، نوک جھونک اور ایک دوسرے کا پیچھا کرنے کے سین اس طرح خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ ویسے فلم میں جیتندر اور موسمی چٹرجی کے رومانس کے گرما گرم سین موجود رہیں لیکن یہ رومانس دو پریمیوں کا نہیں بلکہ پتی پتنی کا رومانس ہے جیتندر اپنی بیوی کو ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ بھولے قد والی اور معصوم صورت والی لڑکی بھی بھوکی شیرنی کی طرح اپنے پتی پر جھپٹ جھپٹ پڑتی ہے دونوں "پیالی" اسنان میں لپٹتے ہیں، جھگڑتے ہیں اور نو بیاہتا جوڑوں کی ساری ضرورتوں کی پرلطف تکمیل کرتے ہوئے ایک سکھی جیون گزارتے ہیں۔ پھر اچانک یہ جنت جیسی زندگی جہنم کیسے بن جاتی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اُدھر شبانہ اعظمی کا پتی ونود مہرہ محض اپنی ماں (کامنی کوشل) کی خوشی کی خاطر بیاہ رچاتا ہے۔ ورنہ اُس کی زندگی کسی بگڑے ہوئے رئیس زادے کی طرح پارٹیوں، شراب اور عورت سے عبارت ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر شراب میں بدمست پرشباب، سیکسی (sexy) ماحول میں گھرا رہتا ہے (فلم میں ونود مہرہ کو پدما کھنہ اور کومیلا ورک کے ساتھ ایسے ہی ماحول میں دکھایا گیا ہے) شادی بیاہ گھر گرہستی اور پتی پتنی وغیرہ ونود مہرہ کے لئے دقیانوسی اصطلاحیں ہیں۔ اسی لئے وہ سہاگ رات کو بھی اپنی بیاہتا بیوی کا چہرہ دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا اور ساری رات باہر ہی شراب و شباب میں مست رہتا ہے۔ شبانہ اپنے پتی کی یہ ساری حرکتیں دیکھتی ہے لیکن اُف تک نہیں کرتی وہ تو اپنے اصول کے مطابق صبر، استقلال اور تپسیا سے کام لیتی ہے بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر خود اپنی ساس کو دلاسا دیتی ہے اور صبر کی تلقین کرتی ہے۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ موسمی اپنے پتی کو ایک عمر لڑکی (تنوجہ) کے ساتھ دیکھ کر اس کی محبت پر شک کرنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی سورگ جیسی زندگی میں شک کا زہر گھل جاتا ہے ہر روز کی تکرار، لڑائی، جھگڑے، طعنوں تشنوں سے گزر کر نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ موسمی خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جیتندر مجنوں جیسا حلیہ بنا کے محمد رفیع کی آواز میں درد بھرا گانا گاتا ہوا جنگل پہاڑ کی طرف نکل جاتا ہے موسمی چونکہ ایک ہیروئن ہے اس لئے خودکشی میں ناکام رہتی ہے البتہ تنوجہ اچانک بدنامی سے گھبرا کے گلے میں پھندا ڈال لیتی ہے اور مرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف مدام کی بہو یعنی شبانہ کی تپسیا رنگ لاتی ہے اپنے بیٹے کے برے سلوک کے صدمے سے جب کامنی کوشش مرنے لگتی ہے تو اس کی اطلاع دینے کے لئے شبانہ اپنے پتی کو رنگ رلیوں کی محفل سے نکال لانے پہنچ جاتی ہے ۔ نشے کی حالت ہی میں ونود مہرہ کو جب اپنی ماں کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ اچانک شریف بن جاتا ہے اور اپنی پتی ورتا بیوی کی آغوش میں گر جاتا ہے اپنے گھر کو نرک سے سورگ میں تبدیل کر لینے کے بعد شبانہ کو اپنی سہیلی کا خیال آتا ہے اور وہ دونوں موسمی کے گھر جا دھمکتے ہیں اور ساری غلط فہمیوں کو دور کر کے اس کے جیون کو بھی سکھی بنا دیتے ہیں جو سورگ سے نرک بن گیا تھا ۔

سورگ نرک کے اس تقابلی جائزے میں آپ کو کہیں عظیم فنکار سنجیو کمار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ؟ ہرگز نہیں ۔ لیکن فلم میں نہ صرف سنجیو کمار موجود ہے بلکہ ایسی آن بان کے ساتھ ساری فلم پر چھایا ہوا ہے کہ اصل کہانی کے دونوں ہیرو پس منظر میں چلے گئے ہیں سنجیو کمار کے لئے ایک کردار کی تخلیق کی گئی ہے جس سے ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر سابقہ پڑتا رہتا ہے یہ ایک ایسا کردار ہے جو زندگی میں صرف ADJUSTMENT کا قائل ہے اور اپنے مفاد کے لئے ہر جائز اور ناجائز حربے کا انتہائی ذہانت اور متانت کے ساتھ استعمال کرتا ہے اس کردار کی موجودگی نے فلم میں کچھ کامیڈی پیدا کر کے اسے نہ صرف دلچسپ بنا دیا ہے بلکہ فلم کی کمرشیل ویلیو میں بھی اس سے زبردست اضافہ ہوا ہے پھر اس کردار کے لئے سنجیو کمار کے انتخاب کو اس کی حیرت انگیز اداکاری نے حق بجانب ثابت کر دیا ہے

دیکھا نہیں ، سنا ہے کہ " سورگ نرک " کی کہانی کو اس سے قبل تامل اور تلگو میں بھی فلمایا گیا ہے اور دونوں ہی زبانوں کی فلمیں باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی ہیں ان فلموں میں سنجیو کمار والا رول کہانی کار ڈی نارائن راؤ نے کامیابی کے ساتھ خود ہی ادا کیا ہے ہندی کا سورگ نرک میں ڈی نارائن راؤ نے اداکاری تو نہیں دکھائی البتہ اپنی ہدایت کاری اور اسکرین پلے سے ضرور متاثر کیا ہے راج بلدیو راج کے مکالمے برجستہ ، طنز آمیز اور فلم کی جان ہیں ۔ راجیش روشن نے موسیقی میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ۔ اداکاری میں سنجیو کمار کے فوری بعد موسمی چٹرجی کا نام لیا جا سکتا ہے جو اپنی میٹھی میٹھی شکل لئے رومانی جذباتی اور کھلنڈرے پن کی اداکاری میں بہت کامیاب ہے اور اس طرح سے وہ یقیناً اپنی فلمی زندگی کے کامیاب دور میں داخل ہونے والی ہے شبانہ اعظمی اپنے کردار کے مطابق بجھی بجھی سی لگتی ہے جسے کامیاب اداکاری کہیں یا صورت کا قصور ؟ جتیندر اور ونود مہرہ نے بھی اپنے اپنے کردار کے مطابق اچھی اداکاری کی ہے ۔ تنوجہ نے اپنے مختصر رول میں متاثر کن اداکاری کی ہے یہی بات کامنی کوشل کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے ۔ کامنی کوشل کے لئے مختصر رول والی بات سمجھ میں آ سکتی ہے ۔ لیکن تنوجہ جیسی باصلاحیت اداکارہ کا جو ابھی عین جوانی ہی میں مختصر رول ادا کرنا اس کی صلاحیت کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے ●۔

بقیہ :- اپیل

اور صنعتی اداروں سے نیز فراخدل شہریوں سے اپیل کروں گا کہ وہ فنڈ کے مقصد کی تکمیل کے لیے بڑے پیمانے پر مدد دیں اور فراخدلی سے عطیہ دیں ۔

اس فنڈ میں دی گئی رقوم دفعہ ۸۰ " جی " کے تحت آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گی ۔

عطیات سکریٹری ، خزانچی نیشنل چلڈرنز فنڈ شاستری بھون ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ کی طرف سے شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے ۔

وزیر اعظم
(مرارجی دیسائی)

نئی دہلی ۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء

اس دائرے میں سرخ نشان ◯ کا مطلب آپ کا زر سالانہ ختم ہو چکا ہے ۔ براہ کرم آئندہ سال کا زر سالانہ روانہ فرما کر تجدید خریداری فرمائیں ۔

مینیجر ، پونم ، حیدرآباد

بچوں کا بین الاقوامی سال

سال ۱۹۷۹ء " بچوں کا بین الاقوامی سال " کی حیثیت سے منایا جارہا ہے ۔ آندھرا پردیش میں اس سال کے دوران میں بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق جاریہ اسکیمات کی عمل آوری میں زیادہ شدت پیدا کی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ نئی اسکیمات بھی آغاز کی جائیں گی ۔

بچوں کی ترقیاتی خدمات سے متعلق مشترکہ اسکیم اضلاع عادل آباد اور اننت پور کے دو بلاکوں میں زیر عمل آوری ہے ۔ اس اسکیم کے تحت مشترکہ طور پر ایسی خدمات فراہم کی گئی ہیں جو غذا ۔ صحت ۔ تعلیم اور تفریحات سے متعلق سہولتوں پر مشتمل ہیں ۔

سال ۱۹۷۸-۷۹ء کے دوران میں اضلاع مغربی گوداوری ۔ ورنگل ۔ کرشنا اور کرنول کے چار مزید بلاکوں میں اس اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے ۔ بچوں کے بین الاقوامی سال میں اضلاع وساکھاپٹنم ۔ چتور اور میدک کے مزید تین بلاکوں میں اسکیم کی عمل آوری شروع کی جائے گی ۔

D.G., I & P.R 43

LETTER NO: 30/4 GOVT/C4/79 DT. 8-3-1979

Registered with the Registrar of Newspaper Registered No : 8286/64

6 Phone : 5295

POONAM URDU MONTHLY

Azampura Hyderabad-500 024 Editor : Nasir Kurnooli, M.A

ماہنامہ پونم کی خصوصی اشاعت

آندھراپردیش کے منتخب افسانے

جس میں

آندھراپردیش کے ممتاز افسانے نگاروں کی تصاویر

اور حالات زندگی کے ساتھ ان کی منتخب تخلیقات بھی شامل ہوں گی

رنگین ٹائٹل فوٹو آفسٹ تصاویر اور خوبصورت کتابت و طباعت سے آراستہ ضخیم نمبر

عنقریب شائع ہورہا ہے

JUNE 1979

اشاعت کا پندرھواں سال — جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت — علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد (۱۵)
شمارہ (۶)
جون ۱۹۷۹ء

خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہ نامہ "پونم"
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدر آباد 24

ایڈیٹر
ناصر کرنولی
ایم اے (عثمانیہ)

پونم

ترتیب

چیلنج کے مماثل ایک مسئلہ

آندھرا پردیش میں دیہی ترقیات کا مسئلہ ایک چیلنج کے مماثل ہے اس لیئے حالیہ زمانہ میں سرعت کے ساتھ شہروں کے فروغ کے پیش نظر ایک ایسے ادارہ کی ضرورت ناگزیر ہو گئی جو نہ صرف ہمارے شہروں کے پھیلاؤ میں باقاعدگی پیدا کرے بلکہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی شہری ترقی کے لئے منصوبہ سازی کا کام بھی انجام دے ۔

چنانچہ حیدرآباد، وشاکھاپٹنم اور وجئے واڑہ میں تین شہری ترقیاتی اداروں کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے یہ ادارے اس وقت ماسٹر پلانس اور زونل پلانس کی تیاری میں نیز شہری ترقیاتی پروگراموں کی عمل آوری میں مصروف و سرگرم ہیں ۔

شہری ترقیاتی منصوبے مستقبل میں ہمارے
شہروں کی توسیع و ترقی کے آئینہ دار ہیں ۔

ڈی۔ آئی۔ پی۔ آر/ ۵۲

LETTER NO 587/ ADVT/C 4/79 dt 24-5-79

احمد فراز

کی دو تازہ غزلیں

اتنا بے رنگ دکھ کو نہیں جانیے، ہر رگِ جاں شعاعِ بدن ہووے گی
لوگ پھر سے اچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہووے گی

تلملکے یوں ہی اختر شماری کرو، جوئے خوں اپنی رگ رگ سے جاری کرو
اور کچھ روز سینہ فگاری کرو، بزمِ خاموش بزمِ سخن ہووے گی

تم نے ہونٹوں پہ مہریں لگا دیں تو کیا، تم نے شمعیں نوا کی بجھا دیں تو کیا
جو حکایت سنی ان سنی ہو گئی، اب وہی انجمن انجمن ہووے گی

اب تلاشِ مسیحا عبث دوستو اب جو قاتل ہے بس جستجو اس کی ہو
ورنہ نامِ خدا نا سزا ہوئے گا اور خلقِ خدا بے کفن ہووے گی

رت کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصلِ دار و رسن ہووے گی

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی، سحر ہوئی چلا گیا

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اک دیا بجھا تو سینکڑوں دیے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دلنواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

اب اک ہجومِ عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

دلوں سے وہ گذر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اس ریاضِ دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا

شریکِ بزمِ دل بھی ہیں، چراغ بھی ہیں، پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا، وہ کہاں چلا گیا

اٹھو ستم زدو چلیں، یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آ گیا

یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو!
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

غزلیں

آوج یعقوبی

اسقدر رات گئے، کون گھر آیا ہوگا
مجھکو خود اپنا ہی سایا نظر آیا ہوگا

دلِ ویراں میں یہ خوشبو کی لپٹیں کیسی
ہو نہ ہو، کوئی یقیناً اِدھر آیا ہوگا

سننے کے بھی کہیں نقشِ قدم ہوتے ہیں
آنکھ ملتے ہی وہ دل میں اُتر آیا ہوگا

سلسلہ آپ کے غم سے نہیں چشمِ نم کا
یادِ ماضی کا کوئی زخم اُبھر آیا ہوگا

تیز ہے شمعِ تبسم کی جو لو آخرِ شب
کوششِ ضبط میں جی اور بھر آیا ہوگا

روشنی رینگتی ہے یادوں کے تہہ خانے میں
پھر کرن چہرہ کوئی بام پر آیا ہوگا

صبر کر روحِ تغزل کہ تری دنیا میں
اوجؔ جیسا نہ کوئی بے ہنر آیا ہوگا

کاوش بدری

(نذرِ شاذؔ تمکنت)

نہ اس کے بعد کوئی بحر و بر سے نکلے گا
غروبِ شمس میں ہوگا قمر سے نکلے گا

کسی کے عیب و ہنر کا کوئی سوال نہیں
ہر ایک کام رسوخ و اثر سے نکلے گا

جو اپنی ذات کے غارِ حرا میں گم سم ہے
جلوس اس کا تری رہگذر سے نکلے گا

نہ ختم ہوگا کبھی نالۂ رسا کا سفر
اذاں میں گونج اٹھے گا گجر سے نکلے گا

نہ ناگ ہوگا گلے میں نہ ہاتھ میں ترشول
وہ آدمی کی طرح میرے گھر سے نکلے گا

کسی فقیر کا دامن نہ تھام لے جب تک
صفر ہی مکتبِ علم و ہنر سے نکلے گا

تلاش کاوشِ بدری کی نیم شب میں کرو
جو شہر کے ہے یقیناً کھنڈر سے نکلے گا

مہدی پرتاب گڈھی

ساحل کو موج، موج کو طوفان بنائیے
یوں اپنی راہِ زیست کو آساں بنائیے

دل کا لہو سمو کے رگِ جاں بنائیے
کیوں ایک ایک نقطۂ پیکاں بنالیجے

موسم پہ انحصار نہیں دل کی فصل کا
ہر سانس کو پیامِ بہاراں بنائیے

اک زرد فصل پی تو گئی رونقِ حیات
گلشن کو اب نہ اجڑا بیاباں بنائیے

ٹوٹا ہے ہم کو جاگتی آنکھوں کے خواب نے
دل میں نہ آرزوؤں کو مہماں بنالیجے

یہ کیا کہ صرف پھول ہی زیبِ گلو بنے
کانٹوں کو بھی تو زینتِ داماں بنالیجے

مانندِ گل سبک ہو، معطر ہو، شوخ ہو
مہدیؔ غزل کو پیکرِ جاناں بنائیے

غزلیں

اقبال طاہر

دریدہ صبح تھی دیمک زدہ اُجالے تھے
مرے طواف میں پرچھائیوں کے ہالے تھے

کسی کے پھول نے کالر پکڑ لیا ورنہ
ہوس کے غار میں ہم بھی اُترنے والے تھے

کہاں سے آگئی لفظوں کی باڑھ پلکوں تک
کہ ہم نے خواب تو ردّی میں بیچ ڈالے تھے

نہ آگ تھی نہ دھواں، شعلہ تھا نہ چنگاری
مگر گھروں کی اُداسی کے ہاتھ کالے تھے

فضول ننگے درختوں کو کوستی ہے ہوا
زمین کھا گئی وہ پھل جو پکنے والے تھے

اُنھیں سے خون کا رشتہ نکل گیا طاہرؔ
علیک سُلیم پہ جس سے جو بھولے بھالے تھے

وحیدالدین خاں متینؔ فتح پوری

غم کی ظلمات میں یوں آنکھ سے آنسو نکلے
جیسے پھولوں سے شبِ تار میں خوشبو نکلے

سیر کو جاؤں چمن میں تو ترے جلوے ہوں
باغ کے ہر گُل و لالہ سے تیری بُو نکلے

برق شرمائے گھٹائیں بھی ہوں پانی پانی
رُخ پہ زلفوں کو جو لہراتا ہوا تُو نکلے

میری رگ رگ میں ہے پوشیدہ محبت تیری
دل پہ جب چوٹ لگے آنکھ سے آنسو نکلے

پھول لائے کے ہوں یا دامنِ شب کے تارے
میری ہی طرح ترے کشتہ ابرو نکلے

اے متینؔ اُن کو نہ جینے کا سلیقہ آئے
جن کی محفل سے شب و روز وہ خوشخو نکلے

فاروق شفقؔ

ہر بات جو شدت سے اتنی سوچو گے
تم اپنے جسم سے کپڑے اُتار پھینکو گے

لگا کے پلکوں سے کچھ دیر مجھ کو چومو گے
پھر اسکے بعد بھری جھیل میں ڈبو دو گے

گذرنے والے بتاؤ کدھر سے گذریں گے
اگر تمام زمینوں میں فصل بُو دو گے

تمھیں نہاؤ گے تنہا سنہری بارش میں
کہ اس طرف بھی بھٹکے بادلوں کو بھیجو گے

نظر نہ آئے گا کوئی سنہرا پھل اُس میں
شجر سے روز ہرے پھل جو یونہی توڑ دو گے

جھلکتے روشنی کے زخم ہاتھ آئیں گے
اندھیرے گھر میں بدن اپنا جب ٹٹولو گے

کبھی چراغ نہ تنہائی کا جلانا تم!
بڑے عجیب سے سائے اُبھرتے دیکھو گے

پھلے گا اُس میں وہی پھل جو پھلتا آیا ہے
درخت دھوپ کا پانی سے کتنا سینچو گے

ملا کے ہاتھ بھری دوپہر گئی ہے شفقؔ
ہوائے شام سے میرا مزاج پوچھو گے

شیکسپیئر، ترجمہ، خالد خلیل

دکھ اور خوشیاں

How heavy do I journey on the way
When what I seek, my weary travel's end
Doth teach that, ease and that repose to say,
"Thus far the miles are measured from thy friend!
The beast that bears me, tired with my woe,
Plods dully on, to bear that weight in me,
As if by some instinct the wretched did know,
His rider lov'd not speed, being made from thee:
The bloody spur cannot provoke him on,
that sometimes anger thrusts into his hide,
Which heavily he answers with a groan.
More sharp to me than spurring to his side;
For that same groan doth put this in my mind;
My grief lies onward, and my joy behind;

SHAKESPEARE

میری مسافت کتنی بوجھل ہو جاتی ہے
جب میرے واماندہ سفر میں دور کہیں
آسودگیٔ منزل کہتی ہے
تم اپنے ساتھی سے لتنے کوسوں دور چلے آئے ہو
مرکب میرے دکھ کے بوجھ سے چور
میرے محسوسات کا بھاری بوجھ اٹھائے رینگ رہا ہے
یوں جیسے اس کی نادان جبلت جان گئی ہو
کہ اس کے راکب کو تیز روی اب پسند نہیں ہے
چابک بھی اب کو اس کی انگیخت نہیں دے سکتا
چابک۔ جیسے مری جھنجھلاہٹ گاہے گاہے اس کی پیٹھ پہ برساتی ہے
جس پہ وہ محض کراہ دیتا ہے
چابک۔ جو اس کے پہلو سے زیادہ میرے لئے کاری ہے
اسے کراہتا دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے
میرا دکھ میرے آگے ہے
خوشیاں پیچھے چھوڑ آیا ہوں

ع مجور

کرائے کے مکان کے نام

یہی کچھ ہوتا آیا ہے
اُمڈ آتے ہیں جب بادل
تو گھر کے رِستے گوشوں، اور
ٹپکتی چھت کی ٹپ ٹپ سے
نکل پڑتے ہیں اندیشے
نہ ہر اک چھت سروں کو ڈھانکنے کے کام آتی ہے
نہ ہر دیوار علامت ہے
بچاؤ اور تحفظ کی
یہ اکثر ہوتا آیا ہے

اُمڈ آتے ہیں جب بادل
چھتیں گرتی ہیں
دیواریں زمیں پر ڈھیر ہوتی ہیں
مگر ملبوں میں
اِن ملبوں کے مالک خود نہیں ہوتے

نصر قریشی

محکوم

میں نور و ظلمت کی وادیوں میں
تلاش کرتا ہوں اُس خدا کو
جو وقت کا حکمراں بنا ہے
اطاعتوں کو قبول کرتا
سند خلافت کی بخشتا ہے
سوال، جن کی چبھن زباں پہ
سوال، جن سے ہے ذہن محبس
جو صدیوں، قرنوں سے تشنہ لب ہیں
سروں پہ ہابیل، دل میں شیطاں
فساد کی جڑ ہے کون آخر؟
زمیں کو بنجر بنایا کس نے؟
اجارہ داری کا راج کیوں ہے؟
خدا کی بستی اجاڑ کیوں ہے؟
میں اُس خدا سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں لوگو!
خدائے برتر، خدائے دوراں
ہر ایک شئے پہ ہے تجھ کو قدرت
زوال سورج کا روک دے اب
دلوں کا شیطاں، سروں کا فتنہ
اندھیری قبروں میں دفن کر دے!
اگر نفی میں جواب ہو تو میں اُس سے کہہ دوں
کہ ایک محکوم دوسرے کو
رہائی کیسے دلا سکے گا

آمنہ ابوالحسن

تحریر

...تاب دل کے ورق جو کھولے
...تو دیکھا
...یک بہت پرانے پچھلے صفحے پر
...لکھا ہوا ہے
...من ، دوستی ، محبت .....
...مراگلے صفحات کورے پڑے ہیں
...ان پر بھی تو کچھ لکھا جائے
...لیکن
ڈھونڈے سے بھی لفظ نہ ملے
تھک کر سوچا
یوں نہ پچھلا صفحہ بھی کورا کر دوں
تبھی کہیں سے آواز یہ آئی
لکھے ہوئے کو مت مٹاؤ
جو ہو سکے تو نئے صفحوں پر بھی
پرانے لفظ ہی تحریر کر دو ——!!

یوسف جمال

اپنی ذات کا نوحہ

میری حالت
(دکھوں کی شب میں)
کچھ ایسی ہے
جیسے اک دمدار ستارہ
ٹوٹ کے کھو جاتا ہے خلا میں
جیسے سمندر سو جاتا ہے
اور
کنارے جاگتے رہتے ہیں
صدیوں تک !!

خواب کی قیمت

ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا
پھر بکھر کر میرے جسم میں گھس گئیں کرچیاں
خواب میں کانچ کا گھر بنانے کی قیمت چکانی پڑی !!

(افسانہ)

بزدل

ایس، ایم، حیات

ہسپتال کا صدر دروازہ ابھی بند تھا مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں تاخیر کی وجہ سے ایک بے چینی کی لہر سی دوڑ چلی تھی لیکن وہ عجلت میں نہ تھا تپتے ہوئے فرش پر ننگے پاؤں وہ بے تعلقی کے عالم میں کھڑا تھا۔ ٹھیک چار بجے چوکیدار اسپتال کا دروازہ کھولے گا۔ جذبات سے عاری جھلسا ہوا چوکیدار کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگا۔ منحوس کہیں کا! ان چھ دنوں میں اُس کے منہ جلے چہرے پر بھی نرمی یا مسکراہٹ نظر نہ آئی۔ عجیب انسان ہے! بالآخر گھنٹہ گھر نے چار گھنٹے بجائے سب نے اطمینان کی سانس لی۔

چرچراہٹ کے ساتھ داخلی دروازہ کھلنے لگا منتظر لوگوں کا بے چین اور مشتاق ریلا اندر کی طرف بڑھا۔ کچھ ہی وقفے کے بعد داخلی دروازے کے قریب ایک آدھ مرد یا عورت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ چوکیدار وہیں گیٹ سے لگا کھڑا تھا۔ ان چھ دنوں میں اُس نے ہسپتال کے اندر کی دنیا کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ درد سے تڑپتے اور تلملاتے ہوئے جسم۔ مختلف امراض میں مبتلا مریض۔ اس سے پہلے اُس نے اسپتال کی زندگی کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا۔

مطالعہ ترک کئے مدت گزر چکی ہے زندگی نے اسے حصولِ معاش کے لئے بہی کھاتوں کے انبار تلے بُری طرح دبا رکھا ہے۔ وہ ایک گودام کا اکاؤنٹنٹ ہے۔ لیکن اسپتال کے صدر دروازہ پر کھڑے غور و فکر کرنے کے قابل ہے ہی کیا۔ اُس کے اسپتال آنے کا مقصد صرف اپنی بیوی کی مزاج پرسی کرنا ہے۔ معاملہ کو سنجیدہ شکل دے کر خود کو فکر و تردد میں اُلجھا دینا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تنہائی کے احساس کی بدولت وہ بے چینی کے عالم میں پلنگ پر کروٹیں بدلتی ہوئی اپنے شوہر کی آمد کی مشتاق ہو۔ اُس آہنی پلنگ پر جس نے دردِ زہ میں مبتلا کئی عورتوں کو دیکھا ہے موت کے چنگل میں پھنسی کئی عورتوں کو عالمِ نزع میں دیکھا ہے اور ان کا بھیانک انجام بھی اب تک ملاقاتی پلنگوں کے پاس جمع ہوگئے ہوں گے۔ اپنے پلنگ کے پاس اپنے شوہر کو نہ دیکھ کر بے اتفاقی کا احساس اسے کچوکے لگا رہا ہوگا۔ بے چاری کمزور رنجیدہ خاطر ہوگئی ہوگی۔ اس عالم میں اس کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے اور ایک گھنٹہ کے بعد اُس سے رخصت ہونا تو اور بھی مشکل ہے رخصت ہوتے وقت اُسے یقین دلانا ہوگا کہ وہ آئندہ ٹھیک وقت پر حاضر رہے گا دیر نہ ہوگی چند ہی دنوں میں اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔

آخر یہ تردد اور پس و پیش کیوں؟ عرفِ عام میں نادانی اور بیوقوفی پر دلالت کرے گا لیکن دوسرا طریقِ عمل کیا ہوسکتا ہے؟ درحقیقت وہ ایک عورت سے احتراز کرتا تھا اس عورت سے جو ساری رات اُس کی بیوی کی تیمارداری کرتی رہتی ہے۔ ڈیوٹی کی طرح نہیں محبت کے زیر اثر۔ اُس کی بیوی جو ذرا سی آواز پر بھی گھبرا کر چونک اُٹھتی تھی اور خاموشی سے اور بھی زیادہ خائف ہوجاتی تھی اُس کے لئے یہ عورت باعثِ راحت تھی اور وہ ـــ اُس کا شوہر۔ اس محسن اور عظیم نفس سے احتراز کرنے پر مجبور و لاچار۔ اب وہ اُس عورت سے کیسے آنکھیں ملا سکتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی بیوی اس عورت سے پورے طور پر واقف نہیں ہے۔ بھولی ہوئی خوشیوں کی یاد اور ہمیشہ کے لئے ترک کی ہوئی دنیا کا تصور تک اُس کے لئے اذیت ناک تھا اور ڈاکٹر کا مشورہ بھی تھا ـــ "یاد رکھیئے جناب! یہ دل کی بیماری ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ آپ کو ہمیشہ احتیاط برتنا لازمی ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے دل کی بیماری صرف میری بیوی ہی کو

ہے یہ بھی غنیمت ہے۔ اُس کی بیوی نے اُسے آج اُس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے اور میرے دل کو جو روگ لگا تھا وہ ــ خیر ــ ماضی کی راکھ تلے دبی یادوں کی چنگاری کو ہوا دینے سے کیا حاصل؟ لیکن ــ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ماضی کے ثبوت اس اسپتال کی کمین گاہوں میں چھپے اس کی گھات میں ہوں گے ــ ماضی کے ثبوت ــ یہ ثبوت کبھی مسرتوں اور خوشیوں کے پیامی بھی تھے۔

اسپتال کی عام گزرگاہ میں سے داخلہ کی چٹ ہاتھ میں لئے گزرتے وقت اُس نے اپنی بیوی کی ٹھوڑی میں جذبات کے شدید فوری تغیر کے نشانات دیکھے تھے تکلیف دہ امراض میں مبتلا کئی مریض فرش پر دراز تھے کراہتے اور آہیں بھرتے گندہ امراض کے مریض! اُن مریضوں کے جسم پر بندھی کتان کی بھیگی پٹی سے نکلتی ہوئی بدبو سے ناک پھٹنے لگی تھی۔ بعض بیمار آش پینے میں مشغول تھے۔ کچھ موٹے چاول کا کھانا کھا رہے تھے۔ وارڈ کے ایک کونے میں ایک بوڑھی عورت کے ہاتھ کی رگوں کے ذریعہ نقلِ خون کا عمل جاری تھا ایک نرس اس مریضہ کے پاس کھڑی تھی اُس کے کام سے فراغت پانے تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ پھر داخلہ کی چٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــ "ذرا یہ چٹ دیکھنا۔"

وہ پست قد رمکی جو شاید ابھی تک تربیت یافتہ نرس ہی تھی اپنی نظریں اُوپر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی پروا نہ کی۔ صرف ڈیوٹی پر متعین دوسری نرس کی طرف اشارہ کر دیا اور چلتی بنی۔

بیوی کو اپنے ساتھ لئے اب وہ اُس نرس کی طرف آگے بڑھا۔ لیکن اُس نرس کے جواب سے اُسے بے حد مایوسی ہوئی۔

"معاف کرنا! کوئی پلنگ خالی نہیں ہے۔"

فی الحقیقت یہ شومئ قسمت تھی اس عالم میں کھڑے اُس نے دیکھا۔ ایک نرس انھیں کی طرف آ رہی ہے۔ اسے پہچان کر اسے خوشی ہوئی کہ وہ نرس کوئی اجنبی نہ تھی۔ وہ لکشمی کٹی تھی جو کبھی اُس کی طالبہ تھی۔ دل ہی دل میں وہ سوچنے لگا کہ وہ خوش قسمت ہے لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس لڑکی نے اُس پر کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ لڑکی کے اس رویہ پر وہ پریشان ہو چلا۔ پھر بھی ضرورت کا تقاضا تھا۔ اُس نے لڑکی سے کہا۔

معاف کیجئے! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تمہارا نام مس لکشمی کٹی ہے!

ہاں، میں وہی ہوں۔ اور آپ؟

وہ لڑکی اُس کی ہیئت اور صورت شکل کے نقوش کو چند لمحوں کے لئے غور سے دیکھتی رہی پھر ــ بے ساختگی کے عالم میں بول اٹھی۔ "اوہو! آپ ــ معاف کیجئے میں آپ کو پہچان نہ سکی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

کوئی بات نہیں ــ لیکن لکشمی! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے میں چاہتا ہوں کہ یہاں اِن کا داخلہ ہو جائے۔"

"یہ کون ہے سر؟"

"یہ میری بیوی ہے"

اس کی بیوی کو دیکھ کر لکشمی دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

یہ ہے لکشمی ــ میری طالبہ! تعارفی انداز میں اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

کس وقت کی طالبہ ــ ہاں ــ اس وقت اور آج کے درمیان پورے آٹھ سال کی خلیج حائل تھی۔

اُس کی بیوی کو داخلہ مل گیا۔

لکشمی کٹی نے اُسے پہچاننے میں دیری کی۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہ بہت کچھ بدل گیا ہے اب وہ آٹھ سال پہلے کا نوجوان نہ تھا جو لکشمی کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا تھا درمیانی ماہ و سال کے اثرات اس کی عمر میں کئی سالوں کا اضافہ کر کے اُس کے چہرے کے نقوش پر اپنا اثر چھوڑ گئے تھے۔ آئینے نے بھی اس تبدیلی کی طرف واضح اشارہ کیا تھا۔

اب میں اجازت چاہوں گی۔" لکشمی نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک بات اور لکشمی! میں چند دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں اور میری بیوی یہیں رہے گی۔ کیا تم اس پر ایک نظر رکھ سکو گی۔

کیوں نہیں سر! ضرور رکھوں گی۔" اُس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

آج لکشمی اس سے رخصت طلب کرنے میں جلدی کر رہی ہے لیکن یہی لکشمی کبھی اُس کے ساتھ

وقت کی رفتار سے بے نیاز دیر تک رہا کرتی تھی۔ کتابیں مانگنے کے بہانے وہ اُس کے پاس اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ اب دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہیں رہا۔ لکشمی نے اُس کی کسی ایک کتاب کے پہلے صفحہ پر قلم برداشتہ لکھ کر اپنے دستخط بھی کر دیئے تھے۔ اشعار کے مجموعہ کی ایک کتاب لوٹاتے وقت لکشمی نے سرورق پر لکھ دیا تھا "وِتھ لو" (WITH LOVE) ایک دوسری کتاب میں دو اشعار کے نیچے اُس نے خط کھینچ رکھے تھے جن کا مفہوم تھا۔ "تم ایک ایسی منزل ہو جہاں تک میری رسائی ناممکن ہے۔ میرے دل کے مالک تمھیں کیا خبر! تمھیں پالینے کی جستجو میں، میں کس طرح تڑپ رہی ہوں!"

شاگرد استاد میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار اور اُسے اپنی طرف مائل کرنے کی بے سود کوششیں، یہ سب کچھ ایک عجیب اور طرفہ تماشا تھا۔ وہی لڑکی آج سادگی کے تکلیف دہ حد تک ضابطہ پر کاربند نظر آتی ہے ـــ اُس لڑکی کے جو نقوش اس کے ذہن پر ثبت تھے انھیں وہ حافظہ کے دائرے میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ پُرانی طرز کے کان کے بالے سادہ سا چہرہ ـــ بے ڈھنگا لباس۔ سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا لیکن اب اُس کی شخصیت میں جیسے لہلہاتے باغ کی خوشبو رچ گئی تھی اب اس میں نفاست و لطافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اب وہ دُبلی پتلی لڑکی نہ تھی گداز جسم کی عورت تھی۔ جب ہی اندلی نے اُسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملاقاتیوں کا وقت ختم ہو چکا تھا وہ باہر نکل آیا۔

دوسرے دن

اپنی بیوی کے پاس بیٹھ کر وہ باتیں کر رہا تھا پھر بھی وہ دہشت زدہ تھی۔ پریشان تھی اور اُس کے دل میں شک و شبہات جڑ پکڑنے لگے تھے۔

"لیکن تم یہاں اکیلی نہیں ہو۔ یہاں ڈاکٹر ہیں، نرسس ہیں۔ عملے کے دوسرے افراد ہیں۔"

"لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ بوڑھی آج رات کو مر جائے گی!" پاس ہی اب بچھے پلنگ پر لیٹی ایک بوڑھی عورت کی طرف وہ خائف سی دیکھنے لگی۔

وہ اپنی بیوی کے دل سے خوف دُور کرنے لگا۔

"نہیں نہیں! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم خواہ مخواہ "شکی" بنتی جا رہی ہو۔ لکشمی یہاں موجود ہے۔ وہ تمھاری ہر ضرورت کو پوری کرتی رہے گی!"

بیوی کو سمجھاتے ہوئے وہ محسوس کرنے لگا کہ اُس نے کچھ اور کہا تو وہ رو پڑے گی یا بیہوش ہو جائے گی۔

دوسرے دن جب وہ بیوی کو دیکھنے کے لئے اسپتال گیا تو تبدیلی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ پلنگ کے پاس ایک اسکرین کھڑا کر دیا گیا تھا جس سے علیحدگی اور پردہ داری کا اہتمام ہو گیا تھا۔ اُس کا چہرہ بھی ہشاش بشاش نظر آنے لگا تھا۔ پاس ہی ایک چھوٹی میز پر برتن میں انگور کے خوشے اور بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ تھرماس میں لیمو کا رس بھرا ہوا تھا۔ چند رسائل بھی رکھے ہوئے تھے جن میں خوبصورت تصویریں تھیں۔

اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ پُر مسرت آواز میں اُس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے!"

"رات آرام سے ہی بسر ہوئی ہوگی؟"

ہاں، لیکن وہ بوڑھی عورت مر گئی! اس کے بعد ہی اس لڑکی نے یہاں یہ اسکرین لا کھڑا کیا۔

اُس لڑکی سے تمھارا مطلب لکشمی ہی ہے نا؟"

نہیں! نہیں وہ کوئی دوسری لڑکی ہے۔ پال گھاٹ کی کوئی تمل بولنے والی لڑکی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ہمیں وہ جانتی ہے۔ لکشمی سے ہمارے متعلق پتہ لگا کر وہ یہاں آئی تھی۔ بہت پیاری!

ساری رات وہ میرے ساتھ رہی!

تمل بولنے والی پال گھاٹ کی لڑکی؟

ماضی کے نقوش اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھر آئے۔ وہ ساری یادیں۔ سہ پہر کی یادیں، ٹھنڈی صبح کی یادیں، پارک گلی میں واقع ایک قدیم مکان، قلعہ کے وسیع میدان میں بچھی پتھر کی بینچ، گلی والی کے گچھے اور کئی دوسری چیزیں۔

"کیا نام ہے اُس کا؟" اُس نے بیوی سے پوچھا۔

اُس نے بتایا نہیں! اور ہاں جب وہ ملیالم بولتی ہے تو بے ساختہ ہنسی چھوٹ پڑتی ہے

اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی یہاں ہوگی! لکشمی کماری نے اس کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ خیالات کے تانے بانے میں وہ پھر الجھ گیا۔

اُس لڑکی کی پرخلوص خدمات پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اُس کی بیوی نے کہا۔

"اُس لڑکی کے خلوص کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے!"

"لکشمی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"تمہاری وہ طالبہ؟ ہر طرف اکڑتی پھرتی رہتی ہے۔ یہاں آتی ہے تو کچھ نخرے کے ساتھ! شاید مصروفیات زیادہ ہوں!"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ لڑکی بھی تو نرس ہی ہے اس کے فرائض منصبی بھی رہا ہیں۔ ان دونوں میں مجھے کافی فرق نظر آیا۔ آج پانچ بجے وہ یہاں آئے گی۔"

یہ سنتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کے آنے سے بہت پہلے ہی یہاں سے چلا جائے گا اور اس نے یہی کیا۔ صدر دروازہ کو پار کر کے اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اپنا بیوی کا ممنون تھا کہ اُس نے بروقت اسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر۔ اس لڑکی پر اُسے ترس آنے لگا۔ وہ اُسے وہاں موجود نہ پاکر مایوس اور افسردہ ہو جائے گی اور وہ بزدل بنا صدر دروازے کے باہر آسودہ خاطر کھڑا ہے۔ اُس میں سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے وہ بزدل ہے۔ اُس کی بزدلی ناقابلِ معافی ہے

حالات سے معمور ماضی کے باوجود وہ آسودہ خاطر زندگی بسر کر رہا تھا اُس کی بیوی ان حادثات سے قطعی ناآشنا تھی وہ ابھی تاریکی میں حقائق کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہی تھی بالآخر اپنے شوہر کے متعلق وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ پرانے خیالات کا آدمی ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کی زندگی میں ایک ایسا بھی دور گذرا ہے جبکہ اسی اسپتال کے عملے میں شامل لڑکی کی ایک جھلک سے اُس کے دل میں جذبات کی لہریں جوش مارنے لگتی تھیں اور وہ تڑپنے لگتا تھا۔ اُسی نرس کی سے آج وہ نظریں چرا رہا ہے کس مقصد کے تحت۔ اس حادثہ کو رونما ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے۔ ہاں ایک طویل عرصہ! گلیوں کے موڑوں پر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہاڑوں کی روش پہ تند و تیز ہواؤں میں۔ موسلا دھار بارش میں کھڑا مشتاق نگاہوں سے تکا کرتا تھا۔ اُسی لڑکی سے آج وہ نظریں چرا رہا ہے کئی سالوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اب لیہ محسوس ہونے لگا کہ وہ بزدل ہے کیا وہ ہمیشہ کے لئے بزدل رہے گا؟ نہیں — نہیں وہ بزدل نہیں۔ اظہارِ محبت میں اُس نے جرأتِ رندانہ کے ساتھ پہل کی تھی ہر معاملہ میں وہ پیش پیش رہا۔ اُس لڑکی کو روکا اُس سے بات کی، اُس سے بے تکلفی اور بیباکی کے ساتھ ملتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے رازداں بھی بن گئے۔ وہ ایک محبت کرنے والا باہمت نوجوان تھا۔ بزدل نہیں۔ زندگی کو ایک موڑ دے کر اس لڑکی سے قطع تعلق کر لینا بزدلی نہیں۔ یقین جانو یہ میری بہت ہمتی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے زندگی کے اس موڑ پر میں تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔" اُس کے خط کی تحریر واضح تھی —

"تمہیں میری حالت کا پورا پورا اندازہ ہے اب مجھے اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر خود بنانی ہے!"

ٹھنڈے دل کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ اُن کی آنکھیں جیسے خشک ہو چکی تھیں۔ "ہم پھر ملیں گے۔ صرف ایک بار مسکرا دو۔"

اُسی رات وہ اُس شہر کو خیرباد کہہ کر دوسرے شہر کی جانب رواں ہوا۔ جدائی کی اُن گھڑیوں میں اُس کی آنکھوں سے کوئی آنسو نہ ٹپکا تھا۔ کئی اَن گنت خواب قدموں تلے روند دیئے گئے تھے۔ یہ سب اس لئے ہوا تھا کہ اُسے اپنے ہاتھوں اپنی قسمت بنانی تھی۔

دولت! قسمت!! ان الفاظ سے وہ آج خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ خائف ہو جاتا ہے

اسپتال کا صدر دروازہ کھلا اور یہ چوروں کی طرح ڈرتے، جھجکتے اندر داخل ہوا۔

نوٹس بورڈ پر ایک نظر ڈالی۔ ڈینجر کیس کی فہرست تھی۔ برآمدہ کو پار کرتے وقت اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک طویل مسافت طے کر رہا ہے نچلی منزل کے زینے کے قریب جو مردانی وارڈ ہے اُسے پار کرتے وقت وہ فکرمند سا ہو جاتا ہے۔ وہاں ہمت اور نڈر جوان ارغوانی رنگ کی چادروں کے نیچے پڑے مہلک بیماریوں میں جکڑے کراہ رہے ہیں۔ اُن مریضوں کو تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا جاتا تھا لیکن اُسے اُن کی تحقیر پسند نہیں۔ یہ اُن کی قدر کرنا چاہتا ہے۔ وہ مریض بزدل نہیں ہیں وہ اپنی جوانی کو لٹا چکے ہیں ـــ اور یہ!

اب وہ زینے پار کر رہا تھا۔ پھر وہ بالائی منزل کی گزرگاہ پار کرنے لگا۔ جگہ کی کمی کے باعث اُس راستے میں کئی معذور لوگ پڑے تھے وہ سنبھل کر احتیاط سے چلنے لگا تاکہ راستے میں پڑے کسی اپاہج پر اُس کے پیر نہ پڑ جائیں پھر وہ پاس کی کھڑکی کے شیشوں سے نیچے جھانکنے لگا بہت سے کمسن بچے ریت میں کھیل رہے تھے۔ اُس کے ذہن میں ایک ویران قصباتی گھر کا نقشہ گھومنے لگا۔ سامنے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر پر جیسے جمود طاری ہو چکا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ایک زرد چہرہ ملامت آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا

"خوب! ٹھیک وقت پہ آگئے ہو ـــ سہہ نا۔"

اپنی صفائی میں اُس نے کچھ نہ کہا۔ کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ "ڈاکٹر نے کچھ کہا؟"

"وہ تمہیں پوچھ رہا تھا۔"

شاید تمہیں اسپتال سے چھٹی دے دی جائے گی۔ میں ابھی اُس سے مل کر آتا ہوں!"

اُس میں بیوی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ تاخیر سے پہنچنے پر اُس کی بیوی اُسے ملامت کرتی رہی اور وہ تمام تر انہماک کے ساتھ مریضہ کی رپورٹ دیکھنے کا بہانہ کئے کیس شیٹ پر جھکا رہا۔ اُس کے کانوں میں بیوی کی آواز سنائی دی۔ "بے چاری! کتنی دیر وہ یہیں کھڑی رہی! میری وجہ سے ان پانچ دنوں میں اُس نے ساری ساری راتیں آنکھوں میں کاٹ دیں۔ اُس کا بے پناہ خلوص اور بے لوث خدمت۔ انھیں میں بھلا نہیں سکتی اور وہ تمہاری شاگرد تھی۔ اور تم نے ایک بار مڑ کر بھی نہ دیکھا اُس سے ـــ"

جبھی اُس کے کانوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نسوانی قدموں کی ہلکی سی چاپ!

ڈاکٹر سے ملنے کے بہانے جلدی سے وہ سامنے کے دروازے سے باہر چلا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! میری بیوی ـــ!"

"ہاں ـــ دیکھئے جناب! مناسب یہی ہے کہ قلب کے امراض کے ماہر کسی معالج سے رجوع کیا جائے۔ میرے خیال میں سرجری ہی بہتر علاج ثابت ہو سکتا ہے۔ نتیجہ کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ انہیں یا تو ویلور جانا پڑے گا یا ٹراونڈرم ـــ یہاں اتنی سہولتیں نہیں ہیں۔ مانیٹرنگ، ایکسرے، کارڈیوگراف ـــ

انھیں یہاں سے چھٹی کب ملے گی ڈاکٹر صاحب؟

کل ـــ بہتر یہی ہے کہ انھیں امریکی ہسپتال ویلور لے جایا جائے۔

وہ واپس آگیا

دوسرے دن ـــ ہسپتال کے صدر دروازے پر کھڑے دربان نے اُسے روکا۔

"یہ ملاقاتیوں کے داخلے کا وقت نہیں ہے"

"ٹھیک ہے، لیکن آج میری بیوی کو چھٹی کا پروانہ ملنے والا ہے۔"

اُس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ جبکہ چونی کا ایک گول چمکتا سکہ خاطر خواہ اور خوشگوار نتائج پیدا کر سکتا ہے تو اس غریب سے خواہ مخواہ بحث کرنا بے معنی بات ہے۔ اُدھر ہتھیلی پر سکہ جما اور اِدھر دربان نے دوسرے [illegible] مہربانی اور لطف و کرم کے ساتھ اُسے ہاتھ کے اشارے سے اندر دھکیل دیا۔

بیوی کو ساتھ لے صدر دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اُس کے ہاتھ میں سامان کا ایک بیگ تھا۔ اُس کی بیوی فکرمند تھی۔

"اپنے ڈسچارج ہونے کے بارے میں اُس
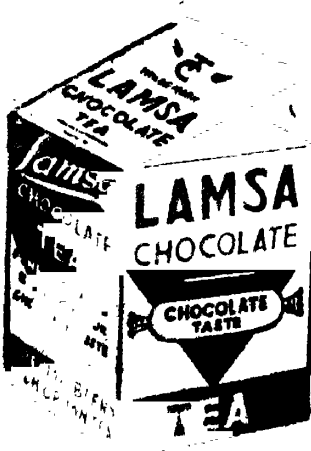
لڑکی سے ..... نہیں کہا۔ تمھیں معلوم نہیں وہ لڑکی کتنا مشتاق تھی کہ ہم ہسپتال چھوڑنے سے پہلے اس سے مل کر جائیں۔ اگر تمھیں کوئی اعتراض نہیں تو ہم اندر جاکر اسے اب بھی دیکھ آسکتے ہیں غالباً اس وقت وہ وارڈ نمبر بارہ میں ہوگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ اب وقت نہیں ہے کسی فرصت کے وقت مل لیں گے!"

"مجھے اس کا نام تک نہیں معلوم۔ غالباً تم جانتے ہو!"

میں۔ ہاں۔ میں اس لڑکی کا نام جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمھیں بھی معلوم ہوگیا ہو۔ سوتے میں میرے لبوں کو اس لڑکی کا نام دہراتے ہوئے بےخبری میں آپ لینے کی غرض سے تم ہمیشہ چونک جو رہتی تھیں لیکن وہ یہ بات ایسی آواز میں نہ کہہ سکا کہ اس کی بیوی سُن سکے۔

وہ بزدل جو تھا۔ ۔۔

(ایم۔ ٹی واسودیون نائر کی ملیالم کہانی سے)

بشیر انور

(افسانہ)

ادھوری کہانی

میں افسانے لکھنا چاہتا ہوں۔ محبت کے، پیار کے، جواں دلوں کی چاہتوں کے۔ ایسے افسانے جن میں زندگی ہو، زندگی کی حرارت ہو، لذتیں ہوں اور تازہ ہوا کے جھونکے ہوں خوشحالی، مسرت، نغمگی، امن اور ترقی میری کہانیوں کے عنوان بنیں۔ سینکڑوں کہانیاں اور بیسیوں پلاٹ میرے آس پاس آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ میں لکھنا چاہتا ہوں کسی کافی ہاوز کی ملگجی روشنی اور نغمہ ریز ماحول کے کسی گوشے میں جنم لینے والے رومانس کی کہانی — لہلہاتے کھیتوں، سرسراتی ہواؤں، گنگناتے جھرنوں اور رنگین فضاؤں میں کھوئے ہوئے محبت سے سرشار دلوں کی داستاں — سجے سجائے ڈرائنگ روم میں فلسفہ، ادب، شاعری، سیاست وغیرہ پر بحث کرنے والے باشعور ذہنوں کی باتیں، کالج کے رومان پرور ماحول میں خوش آئند اور درخشاں مستقبل کی تمنا سے مسرور اور چاہتوں سے معمور نوخیز افسانے — تمباکو اور الکحل کی بدبو میں بسی ہوئی گمبھیر اور گھٹی گھٹی فضا میں ناکامی حرمان نصیبی اور ذات کے کرب کا بیان!

یہ کہانیاں رضیہ، رادھا، پیٹر، اشفاق، اشوک، ششی، انڈریوز — کسی سے بھی متعلق ہو سکتی ہیں۔ میرا قلم چلنے لگتا ہے والز کی دھن پر لکشمی، اشوک کے چوڑے چکلے سینے سے چپکی، چکنے فلور پر پھسلتی چلی جاتی ہے کہ اچانک۔ . . اچانک لکشمی کے بدن کی صندلیں مہک میری ناک سے ٹکراتی ہے۔ جب بادلوں کے زمین کو چومنے کی بات لکھتا ہوں تو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا جھونکا سا گزر جاتا ہے۔ جب لپٹے جسموں اور تھرکتے قدموں کی بات ہوتی ہے تو افق سے افق تک دھنک سی چھا جاتی ہے اور میں خلاؤں میں تیرنے لگتا ہوں۔

پھر اچانک سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ جھوٹ ہو۔ جو میں لکھ رہا ہوں وہ نہیں ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے . . . ؟ اس میں نہ تو پیار ہے، نہ ہی زندگی، نہ لذتیں ہیں اور نہ نغمگی — رادھا، اشوک، پیٹر، اشفاق سبھی پیار، محبت، دوستی، خلوص، ایثار، قربانی کو تیاگ کر سڑکوں، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر بکھر جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر، لاٹھیاں، سلاخیں اور ہتھیار ہیں۔ پھر وہ ان مسائل کو حل کر[illegible] ہیں جو دو سو تیس سال سے ان پر لاد[illegible] جا رہے ہیں۔ ان دو سو تیس سالوں میں آ[illegible] تیس سال آزادی کے کہلاتے ہیں۔ لہلہاتے کھیتو[illegible] میں چہلیں بھرنے والی کملا، نیم تاریک گلیوں [illegible] گاہک تلاش کرنے لگتی ہے۔ اندھیرو[illegible] اگر اسے کچھ نہیں دیا تو اجالوں کی ضروریات اس کو نگل ہی لیں گی۔ اشوک، پیٹر، اش[illegible] سڑکیں ناپنے لگتے ہیں ان کے سوکھے چہروں [illegible] صاف لکھا ہوتا ہے کہ آرزو اور انتظار [illegible] بعد ان کی بقیہ آدھی عمر چھینے اور اچک[illegible] سے عبارت ہوگی۔

پھر تڑا تڑ پتھر برسنے لگتے ہیں۔ [illegible] ہوئے پتھر، ٹوٹے ہوئے شیشے، ہڑبونگ جلتی ہوئی گاڑیاں، مکانات، دکانیں [illegible] کراہیں، خون، دھواں — میری کہانی[illegible] کے سبھی کردار کلب، کافی ہاوز، ڈرائنگ ر[illegible] کالج، بار اور لہلہاتے کھیتوں سے نکل کر [illegible] مسائل حل کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شعلوں میں گھری ہوئی ایک ایمبولینس کا [illegible] دھنک کو افق سے افق تک نگل لیتا [illegible] ایمبولینس میں پھنسے ہوئے عورتوں اور بچو[illegible] زندہ بدن چرمرانے لگتے ہیں۔ جینے کی خواہش[illegible] مدد کے لئے کھڑکیوں سے باہر نکلے ہوئے [illegible] کے جلے بھنے ہاتھ سیدھے میرے دل میں دھ[illegible] لگتے ہیں میرا دل چیخ اٹھتا ہے، آنکھیں [illegible] لگتی ہیں۔ ذہن ماؤف ہو جاتا ہے اور میر[illegible] رک جاتا ہے۔

پھر میں تلوار اٹھالیتا ہوں جب جب ظلم، ناانصافی، نابرابری، نفرت، خود غرضی اور شرارت حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو جی داروں نے ہر دور میں تلوار اٹھائی ہے۔ دراصل میرا قلم ہی میری تلوار ہوتا ہے میں انقلابیوں کی مدح کرتا ہوں۔ مجاہدین کی شان میں قصیدے لکھتا ہوں۔ ان کے تذکروں سے میرے قلم میں روانی آجاتی ہے یہ مجاہد، یہ انقلابی، ساری دنیا کے مظلوموں کا آسرا ہوتے ہیں اور مظلوموں کو اندھیروں سے نجات دلانے کی ہر تحریک سے ئے باعث افتخار ہوتی ہے میں اس سے سربلندی محسوس کرتا ہوں، میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ مگر اب تو یہ چمک بھی اندھیروں میں بدل جاتی ہے۔ مظلوموں نے اپنا لہو بہاکر روشنی حاصل کرلی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ لمبی لمبی گھنی داڑھیوں کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ اندھیروں سے اندھیروں تک کے اس سفر میں بڑے بڑے عمامے باندھے، کالی قبائیں اوڑھے، ملاؤں کے سائے ابھرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں رائفلیں ہوتی ہیں، ان کے ہاتھ خون سے تر ہوتے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر جابجا خون کے دھبے ہوتے ہیں۔ ان کے خدا نے انھیں فتح و نصرت سے نوازا تھا۔ ان کی قوم نے انھیں اپنا نجات دہندہ مانا تھا لیکن وہ موت اور تباہی کے پیامبر ثابت ہوئے۔ اس اسلامی عفو و درگزر کو فراموش کرکے اسے قبروں میں محفوظ کر دیا اور زمین پر وہ بربریت، انتقام اور داروگیر میں مبتلا ہوگئے۔ میرا قلم پھر رکنے لگتا ہے میں تاریخ کا وہ روشن سنہرا اور مستقل باب تلاش کرنے لگتا ہوں جس میں لکھا ہے کہ اللہ کے رسول نے جب فتح پائی تھی تو اپنے بدترین دشمنوں کو بھی امان دے دی تھی۔ پیغام اور عمل کے تضاد کو دیکھ کر میں انسانیت کو آواز دیتا ہوں۔ میں چیخنے لگتا ہوں مگر میری آواز گھٹنے لگتی ہے کسی فوجی حکمراں کا کرخت چہرہ میری نظروں کے سامنے ابھر آتا ہے۔ اس کی لانبی لانبی مونچھیں پھانسی کا پھندہ بن کر میرے گلے میں پھنس جاتی ہیں۔ میری آنکھیں ابل پڑتی ہیں۔ ذہن پہ اندھیرا مسلط ہوجاتا ہے۔ ساری کائنات اس اندھیرے میں گم ہوجاتی ہے۔ میرے سامنے پلاٹ منجمد ہوجاتے ہیں اور ساری کہانیاں ادھوری رہ جاتی ہیں ۔۔۔

ک ک ک

پہلے اور اب

★ پرانے زمانے میں سیڑھیاں ٹھہری رہتی تھیں۔ لوگ چلتے تھے موجودہ دور میں لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں، سیڑھیاں چلتی ہیں

★ پہلے لڑکے لڑکیوں کو چھیڑتے تھے اب لڑکوں کو لڑکیاں . . . .

★ پہلے لڑکیاں جسم کا ہر حصہ چھپانے کی کوشش کرتی تھیں، اب دکھانے کی . . . . .

★ پہلے کے عاشق حسن کو دیکھ کر دیوانے ہوتے تھے اب بینک بیلنس دیکھ کر . .

★ پہلے دودھ میں پانی ملاتے تھے اب پانی میں دودھ . . . .

★ پہلے اصلی گھی میں ملاوٹ کرتے تھے اب نقلی گھی میں . . . .

★ پہلے ٹیکسی تیز چلتی تھی میٹر آہستہ، اب میٹر تیز چلتا ہے ٹیکسی آہستہ۔

خود کردہ را!

ایک سرد طوفانی رات میں ایک مدہوش شرابی ایک قبرستان سے گذر رہا تھا۔ اچانک وہ ایک کھلی ہوئی قبر میں گر پڑا! کچھ دیر وہ خاموش پڑا رہا۔ پھر اُسے ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تو وہ زور سے چلانے لگا: اُسی وقت ایک اور شرابی وہاں سے گزرا، اُس نے کسی کے چلانے کی آواز سنی تو قبر میں جھانک کر دیکھا اور بولا! کیا بات ہے دوست! "مجھے سردی لگ رہی ہے۔" قبر سے آواز آئی۔ تو چلا کیوں رہے ہو؟ تم نے خود ہی تو لاتیں مار مار کر قبر کی تمام مٹی ہٹا دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے راستے پر ہو لیا

زینت شمیم

منحوس تصویر

(افسانہ)

دوپہر کے بارہ بجے تھے جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اور ندی بہتے ہوئے پتھروں سے سر ٹکراتی بہے چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بے حد پرانے شکستہ مندر کے بلند پھاٹک کی کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔ فرش، دیواروں اور گنبد پہ اداس اداس پیلی دھوپ پھیلی تھی۔

"خوش آمدید نوجوان سیاح"! اچانک میں نے ایک بھرائی ہوئی آواز سنی جو ڈیوڑھی کی دائیں سمت سے آئی تھی اور دوسرے ہی لمحے میرے سامنے خاکستری رنگ کے ڈھیلے چوغے میں ایک بڑی ہی پُر وقار شخصیت کھڑی تھی جس کے سر پر عجیب وضع کی سرخ مخملی ٹوپی تھی اور لمبی بھوری داڑھی نے اس کے سرخی مائل چہرے کو اور بھی پُرکشش بنا دیا تھا۔

"صبح بخیر!" میں نے غیر ارادی طور پر جھکتے ہوئے کہا۔ اور اُس کے قریب جا کھڑا ہوا یقیناً وہ اس قدیم مندر کا راہب تھا

۲۷

یہ مندر یونان کی راجدھانی ایتھنز سے ستائیس میل دور ایک گھنے جنگل میں تھا۔ یونانی دیومالا سے متعلق تصویروں اور مجسموں کے لئے یہ تھا اور طویل عرصے سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

میں راہب کے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتا ہوا مندر کے وسیع ہال میں داخل ہوا اور مصوری اور نقاشی کے ان لاثانی شہپاروں کے حسن میں کھو گیا جو دیواروں اور ستونوں پر کئی صدی پہلے بنائے گئے تھے۔ میں ایک ایک نقش کے سامنے دیر تک کھڑا اس کی باریکیوں میں کھو یا رہتا اور راہب اپنے مخصوص پُر اثر انداز میں اُس تصویر کی کہانی بیان کرتا جاتا۔

کوئی تین گھنٹے تک میں مختلف کمروں، برآمدوں اور غلام گردشوں میں گھومتا رہا اور آخر میں ایک ایسے کمرے کے سامنے جا کھڑا ہوا جس کے بھاری بھرکم دروازے میں تانبے اور پیتل کی بڑی بڑی میخیں گڑی ہوئی تھیں اور بہت وزنی کنڈے میں جہازی سائز کا تالا لگا ہوا تھا۔

"اس کمرے میں کیا ہے؟" میں نے راہب کی طرف گھوم کر پوچھا۔

"جناب اس میں کچھ بھی نہیں

پیدا ہوئی۔

"مگر اسے اس طرح مقفل کیوں کر دیا گیا ہے؟" اس کے جواب سے میری حیرت اور بڑھ گئی۔

دراصل — دراصل اس میں ایک بڑی ہی منحوس تصویر رکھی ہوئی ہے صوفیہ کی — اور معاف فرمائیے مجھے اسے دکھانے کی اجازت نہیں ہے" راہب نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"صوفیہ —؟ یہ صوفیہ کون ہے؟" میں سراپا تجسس بن کر اس سے دریافت کیا۔

اُس نے ایک لمبی سانس لی اور دروازے کی طرف تکتا ہوا بولا۔ "صوفیہ اٹھارویں صدی کی حسین ترین یونانی دوشیزہ تھی۔ جو اپنی جوانی کے عالم میں اس مندر کی راہبہ بن گئی تھی۔"

"مگر اُس کی تصویر دیکھنے کی اجازت کیوں نہیں آخر؟" میں نے بڑھ کر دروازے [illegible] پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں جب بھی اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی گئی [illegible] سارے علاقے کو کسی نہ کسی آفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔" راہب نے جواب دیا اور ہال کی طرف واپس مڑ گیا۔

میرے ذہن میں کریدسی پیدا ہوئی۔ میں نے لپک کر اپنے پیچھے دنیا جہان کی مجاہت سمیٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں اگر آپ کسی وہم کا شکار ہیں تو یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ اگر آپ مجھے ایک نظر وہ تصویر دکھا دیں تو میں خود کو دنیا کا سب سے خوش [illegible] انسان سمجھوں گا۔

وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا اور برابر آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "مجھے معاف ہی رکھیں جناب۔ آج سے چالیس سال قبل ایک راہب نے کسی سیاح سے بھاری رشوت لے کر یہ حماقت کی تھی تو یہ پورا علاقہ کئی دن تک ہولناک طوفان سے لرزتا رہا۔ ایسا ہی طوفان اس تصویر کے مکمل ہونے پر آیا تھا اور پورے ملک میں پھیل گیا تھا۔"

پھر نہ جانے کیسے میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا، میں نے بڑھ کر راہب کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "اگر محترم راہب اس جسارت کو گستاخی تصور نہ فرمائیں تو" یہ کہتے ہوئے میں نے پانچ سو کرنسی کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"نہیں" اس نے بڑی نرمی سے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ میں نے کچھ اور نوٹ نکالے اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر راستہ روک لیا اس کی نظریں جھک گئیں اور بالکل ساکت کھڑا رہا۔

"یہ اور لیجئے" میں نے رقم بڑھا دی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ پھر گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا "ضد نہ کیجیے" اب وہ کچھ پسیجا ہوا نظر آ رہا تھا میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور کہا۔

"یہ میری مودبانہ گذارش ہے جناب۔ میری اس حقیر سی خواہش کو نہ ٹھکرائیے۔" شاید میرے لہجے کی عاجزی اور کرنسی نوٹوں کی تعداد اس کا دل موم کر گئی تھی۔ وہ رکا اور دھیرے سے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر سرگوشی کے انداز میں بولا "رات کو گیارہ بجے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔" پھر اس نے کرنسی نوٹ اپنے چغے کی اندرونی جیب میں ٹھونس لیے۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے میں مندر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کھڑکی کا دروازہ یکبارگی چرچرایا۔ اور میں جھک کر اندر داخل ہوگیا۔ راہب ہاتھ میں ایک بڑی سی موم بتی تھامے ہوئے تھا جس کی روشنی میں اس کا چہرہ خاصا پُراسرار دکھائی دے رہا تھا اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ہم ہال سے گذر کر اس کمرے کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جس کے اندر راہب کے بقول صوفیہ کی منحوس تصویر رکھی ہوئی تھی۔

موم بتی کی روشنی دروازے پر یوں لرز رہی تھی جیسے کوئی چمگادڑ اپنے بازو پھیلائے جھپٹنے والی ہو۔ تالا کھولنے کے بعد راہب نے خاصا زور لگا کر دروازے کو دھکیلا، اندر مکمل تاریکی تھی موم بتی راہب کے سینے کے قریب روشن تھی اور اس کا چہرہ بالکل کسی فلمی جادوگر کی طرح دکھائی دے رہا تھا، وہ آگے بڑھ کر کمرے کے بیچوں بیچ ایک چبوترے پر کھڑا ہوگیا اور بائیں طرف بچھی ہوئی ایک مسند پر روشنی ڈالتے ہوئے بولا "یہ ہے وہ تاریخی مسند جناب! جس پر صوفیہ پورے تین سال تک تصویر کی تیاری کے لیے جلوہ افروز رہی اور یہ ہے وہ پُراسرار مشہورِ عالم تصویر!"

اس نے دایاں ہاتھ بلند کر کے روشنی میرے سامنے والی دیوار پر ڈالی۔

"محترم سیاح!" راہب کی آواز پھر گونجی۔ "کہتے ہیں جب یہ تصویر فنکار نے مکمل کر لی تو مسند کی طرف دیکھ کر والہانہ انداز میں پکار اٹھا۔ صوفیہ میرے معبود۔ کیا تصویر مکمل ہو گئی؟ مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا کیونکہ صوفیہ تو نہ جانے کب کی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی اور فنکار اپنی ریاضت میں اس قدر محو تھا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ صوفیہ مر چکی ہے۔ اس نے پھٹی نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا پھر وہ تصویر کے قریب جا کر چیخا۔ "کیا تو مکمل ہو گئی ہے؟"

صوفیہ کی اس تصویر نے اس کی طرف حسرت سے دیکھا اور منہ موڑ لیا۔ فنکار تصویر میں چہرے کی بجائے صوفیہ کی پیٹھ دیکھ کر سکتے میں آگیا پھر نہ جانے وہ کدھر چلا گیا۔ اس کا کسی کو علم نہیں، بس لوگوں کو تو وہ طوفان اب تک یاد ہے جو اس موقع پر آیا تھا۔"

راہب کی جادوئی آواز نے میرے سارے جسم میں سنسنی سی پیدا کر دی۔ میرے حواس میرے قابو میں نہ تھے۔ میں سامنے دیوار پر کانپتی ہوئی روشنی میں ایک حسین عورت کا پُروقار سراپا دیکھ رہا تھا۔ جس کی پشت میری طرف تھی۔ پھر میں نہ جانے کب اور کیسے وہاں سے لوٹا مجھے یاد نہیں کہ طوفان آیا تھا کہ نہیں۔!

ایتھنز پہنچ کر میں نے اتفاق سے اس واقعے کا ذکر اپنے میزبان سے کر دیا۔ سارا قصہ سُن کر اس کے چہرے کے اعصاب کچھ اس طرح تن گئے کہ میں ڈر گیا اور فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس واقعے کا تذکرہ کسی اور سے نہیں

کرنا چاہیئے تھا۔ میز بان نے چند لمحوں کے تامل کے بعد بڑی سنجیدگی سے پوچھا "کیا وہ کمرہ بائیں ہاتھ والی غلام گردش کے اختتام پر ہے؟"

"ہاں۔!" میں نے کہا اور پھر اچانک میرے میزبان پر ہنسی کا ایک طویل دورہ پڑا جس سے وہ دیر تک سنبھل نہ پایا۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا اس کی شکل دیکھتا رہا اور بالآخر بڑی دیر بعد اور بڑی مشکل سے اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"میرے بے وقوف دوست! وہ تو راہب کا اپنا کمرہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ راہب اسی کمرے میں رہتا ہے اس کا سامنے والا دروازہ مقفل رہتا ہے اور وہ کمرے میں آمد و رفت کے لیے عقبی دروازہ استعمال کرتا ہے۔"

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا مجھے یوں لگا کہ صوفیہ کی منحوس تصویر نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور پھر منہ موڑ لیا۔"

جواب طلب امور کے لئے پوسٹ کارڈ یا ڈاک ٹکٹ کا آنا ضروری ہے

(ادارہ)

بقیہ۔ مفرور اور جلاوطن......

محلوں کی قیمت جو کہ تقریباً دو کروڑ روپے ہے انہیں ادا کرنے کی پیش کش بھی کی ہے لیکن ان کے خصوصی مشیر کا کہنا ہے کہ سابق بادشاہ یونان اپنی جائیداد کی فروخت میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتے۔

احمد فواد جو کہ مصر کے سابق ولی عہد ہیں ان کے لیے دولت کبھی مشکل مسئلہ نہیں رہی۔ سوئیٹزرلینڈ میں وہ ایک کروڑ پتی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر وہ خود بنکاری کا کاروبار کرتے ہیں اگر مصر میں بادشاہت قائم رہتی تو وہ اس وقت مصر کے بادشاہ ہوتے ان کے والد مشہور عالم شاہ فاروق نے مصر سے ایک کشتی میں فرار ہو کر اپنی جان بچائی اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرار کے وقت کشتی میں کروڑوں روپے مالیت کا سونا اور ہیرے جواہرات بھی ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے ان کے صاحبزادے احمد فواد کو اپنے کاروبار کے آغاز کے لیے کچھ مشکل نہ ہوئی۔ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی اس "بے تاج بادشاہوں کی کلب" کا ایک ممبر ایسا بھی ہے جو اپنے ہی ملک میں زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ پرتگال کا سابق بادشاہ میونیل ہے جو اپنے آپ کو بادشاہ یا سابق بادشاہ کی بجائے "نواب آف برامنزا" کہلوانا پسند کرتا ہے ●

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۹ سے آگے)

بقیہ۔۔ حیدرآباد اور بچوں کا ادب

انداز اور عام فہم اردو میں مضامین لکھے ہیں راقم الحروف نے بھی سائنس اور جغرافیہ اور عجائبات اور پرندوں پر بے شمار مضامین لکھے۔ راقم الحروف نے ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والوں کے لئے ایک معلوماتی اور اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتی تخلیق، "آؤ ڈاک ٹکٹ جمع کریں" جو ایک مقامی روزنامہ میں قسط وار شائع ہو چکی ہے اب یہ مکمل کتابی شکل میں زیر طبع ہے معظم علی اور محمود خاور اگرچہ کہ بچوں کے ادیب نہیں ہیں لیکن انھوں نے علی الترتیب سری آربندو اور ٹیپو سلطان پر کتابیں لکھ کر مرکزی حکومت سے انعام حاصل کیا ہے۔ معظم حسین امیر خسرو ٹیگور اور مہاتما گاندھی پر کتابیں شائع کر چکے ہیں جو بڑی مقبول ہیں اردو میں بچوں کا ادب ابھی اتنا ترقی یافتہ صورت میں نہیں ہے جتنا کہ دوسری زبانوں میں ہے ہمارے ادیب اور شاعر جو ملک و قوم کی آئندہ ترقی کے خواب دیکھتے ہیں انھیں اس طرف توجہ دینی چاہیئے کیونکہ یہی بچے تو آگے چل کر ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں گے اگر ان کی تعلیم و تربیت سے بے توجہی برتی گئی تو شاید یہ خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا ●●

معلوماتی مضمون

عالمی کلب

مفرور اور جلاوطن بادشاہوں کی پناہ گاہ

دنیا میں صرف چار بادشاہ رہ جائیں گے اور وہ ہوں گے تاش کے پتوں کے بادشاہ ہاں ایک اور بادشاہ بھی باقی رہے گا اور وہ برطانوی تاج کا وارث ہوگا لیکن اس کی حیثیت بھی تاش کے بادشاہوں جیسی ہوگی ۔ مصر کے سابق شاہ فاروق کے یہ الفاظ آج سے بہت پہلے کہے تھے اس وقت دنیا کو حیرت زدہ کر دیا تھا آئیے ذرا دیکھیں کہ سابق شاہ فاروق کے یہ الفاظ حقیقت کا روپ کہاں تک دھار چکے ہیں (ادارہ)

حال ہی میں دنیا کی سب سے محدود اور منفرد ترین کلب میں ایک نئے ممبر کا اضافہ ہوا ہے اپنی نوعیت کی اس واحد اور منفرد کلب کے یہ نئے ممبر کچھ عرصہ قبل "تخت طاؤس" چھوڑ کر فرار ہونے والے شہنشاہ ایران ہیں یہ کلب جس کا ذکر تفصیلی طور پر آگے چل کر آئے گا' میں شامل تمام ممبر کسی زمانے میں ہیروں اور جواہرات سے مزین سنہری تاج پہنا کرتے تھے اور سنہری وردیوں میں ملبوس چاک و چوبند ہزاروں خدام ان کے ایک اشارہ پر ان کا حکم بجا لاتے ہوئے جان و تن قربان کرنے کے منتظر رہا کرتے تھے' اب یہ بھی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کلب کا اپنا ایک منشور ہے اور یورپ کی اکثر عالمی کلبوں کی نسبت اس کی ممبر شپ کے لئے کوئی خاص پابندی نہیں بلکہ اس کا ممبر بننے کے لئے کسی کو بادشاہ ہو کر اپنا ملک اور تاج و تخت چھوڑنا پڑتا ہے اور بس ۔

عالمی جنگ دوم سے اس وقت تک اس کلب میں کئی نئے بادشاہ شامل ہوتے ہیں اور یہ سبھی سابق بادشاہ اب جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی ہی جلاوطنی کی زندگی گذارنے والوں میں دو سابق بادشاہوں کی "ملکاؤں" کا تعلق ڈنمارک سے ہے ان میں ایک تو یونان کے سابق بادشاہ کنسٹنٹائن دوم ہیں جن کی ملکہ "این مری" ڈنمارک کی موجودہ ملکہ مارگریٹ کی سگی بہن ہیں یہ جوڑا اب لندن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔

مفرور و جلاوطن بادشاہوں کی اس "عالمی کلب" کے دوسرے ممبر رومانیہ کے سابق بادشاہ "مائیکل" ہیں جو کہ اپنی ملکہ "این" کے ساتھ سوئیٹزرلینڈ میں رہتے ہیں "ملکہ این" کا تعلق بھی ڈنمارک ہی سے ہے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اپنی اس جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے متذکرہ دونوں ڈینش شہزادیاں یعنی ملکہ "این مری" اور "این" اکثر و بیشتر یہاں ڈنمارک میں اپنے دوسرے شاہی رشتہ داروں سے ملنے آتی رہتی ہیں لیکن وہ اپنے شوہروں جو کہ سابق بادشاہ ہیں کے ساتھ یہاں ہی مستقل منتقل کیوں نہیں ہو جاتیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب یا تو وہ خود یا پھر ڈنمارک کا شاہی خاندان ہی دے سکتا ہے ۔

سوئیٹزرلینڈ اور انگلستان کے علاوہ اسپین اور پرتگال بھی ان "بھگوڑے" بے تاج بادشاہوں کو پناہ دینے والے ممالک میں شامل ہے اور پرتگال میں تو ان "بے تاج" بادشاہوں کے "شاہ" یعنی اس عالمی کلب کے معمر ترین صدر سے ملاقات بھی کی جا سکتی ہے بے تاج بادشاہوں کے بادشاہ اٹلی کے مفرور اور جلاوطن بادشاہ "امبرتو" ہیں جن کو ۱۹۴۶ء میں اٹلی میں ایک عوامی ریفرنڈم کے بعد اپنی بادشاہت سے ہاتھ دھونا پڑا اور اٹلی سے بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ واضح رہے کہ ۱۹۴۶ء میں اٹلی میں عوامی ریفرنڈم کے ذریعے اٹلی کو بادشاہت سے ریپبلک میں تبدیل کر دیا گیا تھا اگرچہ اطالوی بادشاہ کی تمام جائیداد کو ضبط کر لیا گیا تھا لیکن شاہی خاندان نے پہلے ہی سے چار کروڑ ڈالر کی رقم ایک برطانوی انشورنس کمپنی میں جمع کرا دی تھی اور آج یہی وجہ ہے کہ پرتگال میں یہ اطالوی سابق بادشاہ الیسٹریل کے مقام پر ایک شاندار محل میں رہتا ہوا ماضی کی سنہری یادوں سے دل بہلاتے ہوئے اپنے حال کی پروا کئے بغیر ہی مستقبل

گذارنے کے لئے تیا ہے ان کا ایک بیٹا پرنس وکٹر امینوئل سوئٹزرلینڈ میں بین الاقوامی پیمانے پہ تجارت کرتا ہے اور وہ نہ صرف اپنے باپ کے تجارتی معاملات کی دیکھ بھال ہی کرتا ہے بلکہ اب اس کو اس کلب کے بالکل حال ہی میں ممبر بننے والے رضا شاہ پہلوی کا معاشی مشیر بھی مقرر کیا گیا ہے شاہ ایران جن کی جائیداد سوئٹزرلینڈ، امریکہ اور جنوبی افریقہ میں پھیلی ہوئی ہے اور کسی بھی طرح سے ان کو مالی و معاشی مشکلات کا سامنا نہیں۔ ایران میں اسلامی انقلابی حکومت کے نئے لیڈر آقائے آیت اللہ خمینی نے سوئٹزرلینڈ سے مطالبہ کیا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں سابق شاہ ایران اور ان کے دیگر اہل خاندان کی جتنی بھی جائیداد اور رقوم زیورچ اور جنیوا کے بنکوں میں محفوظ ہے اور جسے سوئٹزرلینڈ کے بنکوں کے موجودہ قوانین کے تحت تحفظ حاصل ہے ایران کے عوام کو واپس کی جائے اگرچہ سوئٹزرلینڈ نے آقائے خمینی کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا ہے کہ سابق شاہ ایران کی سوئٹزرلینڈ میں جمع شدہ رقومات کی ایرانی عوام کو واپسی کے لیے یہ معاملہ عدالت کے سپرد کر دیا گیا ہے اور عدالت جو فیصلہ دے گی اس پہ عمل کیا جائے گا لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے یہ کہہ کر ایران کے موجودہ حکمرانوں کو محض اس لئے مطمئن کرنا چاہا ہے کہ وہ اس کے لیے تیل کی سپلائی بحال رکھیں کیونکہ شاہ کی رقوم کی ایرانی عوام کو واپسی کے لئے سوئٹزرلینڈ کی عدالتی کارروائی محض ایک بہانہ اور ٹال مٹول کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اگرچہ کیپ سٹیٹس میں وہ محل جہاں جنگ دوم کے دوران شاہ ایران کے والد "جلاوطنی" کے دنوں میں مقیم تھے اور ان کے قتل کے بعد اس محل کو ایک عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے اب خیال کیا جاتا ہے کہ شائد سابق شاہ ایران رضا شاہ پہلوی اس محل میں پناہ گزیں ہوں گے اور ایسا ہوا تو پھر "بے تاج بادشاہوں کی عالمی کلب" کے یہ نئے ممبر رضا شاہ پہلوی البانیہ کے سابق بادشاہ "لیکا" کے پڑوسی ہوں گے۔

آج کل اگرچہ البانیہ کے سابق بادشاہ "لیکا اول" رہوڈیشیا میں مقیم ہیں لیکن سپین میں ان کا محل برقرار ہے رہوڈیشیا میں البانیہ کے سابق بادشاہ کے قیام کی وجہ اسپین میں ان کی رہائش گاہ سے بھاری مقدار میں اسلحہ کی برآمدگی ہے جس کی وجہ سے ان پہ شک کیا جانے لگا ہے کہ وہ عالمی اسلحہ کے اسمگلروں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے برعکس البانیہ کے بے تاج شاہ لیکا اول کا کہنا ہے کہ ان کو البانیہ کی موجودہ حکومت سے جان کا خطرہ ہے لیکن اس کے لئے میں صرف اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں پستول رکھتا ہوں اور بس۔ البانیہ کے یہ سابق بادشاہ بہت زیادہ مقروض ہیں لیکن ان کے لیے اس بات کی وضاحت کرنا سخت ترین مشکل ہے کہ وہ کروڑوں روپے کے کس طرح مقروض ہوئے ہیں اور ان کی ادائیگی کس طرح ممکن ہو گی لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا ہے کہ "ان کے قرضوں کے واجب الادا تمام بل اگر انھیں رہوڈیشیا بھجوا دیئے جائیں ان کو فوری طور پہ ادا کر دیا جائے گا۔"

بلغاریہ کے سابق بادشاہ "سیمون" جو کہ ۱۹۴۵ء سے لے کر آج تک میڈرڈ میں مقیم ہیں اور جنھوں نے اسپین ہی میں ایک امیر ترین عورت سے شادی کر رکھی ہے ان کے بارے میں ہر کوئی صرف یہ جانتا ہے کہ وہ ایک سابق بادشاہ ہیں اور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بادشاہت کے خاتمہ پہ ملک سے فرار ہوتے وقت کروڑوں روپیہ صندوقوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور آج تک یہی وجہ ہے کہ وہ دولت میں کھیل رہے ہیں۔

یونان کے سابق بادشاہ کنسٹنٹائن کے بارے میں شروع میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہ معاشی طور پہ مشکلات کا شکار رہیں گے کیونکہ انھیں ایتھنز سے خالی ہاتھ جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا لیکن وہ آج کل لندن جہاں سے ان کے "سسرال کے گھر" ڈنمارک کا سفر صرف ایک گھنٹہ کا ہے جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے ہوئے "گلچھرے" اڑا رہے ہیں اور وہ ابھی تک اپنے لندن کے گھر میں سنہری وردیوں میں ملبوس "شاہی عملہ" بھی رکھتے ہیں اور اپنے ایام شاہی کے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے گاہے بگاہے اپنے وفادار یونانی باشندوں کو شرف ملاقات بھی بخشتے ہیں اگرچہ یونان کی موجودہ حکومت نے یونان میں موجود ان کے بیشتر

(باقی صفحہ ... پر)

محمد اکرام اللہ خان

فلم نامہ

اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ فلمی دنیا میں آدمی کی صلاحیتیں کم اور قسمت زیادہ چلتی ہے۔ جب تک قسمت کا ستارہ عروج پر رہتا ہے کوئی کسی کا راستہ نہیں روک سکتا لیکن جب ستارے گردش میں آتے ہیں تو جن پہ تکیہ رہتا ہے وہی پتے ہوا دینے لگتے ہیں" آج میں آپ کو قسمت کے مارے ایسے ہی چند افراد کی داستان سنانے جا رہا ہوں۔

آپ نے موسیقار او۔پی۔ نیر کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک اچھی فلم میں موسیقی دے کر پھر سے فلمی دنیا میں مقام بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ او۔پی۔ نیر کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت خیال کیا جاتا تھا۔ فن موسیقی پر اچھا خاصا عبور ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں کلاسیکل اور عام فہم چلتی ہوئی موسیقی کے صحیح استعمال کا سلیقہ تھا چنانچہ انھوں نے اپنے فن کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ساری فلم انڈسٹری حیرت زدہ ہو گئی اور نیر کی موسیقی کا سیلاب ساری انڈسٹری کو بہا لے گیا۔ مقبولیت اور شہرت کے اس دور

میں کہا جاتا ہے کہ او۔پی۔ نیر سے لتا منگیشکر کے کچھ اختلافات ہو گئے اور لتا بائی نے اعلان کر دیا کہ وہ نیر کے ساتھ کوئی گانا نہیں گائیں گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہر فلم کے دس میں سے کم سے کم آٹھ گانے لتا کے ہوا کرتے تھے۔ او۔پی۔ نیر کی خودداری نے لتا سے سمجھوتہ گوارا نہ کیا۔ انھوں نے جوابی اعلان کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ لتا کی آواز کا سہارا وہی موسیقار لے سکتے ہیں جنھیں اپنے فن پہ کامل اعتماد نہ ہو۔ چنانچہ او۔پی۔ نیر نے لتا کو نظر انداز کر کے آشا بھونسلے (لتا کی بہن) کی آواز کو اپنی موسیقی کے ساتھ کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ ساری فلم انڈسٹری ان کے فن کی قائل ہو گئی۔ آشا کی آواز اور نیر کی موسیقی کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگا۔ آشا اور نیر کی جوڑی انڈسٹری کی مقبول ترین جوڑی تسلیم کی جانے لگی۔ آشا نے اپنے گلے میں نیر کے فوٹو کا لاکٹ بھی پہن لیا اور بعض قریبی لوگ آشا کو آشا نیر بھی کہنے لگے تھے لیکن اس ربط اور دوستی کو زمانے کی نظر لگ گئی۔ پھر آشا نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اب او۔پی۔ نیر کی دھنوں پر گانے سے معذور رہے۔ نیر نے اس سانحہ کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ اور اعتماد کے ساتھ نئی نئی آوازوں کو لتا اور آشا بنانے میں مصروف ہو گئے ادھر لتا اور آشا کی دو بارہ رقابت خلوص میں بدل گئی۔ جب دونوں

بہنوں نے دیکھا کہ نیر کا بائیکاٹ کر باوجود ان کی مقبولیت میں کمی نہیں ہے تو انھوں نے دوسرے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ پہلے ہی سے لتا کے ناز اٹھانا موسیقاروں کے لئے ایک مصیبت اب دونوں بہنوں نے مل کر میوزک ڈائر سے مشترکہ شرائط پیش کرنے شروع کر انھوں نے میوزک ڈائرکٹروں سے کہ کہ جو سازندہ نیر کے آرکسٹرا میں بجا وہ ہماری ریکارڈنگ میں حصہ نہیں لے نئے نئے میوزک ڈائرکٹر جن میں لکشم پیارے لال بھی شامل ہیں اپنے اپنے ساز کو نیر صاحب کے آرکسٹرا میں شامل نہ ہو ہدایت کرنے لگے اسی طرح نیر صاحب سازندوں کے تعاون سے محروم ہو جانا نتیجہ میں وہ نیر جس کا پوری انڈسٹری میں بولتا تھا رفتہ رفتہ گوشۂ گمنامی میں کھو

—

راج کپور فلم بابی کے لئے پہلا گانا ر کروا رہے تھے انھوں نے شنکر جے کشن چھوڑ کر پہلی دفعہ لکشمی کانت۔ پیارے انچ لینٹ میں شامل کیا تھا۔ راج کپور جلد کروا لینا چاہتے تھے لیکن مشہور ریکا مینو کار تک سے لکشمی کانت پیارے لا الجھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہی مینو کار ہیں جنکے بغیر کوئی گانا ریکارڈ نہیں ہو تھا۔ کیا میوزک ڈائرکٹر کیا گانے والا کیا فلم ساز سبھی مینو بابا کو سر آنکھوں پر بٹھا

تھے نورنگ اسٹڈیو میں ریکارڈنگ کی ایک نئی مشین امپورٹ ہوکر آئی تھی جس کے دس چینل پر ریکارڈنگ کی جاسکتی تھی بمبئی کی دیگر مشینوں میں صرف چار چینل پر ریکارڈنگ کا انتظام تھا۔ چنانچہ مینو بابا نورنگ اسٹڈیو کے چیف ریکارڈسٹ بنا دیئے گئے تھے مینو بابا کے لئے دس چینل کی مشین نئی تھی اس لئے ان کے ہمدردوں نے مشورہ دیا کہ وہ ریکارڈنگ سے پہلے اس مشین پر پہلے اپنا ہاتھ صاف کرلیں لیکن مینو بابا کو اپنے کام پہ پورا اعتماد تھا اس لئے انھوں نے اس مشورے کو نظر انداز کردیا۔ راج کپور چونکہ نورنگ اسٹڈیو کے پارٹنر بھی ہیں اس لئے پہلی بار بابی کے گانے کی ریکارڈنگ نورنگ میں ہونے لگی جو لکشمی کانت پیارے لال کی مرضی کے خلاف بات تھی۔ گانا تھا "میں شاعر تو نہیں" گانے والا بھی نیا، راج کپور کے لئے لکشمی کانت پیارے لال بھی نئے۔ مینو بابا کے لئے مشین بھی نئی۔ بہرحال گانا ریکارڈ ہوا۔ ساز اور آواز کی (MIXING) میکنگ ہونے کے بعد جب سب لوگوں نے گانا سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ریدھم کمزور ہے پھر کیا تھا لکشمی کانت پیارے لال نے کہدیا کہ نورنگ کی مشین میں کچھ خرابی ہے آپ یہی گانا فیمس میں ریکارڈ کروالیں اگلے دن فیمس میں مینو کاترک کے بجائے ان کے اسسٹنٹ بنسالی نے ریکارڈنگ کی پھر واہ واہ اور داد وتحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ اس کے بعد کسی میوزک ڈائرکٹر نے نورنگ اسٹڈیو کا رخ نہیں کیا۔ آج بھی مینو بابا وہیں ہیں اور بابی کا وہ گانا بھی نورنگ کی ریکارڈنگ لائبریری میں محفوظ ہے اور بعض سننے والوں کا کہنا ہے یہ کہ ریکارڈنگ ہر طرح سے لاجواب ہے —!!

تماشائی

فلمی ڈائری

پچھلے دفعہ فلمی ڈائری میں اس بات کا انکشاف کیا گیا تھا کہ سنسر بورڈ کے آفس میں رکھے گئے ملاقاتیوں کے رجسٹر میں ہدایت کار من موہن دیسائی اور دوسرے ہدایت کاروں اور فلم سازوں نے بڑے دلچسپ اور بعض قابل اعتراض ریمارکس لکھے ہیں اب پتہ چلا ہے کہ یہ ریمارکس ان ہدایت کاروں اور فلم سازوں کے نہیں ہیں بلکہ ان کے جعلی دستخطوں کے ساتھ بعض ایسے یار لوگوں نے لکھے ہیں جو ان ہدایت کاروں اور فلم سازوں کو سنسر بورڈ کی نظر میں مشتبہ کرنا چاہتے تھے۔ سنسر بورڈ ان جعلی تحریروں کے ذمہ دار افراد کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔

-★-

زندگی کے سفر میں کئی اپنے غیر بن جاتے ہیں اور کئی غیر اپنوں سے زیادہ قریب آجاتے ہیں نرگس اور راج کپور جن کے دل کبھی ایک ساتھ دھڑکتے تھے اتنے دور ہو گئے کہ برسوں سے ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ اب راج کپور کے گھر ایک خوش گوار اور پُر مسرت تقریب ہوئی۔ رشی کپور اور نیتو سنگھ کی منگنی کی تقریب میں بہت سارے دوست احباب اور فلمی ستاروں کے علاوہ سنیل دت اور نرگس دت نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔ چنتو اور نیتو زندگی کے نئے سفر کے تصور میں خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے لیکن ان کی اور دوسروں کی خوشی اس لئے بھی دوبالا ہو گئی کہ اس خوشی کے بہانے فلمی دنیا کے دو خاندان جن کے بیچ ایک خلیج حائل ہو گئی تھی ایک دوسرے سے قریب آگئے۔ ایک دلچسپ خبر یہ بھی سنیئے کہ جس دن رشی کپور اور نیتو کی منگنی تھی اسی دن شتروگھن سنہا نے نیتو کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنائی۔ لیکن شترو نے یہ جرأت رشی اور نیتو کی منگنی کی تقریب میں نہیں کی بلکہ "تیسری آنکھ" کے ایک سین کی شوٹنگ کے وقت اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ موقعہ ہاتھ لگا

-★-

حادثے جو عام لوگوں کی زندگی میں ویلن کا کردار ادا کرتے ہیں وہ فلمی ویلن امجد خان کی زندگی میں ہیرو یعنی امجد کے دوست اور ہمدرد بن کر آئے ہیں۔ اسے زندگی کا خطرناک ترین حادثہ پیش آیا۔ اس حادثے سے صحت یاب ہوتے ہوتے وہ ابھی ہسپتال کے بستر پر ہی تھا کہ فلم سازوں کی لائین لگ گئی اسے اپنی فلموں میں لینے کے لئے۔ اب اس کے پیر کا زخم اچھا ہوا تو چار دن میں اس نے پانچ نئی فلموں کی صورت میں حصہ لیا۔ یہ فلمیں ہیں۔ "پانچ قیدی" "بمبئی کا مہاراجہ" اور "ہم سے نہ جیتا کوئی" ابھی دو فلموں کے نام طے نہیں کئے گئے ہیں۔

-★-

شکتی سامنت ہماری فلمی دنیا کے مانے ہوئے ہدایت کار ہیں۔ انھوں نے کئی کامیاب فلموں کی ہدایت دی ہے لیکن کچھ دنوں سے باکس آفس پر ان کی فلمیں یکے بعد دیگرے ناکام ہوتی جا رہی ہیں۔ پچھلی ۹ فلموں میں ان کی صرف دو فلمیں "انوراگ" اور "امانش" کامیاب ہو پائی ہیں۔ ان کی حالیہ فلم "گریٹ گیمبلر" بھی کافی پبلسٹی اور اچھی کاسٹ کے باوجود باکس آفس پر جم نہیں سکی۔ فلم سازی واقعی ایک بہت بڑا جوا ہے۔ چنانچہ جواری کے نام پر گذشتہ دنوں جو تین فلمیں بنیں یعنی "جواری" "گیمبلر" اور "گریٹ گیمبلر" وہ تینوں فلم سازوں کے لئے گھاٹے کا سودا ثابت ہوئیں۔

-★-

"لوڈ ننگ" نے کشور کمار کو شہرت دی اور امیت کمار اسی لوڈ ننگ کے سہارے شہرت پاکر باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے نقش قدم پر چلتے ہوئے اب وہ اپنے گانوں کا اتنا ہی معاوضہ طلب کر رہا ہے جتنا کشور کمار لیتا ہے۔

-★-

ناولوں اور افسانوں کی قسطیں تو آپ

بڑھتے ہی ہیں اب فلمیں بھی اقساط میں بننے لگی ہیں۔ کبھی پچھلی فلمی انڈسٹری میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ "سچا جھوٹا" نہیں بنی اور وہ "کی دوسری قسط بن رہی ہے۔ اب "کھوٹے سکے" کی دوسری قسط "کچے ہیرے" کے نام سے بنائی جا رہی ہے۔ ہدایت کار اور اداکار وہی ہیں صرف فلم ساز بدل گئے ہیں۔

-★-

آج کل جنوبی ہند کے نوجوان ننگی تصاویر کی کتابوں کی تلاش میں زیادہ سرگرداں نظر نہیں آتے۔ جنوبی ہند میں جو جنسی فلمیں بن رہی ہیں ان کے اشتہار جو ہورڈنگس پر چسپاں ہوتے ہیں اتنے عریاں ہوتے ہیں کہ وہاں کے نوجوان ان اشتہاروں ہی سے اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔

-★-

رضا مراد نے اپنا فلمی سفر ہندی فلموں سے شروع کیا تھا لیکن ہندی فلموں میں اسے منزل نہیں مل سکا اور اس کی مراد بر نہیں آ سکی۔ اس کی پہلی فلم تھی "ایک نظر" اس کے بعد اس نے "نمک حرام" میں کام کیا تھا۔ ان دونوں فلموں میں اس کی اداکاری لاجواب تھی "ایک نظر" تو باکس آفس پر ناکام ہو گئی۔ "نمک حرام" کچھ کامیاب بھی ثابت ہوئی تو رضا مراد کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اب اس نے پنجابی فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے اس کے ہاتھ پر اس وقت کوئی (۲۵) پنجابی فلمیں

ہیں۔ شائد ان فلموں میں اس کی مراد پوری ہو سکے اور باکس آفس پر وہ ایک کامیاب اداکار ثابت ہو پائے۔

-★-

"ریڈیو ٹیپ" جس کے ذریعے آپ اپنے گھر کے ٹی وی پر فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی فلم سازوں کے لئے ایک درد سر بن گیا ہے یہاں کی فلموں کے ریڈیو ٹیپس غیر قانونی طور پر باہر جا رہے ہیں اور فلم سازوں کی آمدنی جو بیرونی زر مبادلہ کے ذریعہ ہوتا ہے بری طرح متاثر ہو رہی ہے گزشتہ دنوں لندن کے ایک اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" نے لکھا تھا کہ ہندوستانی فلموں کے غیر قانونی داخلے کی وجہ سے برطانیہ کی حکومت کو ٹیکس کا کافی نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے ایک اندازے کے مطابق برطانیہ کی حکومت کو سالانہ ایک سو ملین پونڈ کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ نقصان ہندوستانی فلم سازوں کا ہوگا۔ اب یہاں ریڈیو ٹیپس کی برآمد کو قانونی صورت دے کر باقاعدہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے پتہ نہیں یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ امریکہ میں ریڈیو ٹیپس کافی استعمال کئے جاتے ہیں لیکن یہاں کے فلم ساز باقاعدہ اپنی فلموں کے حقوق ریڈیو ٹیپس بنانے والی کمپنیوں کو فروخت کر دیتے ہیں لیکن امریکہ میں ریڈیو ٹیپس فروخت کرنے والوں

کا کہنا ہے کہ مشہور امریکی فلموں سے زیادہ جن فلموں کے ٹیپس بکتے ہیں وہ PORNO یعنی عریاں اور جنسی فلمیں ہوتی ہیں۔ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ آتے ہیں اور ان جنسی فلموں کے ٹیپس منتخب کر کے گھر لے جاتے ہیں جہاں وہ اطمینان سے گھر کے ٹی۔ وی پر جنسی تماشا دیکھتے ہیں۔

-★-

یہ تو آپ کو پتہ ہے کہ جانی بابو قوال فلم ساز بن گئے ہیں اور اپنی ایک فلم شروع کر دی ہے اب شتروگھن سنہا کے بھائی ڈاکٹر لاکھن سنہا نے بھی اپنی لائین کو خیرباد کہہ کر فلم سازی کی لائین اختیار کی ہے۔ ان کی پہلی فلم ہوگی "سچا مانگے خون" جسے راج کھوسلہ ڈائریکٹ کریں گے۔ فلم کی کہانی اور اسکرین پلے سورج منیم کے ہیں اور مکالمے ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے۔ ظاہر ہے کہ فلم کا ہیرو شتروگھن سنہا ہی ہوگا اور اس کے مقابل ریناراۓ ہوگی۔

-★-

"امردیپ" جو راجیش کھنہ کے لئے امید کا چراغ بنی ہوئی ہے عنقریب نمائش کیلئے پیش نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ اس کی کہانی کے تعلق سے کسی وجے نارائن نے بمبئی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ امردیپ اس سے پہلے ملیالم اور تلگو میں بن چکی ہے اور کافی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ راجیش کھنہ کی قسمت اس فلم سے دوبارہ

چمک سکتا ہے کہ نہیں۔

—٭—

ریکارڈوں کی فروخت ہر ملک میں بڑھتی جا رہی ہے چنانچہ ہندوستان میں ۷۶ء میں ۴ کروڑ روپئے کے ریکارڈ فروخت ہوئے تھے اور ۱۹۷۸ء میں یہ رقم ۱۴ کروڑ روپئے ہو گئی۔ امریکہ میں تو ریکارڈ کمپنیوں نے فلم سازوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ۱۹۷۸ء میں ریکارڈ کمپنیوں کی آمدنی سارے ملک کے باکس آفس کی آمدنی سے زیادہ تھی۔ ہندوستان کے برخلاف جہاں صرف فلمی گانوں کے ریکارڈس زیادہ فروخت ہوتے ہیں امریکہ میں غیر فلمی گانے والوں جیسے (BEAT LES) وغیرہ کے ریکارڈس لاکھوں کی تعداد میں بکتے ہیں۔

—٭—

"گنگا اور سورج" جس کے پروڈیوسر سریش سہگل ہی میں دل کا دورہ پڑا تھا اب مکمل ہو چکا ہے۔ یہ فلم کئی نشیب و فراز سے گزر کر اب تکمیل کے مرحلے کو پہنچی ہے۔ فلم کے ستاروں میں سنیل دت، ششی کپور، رینا رائے، سلکشنا پنڈت، ایرونا ایرانی اور قادر خان شامل ہیں ہدایت اے سلام کی اور موسیقی لکشمی کانت پیارے لال کی ہے۔

—٭—

ہمارے مشہور فلمی ستارے ایک سے زیادہ کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین تین شفٹوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اب ان فلمی ستاروں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہدایتکار بھی ایک ساتھ کئی فلموں میں ہدایت دے رہے ہیں پرکاش مہرہ ایک ساتھ "جادوگر" "جوالا مکھی" "لاوارث" اور "نمک حلال" کی ہدایت دے رہے ہیں۔ من موہن دیسائی کے ہاتھ پر پانچ فلمیں ہیں۔ "سہاگ" "نصیب" "دیش پریمی" "خدا گواہ" اور "سرفروش" فلم ساز اور ہدایت کار بی آر چوپڑہ بھی کئی فلمیں ایک ساتھ بنا رہے ہیں اور ہدایت دے رہے ہیں۔ اداکاروں کے لئے ایک سے زیادہ فلموں میں اداکاری کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے لیکن ہدایت کار کے لئے جو فلم کی ہر چھوٹی بڑی بات کا ذمہ دار ہوتا ہے، ایک سے زیادہ فلموں پہ توجہ دینا انتہائی مشکل امر ہے۔ لیکن مشکل کشا یعنی پیسے کی خاطر آج کل ہدایت کار فلم پہ کم اور اپنی آمدنی پہ زیادہ توجہ دے رہے ہیں ہاں اب بھی بعض ذمہ دار ہدایت کار اور فلم ساز ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ فلموں پہ توجہ بانٹنا نہیں چاہتے راج کپور، سنیل دت، منوج کمار اور ناصر حسین ایسے ہی ذمہ دار فنکاروں میں ہیں ناصر حسین نے ۲۰ لاکھ پانی میں بہا کر "زبردست" صرف اس لئے بند کر دی کہ کہیں بڑے فلمی ستاروں کا چکر فلم کے دوسرے پہلوؤں پہ اثرانداز نہ ہو ——

آئینی حق

ایک بار امریکہ کے صدر ولیم ٹافٹ کو اُن کے بیٹے نے گالی دی۔ جس پہ مسز ٹافٹ بہت ناراض ہوئیں۔ اور اُسے سزا دینے کی سفارش کی۔ صدر نے کہا۔ "اگر اس نے باپ کو گالی دی ہے تو اُسے ضرور سزا ملنی چاہئے۔ لیکن اگر اُس نے صدر امریکہ کو گالی دی ہے تو یہ اُس کا آئینی حق ہے۔"

یقین دہانی

ایک نوجوان پادری کسی دور دراز علاقے میں گیا اور اس نے وہاں کے لوگوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اُسے سب سے بڑا اعتراض خواتین کی تمباکو نوشی پر تھا ایک روز اُسے ایک بوڑھی عورت کے مکان میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اس نے دیکھا کہ ضعیف عورت ہر کھانے کے بعد پائپ پیتی ہے "محترم خاتون" پادری نے کہا جب تمہارا وقت آ جائیگا اور تمہیں آسمان پر بلا یا جائیگا تو کیا تم سمجھتی ہو کہ سینٹ پیٹر تمہیں جنت میں جانے کی اجازت دینگے جبکہ تمہاری سانسوں سے تمباکو کی بو آ رہی ہوگی!

بوڑھی عورت نے منہ سے پائپ نکالا اور جواب دیا! "سینٹ پیٹر جب وہ وقت آئے گا تو میں یقین دلاتی ہوں کہ میں اپنی سانسیں یہیں چھوڑ جاؤں گی!"

Registered with the Registrar of Newspaper Registered No : 8285/64

Phone :52957

POONAM URDU MONTHLY

mpura Hyderabad-500 024. Editor : Nasir Kurnooli, M.A.

August 1979

Price 1-25

اشاعت کا پندرھواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت
علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

پونم

جلد (۱۵)
شمارہ (۸)
اگست ۱۹۷۹ء

ایڈیٹر
ناصر کرنولی

زرسالانہ ۱۵ روپے
لائبریریز کیلئے ۲۰ "
بیرونی ممالک سے ۲۵ شلنگ

خط وکتابت کا پتہ
مینیجر ماہ نامہ "پونم"
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد 24

ترتیب

مطبوعہ۔ دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

نئی چٹھیاں

تحت آندھرا پردیش چٹ فنڈ ایکٹ بابتہ ۱۹۷۱ء

(اپنے تمام ارکان کو بیاگ ڈائری اور کیلنڈر کے خوبصورت تحفے دیئے گئے)

نئی چٹھیاں

250×40 = 10,000	500×20 = 10,000
125×40 = 5,000	250×20 = 5,000
100×30 = 3,000	100×20 = [illegible],000

ہماری آرزو ہے کہ یہ سال آپ کے لئے مسرت اور خوشحالی کا سال ثابت ہو ہم آپکے مستقبل کی تعمیر میں حسب معمول اپنے اشتراک و تعاون کا وعدہ کرتے ہیں۔ عزم ہو تو راستہ نکل ہی آتا ہے راسخ اور سچے ارادہ کیساتھ ہمارے نئے سال کی چٹ اسکیموں میں شرکت کا فیصلہ کر لیجئے اور عہد کیجئے کہ نئے عزائم کے ساتھ معاشی اعتبار سے استحکام حاصل کر کے رہیں گے۔ بولی کی حد نہیں۔ اس سے کوئی بھی ضرورت مند چٹھی کی رقم اپنی ضرورت کے وقت حاصل کر سکتا ہے۔ روپیہ لگانے والے کو زیادہ منافع مل جاتا ہے۔ انہیں خصوصیات کی بناء پر ہزاروں احباب نے ہماری "چٹ اسکیموں" میں شرکت کی اور یہی اس کمپنی کی مقبولیت کا ثبوت ہے اس کے علاوہ تعمیر مکانات کیلئے تا حد ۲۰ ہزار روپے قرضوں کی اجرائی کی بھی سہولت مہیا کرتے ہیں۔

دی حیدرآباد پبلک ویلفیر ہاؤزنگ کمپنی پرائیوٹ لمیٹڈ

برٹی روڈ، فرسٹ اسٹریٹ، فرسٹ بلڈنگ، حمایت نگر
حیدرآباد ۲۹

آبروئے ادب رشید احمد صدیقی

سلیم تمنائی

نیا سال آیا۔ نیک امیدیں لایا اور عمرِ رواں کی طرح ۱۹۷۷ء کا سال قدم قدم بڑھنے لگا۔ ابھی نئے کیلنڈر اور تقویم وغیرہ کی سیاہی سوکھی نہ تھی۔ ہنستے مسکراتے رہے تھے کہ پانچواں ہندسہ منہ بسور کر دھائیں دھائیں روتے اور رُلانے لگا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک سرسبز و شاداب ادب کا تناور درخت۔ ایک سدابہار پھول، جو انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں سوکھا اور نہ مرجھایا تھا۔ نئے سال کی ہوا نے قدرت کے حکم پر گرا اور مرجھا دیا۔ ابھی آنسو خشک نہ ہوئے تھے اور اس تعزیتی خط کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی۔ جسے طنز و مزاح کے شہنشاہ نے دُکھ کے ہاتھوں ڈاکٹر ہاشم قدوائی یعنی مولانا دریابادی کے بھتیجے اور داماد کے اپنے مخصوص انداز اور طرز میں ۸ جنوری ۷۷ء کو لکھا تھا (سلمہ) قدوائی صاحب! سلام مسنون کل اخبار میں مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم و مغفور کے سانحۂ رحلت کی خبر پڑھی۔ مرحوم کی وفات سے کتنی وہ طویل قیمتی اور نوع بہ نوع خدمات کی یاد تازہ ہو گئی جن پر مرحوم کی گرانقدر شخصیت اثر انداز ہوئی تھی۔ مذہب اور اخلاق، ادب، تنقید، معاشرت و صحافت کی کونسی وادیاں نہ تھیں جن سے مرحوم خوشی، خاموشی، سنجیدگی اور قابلیت سے نہیں گزر چکے تھے۔ گزشتہ نصف صدی سے اوپر مرحوم کو جو طویل اور زرّیں زمانہ ہمارے برّاعظم کی بہتیری جلیل، عظیم شخصیتوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ملا وہ شاید اب ہم کو نصیب نہ ہو۔ وہ ایک نشانِ منزل تھے جس کو انہوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستے میں بہت دور تک لاکر نصب کر دیا تھا۔ مرحوم کی علمی، مذہبی، ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔ مرحوم و مغفور اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کا معاملہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ہے لیکن ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے کہ مرحوم کی دینوی خدمات کا تفصیلی اور بطریقِ احسن جائزہ لیں تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی رہبری اور ہمت افزائی میں معاون ہو۔ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ محسوس ہوا جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے جیسا کچھ ہو اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دریاباد کے کسی اور کے حصہ میں شاید ہی آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کے غم میں شریک (رشید احمد صدیقی) ——"

اجزہ مولانا کو "نشانِ منزل" جیسے معتبر اور جامع الفاظ میں سب کچھ کہہ کر خود پندرہ جنوری ۷۷ء کو یہ سنگِ میل سوئے منزل چلا۔ طنز و مزاح نگار کا یہ بھی بڑا ستم ظریفانہ مزاح و بھرپور طنز تھا۔ علمی، ادبی و تعلیمی دنیا پر یا ممکن ہے مولانا پر طنز اور گلہ کرنے چلے گئے ہوں کہ ۱۰ دن مولانا … ! یہ بھی خوب رہی بزرگوں کی دوستی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ کم سے کم خدا حافظ ہی کہہ کر جاتے یا چاول پر قل ھو اللہ کی سی عبارت لکھ دیتے تاکہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہی عزمِ سفر باندھتے۔ ایک سے دو بھلے تھے۔ ہم ۸۱ برس کے ہیں یعنی ماں نے ہمیں ۱۸۹۶ء میں جنم دیا۔ آپ ۸۵ برس کے تھے ہو سکتا تھا کہ مروت اور پیار میں کچھ سال پورے کرنے کی تلقین کر دیتے یا کبھی باتوں میں "چٹکی" ہی لے لیتے۔ مگر محبت و مروت اور راست دوستی میں یہ فرق کوئی بڑا نہیں بلکہ انیس بیس کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔

راقم نے قیام علیگڑھ میں سنا تھا کہ دونوں میں بڑے اچھے اور گہرے روابط و مراسم

تھے۔ علی گڑھ جانا ہوتو ہمیشہ رشید صاحب کے
ہاں (بطور مہمان خاص) ہوتے۔ دل کے قریب
یا دل کو وہ حیثیت اختیار کر لیتے یا سمجھے جاتے
مولانا نے بھی ان کی کتابوں پر جو تبصرہ کئے
وہ اچھے خاصے تھے اور مانو حق ادا کر دیا تھا
انصاف کا' پسند کا۔

کچھ دن پہلے مولانا مرحوم نے اپنے
معمولات میں فرق گوارا کر صرف دوستی کی
خاطر جیسا کہ دارالعلوم ندوہ میں رشید صاحب
کا مقالہ بعنوان "عزیزان ندوہ کے نام"
پڑھا گیا تو آپ نے اس اجلاس کی صدارت
فرمائی اور تقریر بھی کی (رسالہ تقریر
دلپذیر ایک مرد گویا کی بھی آپ کے سامنے
ہونے کو ہے اس جلسے کی صدارت کے لئے
آپ نے انتخاب کیا خوب ایک گونگے کا
کیا ہے۔ میں ایک گوشہ نشین۔ خیر قلم کا
گھسنا تو کچھ تھوڑا بہت جانتا بھی ہوں لیکن
زبان آج تک نہ چلانا آیا، نہ ہلانا آئی
یہ صدارت تو آپ نے زبردستی ٹھونس دی
ہے۔ ایسے مولانا علی میاں اور مولانا ادریس
نگرامی کی عین ستم ظریفی نہ کہوں تو کیا کہوں۔
صدیقی اتنی تھی۔ سیرتیں اتنی پاکیزہ لیکن
جب زندہ دلی کا شگوفہ چھوڑنے پر آتے تھا
تو اچھے اچھے دل لگی بازوں کو نیچا کر دکھائیں۔
عجب نہیں کہ یہ معنوی تصوف خود جناب
رشید کا ہو۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے
متعلق فرمایا۔

"میں اس مقالے کا عنوان مقرر کرنے
کا مجاز ہوتا تو رکھتا۔" علی گڑھ کا پیام ندوہ
کے نام"۔ رشید صاحب نمائندہ علی گڑھ کے
آپ کا مجلس نائب و نمائندہ ندوہ کی۔
علی گڑھ اور ندوہ کے درمیان نہ وہ بیگانگی
ہے نہ وہ دوری جو فرض کر لی گئی ہے۔ راہیں
الگ ہیں۔ درمیانی منزلیں بھی الگ۔ لیکن
دونوں کی ایک منزل مقصود۔ اور وہ
ہے ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود۔ فرق
صرف اتنا کہ ایک نے لیڈر شپ کو اپنایا۔
دوسرے نے اپنا دل محراب و منبر سے اٹکایا۔
پیام دینا نمائندہ کا کام تھا۔ وہ خوش
ہو کہ آج ایسے دوسرے کا پیام سننے کی
توفیق ہو رہی ہے۔ "گفتہ حق" سے کچھ کم
نعمت یہ "شنود حق" کی بھی نہیں —
مقالہ کو شروع سے آخر تک سن لینے کے بعد
کس میں ہمت رہ جائے گی جو علی گڑھ کو
مخاطب کر کے کہہ سکے۔ الیس منکم
رجل رشید" (علامہ دریابادی) از
مولانا سید شرافت علی ندوی) صدق جدید
۲۶ اگست ۱۹۷۷ء)

رشید مرحوم اپنے دوستوں کی علالت
وغیرہ سے گہرے متاثر ہو جاتے تھے اس سلسلے
میں ایک واقعہ میرے سامنے ہے۔ علیگڑھ
میں جب دوسری بار ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ
"آپ کل تشریف لائیے۔ کھل کر باتیں ہوں گی"
لیکن دوسرے دن ہم جب شوق کے پر لگا کر
چلے گئے آپ کے مکان اور دستک دی تو
وائے نصیب ہا! آپ کے مزاج دشمناں
خراب تھے۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر مسعود
حسین خاں صاحب نے بتایا کہ رشید صاحب
کے ایک عزیز دوست سخت علیل ہیں جس کا
اثر کچھ ایسا قبول کیا ہے کہ خود بیمار ہو گئے۔

اب مولانا کے وصال اور ان سے رشید
صاحب کے دیرینہ مراسم اور دوستی کا تقاضہ
یہ تھا کہ یقیناً اس کا گہرا اثر قبول کرتے اور
کیا بھی، ویسے موت کا ایک دن معین
ہے۔ انسان ظاہری شواہد کے بل بوتے
کچھ نہ کچھ ضرور اظہار خیال کرتا ہے مگر اصل
حقیقت بہر طور خدا ہی جانتے۔

شاید ہی کوئی بدنصیب ہو گا جس نے
آپ کو پڑھا اور پسند نہ کیا ہو۔ وہ اپنے
فن میں سر فہرست، انداز نگارش منفرد۔
اپنے طرز کے آپ بانی تھے۔ موجد تھے۔
اور اس ابتدا کے ساتھ اول و آخر انتہا بھی۔
اپنے پسندیدہ طنز و مزاح نگاروں میں آپ
اور فلک پیما کچھ زیادہ ہی پسند تھے عبدالعزیز
خاں فلک پیما" معا بنِ فلک پیما چھوڑ،
دنیا سے جلد ہی اٹھ گئے۔ ایک آدھ انتقاد
کے سوا ان کا نام بہت کم بزرگوں کو یاد رہ
گیا ہے۔

رشید صاحب ایک اچھے انسان بھی
تھے اور انہوں نے "ہمیشہ اچھا انسان اچھا
ادیب" پر زور دیا۔ ویسے اس نظریے
سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس سے
کلی طور پر اور اس کی عظمت و بڑائی سے

انکار ناممکن تھا۔ مولانا ماجد اور رشید صاحب دونوں کی ذات اس کی بہترین مثال تھی۔

رشید احمد صدیقی سے پہلی ملاقات

کا پہلا موقعہ ۱۹۵۸ء میں ملا۔ جامعۂ اردو علی گڈھ کے دفتر میں سید ظہیر الدین علوی (اللہ کروٹ جنت عطا فرمائے۔ آمین) سے ملاقات ہوئی۔ بڑے سیدھے سادے اور اچھے انسان تھے آپ سے بھی میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے تپاک سے ملے وہاں سے مجھے یونیورسٹی لے گئے اور شعبۂ اردو بھی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب جناب زبیر صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی، نسیم قریشی اور ہمارے دوست احمد شریف صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ رشید صاحب آرام کرسی پر آرام فرما تھے (سلہ راقم نے رشید صاحب سے اس ملاقات کی ساری دلچسپ تفصیل بعنوان "ایک ادبی ملاقات" ہفتہ وار ایشیا دہلی ۶۲ء میں دی تھی) دنیا جہاں کی باتیں ہو رہی تھیں احمد شریف صاحب بجو، رشید صاحب کی دائیں جانب بیٹھے تھے، صاحب موصوف سے ایک سوال کر ڈالا، رشید صاحب نے مسکرا کر اہل مجلس کے سامنے اس سوال کو رکھ سب کو سوالیہ نشان بنا دیا۔ بھئی ہمارے یہ میسوری دوست دریافت کرتے ہیں کہ علی گڈھ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ کوئی بتائے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے میری طرف مسکرا کر احتیاط برتتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! میں بس اتنا جانوں کہ علی گڈھ کا نام کول تھا۔ رشید صاحب بولے، بھئی ایک لطیفہ سنیئے!

اب ساری محفل ہمہ تن گوش ہو گئی جیسے نانی اماں نے بچوں سے کہا ہو کہ پیارے بچو! لو ایک مزیدار کہانی سنو۔

"بھئی کسی زمانے میں ساغر نظامی صاحب اپنے نام کے آگے علیگ لکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا "حضور! آپ نے علی گڈھ یونیورسٹی میں پڑھا تو نہیں، پھر یہ علیگ؟ کیا معنی؟ اس پر ساغر صاحب نے جواب دیا کہ بھلے ہی وہ علی گڈھ یونیورسٹی میں نہ پڑھے ہوں مگر ان کی بود و باش علی گڈھ ہی میں ہوئی ہے۔"

اب یار لوگوں نے پوچھا کہ علیگ کی بجائے کول یا کولی کیوں نہیں؟

سارے لب تبسم سے آشنا ہو گئے اور میں نے اپنی آٹوگراف بک سید ظہیر الدین علوی کے ہاتھ تھما دی۔ مانو وہ بک نہیں گھنٹی ہو جو بلی یا بچے کے گلے میں باندھنے کے لئے دی ہو۔ کیونکہ عہد ہنوز آف لارڈ [illegible] سے بزرگوں اور نوجوانوں نے [illegible] ذات کو ہوا بنا کر اسکے دوش پر دھر دیا اور ہوا کا کام یہ ہے کہ خوشبو ہو یا بدبو، سارے عالم میں پھیلا دے ان محترم کا یہ معجزہ شاید اس لئے تھا کہ اللہ کے سوا کسی [illegible] نہ ہو سکے۔

(سلہ پروفیسر سروری صاحب میسور سے حیدرآباد لوٹ گئے تو اردو پروفیسر کی کرسی خالی ہو گئی۔ ایکسپرٹ کی حیثیت سے پروفیسر رشید صدیقی اور آل احمد سرور کو میسور یونیورسٹی نے مدعو کیا۔ آخر اور نیوی کا انتخاب عمل میں آیا۔ وہ بدقسمتی سے نہ آسکے اور بے چاری کرسی (یہ چار کرسی فرمنلہ کی طرح اس کرسی کو کچھ نفل کا درجہ ہی دے رکھا تھا یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے) پر براجمان ہونے کے حقوق اس طرح میسر کر سیر و تفریح میں دونوں بزرگ چند خواص کے ساتھ مشغول رہے کوشش کے باوجود یہ معترضان دونوں بزرگوں سے مل نہ سکا۔ جس کے نتیجے میں پروفیسر اعجاز حسین مرحوم کے وہ خطوط بھی نہ پہنچا سکا جو ان دونوں بزرگوں کے نام تھے۔ اس سفر کا ایک بہترین نتیجہ میرے اپنے خیال میں سہیل مرحوم کا "ذکر اس پری وش کا" والا مضمون ہے جسے انہوں نے "ترقی" میں لکھا۔)

علوی صاحب نے آٹوگراف بک رشید صاحب کے سامنے کرتے ہوئے میری طرف اشارہ کر (اور ہم اس وقت خواہ مخواہ جھینپے سے تھے) فرمایا۔ سلیم صاحب میسور سے آئے ہیں آپ سے ملنا اور آٹوگراف لینا چاہتے ہیں "شاید اب نہیں؟" یوں سوال کر کے میری غلط فہمی دور کیا طنز و مزاح میں اضافہ نہ کیا بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے پوچھا۔ "اچھا تو آپ میسور سے آ رہے ہیں؟"

غنیمت ہے ایک نہ شد دو شد والا فقرہ

نذر کس دیا۔ کیونکہ ہمارے دوست احمد شریف خاں بھی ساتھ تھے میری آٹوگراف بُک اپنے ہاتھ سے لیا۔ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا۔

بھئی! آپ تو میسور سے آرہے ہیں۔ ٹیپو سلطان کی سی کوئی بات لکھنی چاہیئے" کچھ سوچ کر اقبال کا یہ شعر لکھ، دستخط کر دیئے ؎

ترا اگر زور بازوئے تیغ آں باقیست
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقیست

رشید صدیقی

۱۵ اپریل ۱۹۵۸ء

جب میں مصافحہ کرکے باہر نکلا تو میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل رہا تھا کیونکہ سارے خدشات کے شیشے چُور تھے۔ اپنے سہمے سہمے رہنے والے فعل پر پیچ و تاب ترس آیا اور ہونٹوں پہ تبسم۔ بڑا آدمی آئینہ ہوتا ہے لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنا سراپا دیکھ آئینے کے خدوخال سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ایک محترم بزرگ، نیک و برتر انسان اور ایک مخلص استاد سے مل کر میں لوٹا تھا۔ شاداں شاداں، فرحاں فرحاں۔

دوسری بار علی گڈھ پہنچا تو ڈاکٹر صاحب اور رشید صاحب کو دُور سے دیکھنا نصیب ہوا۔ ملنا نہیں۔ اس کی وجہ طلبا و طالبات کا ساتھ تھا اور ان کے امتحانات۔ البتہ اسے اتفاق ہی کہیئے کہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے دولت کدے پر ملاقات ہوگئی تھی (سلسلہ قومی یکجہتی اور کرناٹک مطبوعہ کوثر (۷۰ء) ملاحظہ ہو)

تیسری بار ہم گڈھ پہنچے تو عزیزی میر محمد اور حافظ محمد عبد اللہ حیدرآبادی بھی میرے ساتھ تھے۔ میں عازم سفر ہونے سے پہلے محترمی ایم اے قادر صاحب کے علی گڈھ کے سفر کی بات بتائی تو آپ نے خواہش کی کہ سیپی اور شہد رشید صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں۔ میں نے ہاں کر دی۔

رشید صاحب کے مکان پہنچ کر ہم نے دستک دی۔ آپ کے ایک رشتہ دار شاید کھانجے تھے (جن سے آپ کا تعارف جن لکچرر صاحب کے حسنِ توسط سے ہوا تھا۔ میں انھیں ان کے زمانہ طالب علمی سے ہی جانتا تھا۔ ان کے وطن آگرہ جانے، ان کے ہاں قیام کرنے اور ان کے خلوص و مہمان نوازی سے نوازے جانے والی حسین یاد میرے دل میں پتھر کی لکیر بن کر رہ گئی تھی۔ برسوں کے بعد میں نے انھیں دیکھا اور آگے بڑھ کر ان سے تپاک سے ملا تو انھیں بڑا تعجب ہوا۔ بولے "یہی بات آپ لوگوں (جنوبی ہند کے) کی قابلِ تعریف ہے کہ برسوں بعد بھی کسی کو نہیں بھولتے۔" واقعی جنوب میں یہ تعجب کی بات نہیں۔)جن سے ایک دن پہلے کیمسٹری کے ایک شناسا لکچرر کے توسط سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں مل گئے۔ اور اندر خبر کر دی۔ رشید صاحب قبلہ باہر تشریف لائے۔ ہم نے مصافحہ کیا اور قادر صاحب کے بھجوائے ہوئے تحائف آپ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اور بند لفافہ بھی (ہمیں شاید والد مرحوم کے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ کسی چھٹی پتری دو تو لفافہ بند نہ کرو! یہ شرافت کا تقاضہ اور دوست پر بھروسے والی بات ہے) لفافہ چاک کرتے ہوئے پوچھا "کس نے بھیجا ہے؟" ہم نے جواب دیا! قادر صاحب نے!

"کون قادر صاحب؟" پھر سوال ہوا۔

ہم نے جواب دیا۔ "آپ کے شاگرد ایم اے قادر ایم اے۔"

اچھا تو وہ زندہ ہیں؟ رشید صاحب نے مسکرا کر یوں پوچھا مانو اپنے ماحول کی پروردہ ماں پیار سے اپنے بچے کو شیطان کہے۔

"آمنہ خاتون کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی"

"اُن کے اردو ڈپارٹمنٹ سے جھگڑے ابھی ہیں! رشید صاحب نے سوال کیا اور ہم جواب میں صرف مسکرا کر رہ گئے اور شاید یہ بہترین جواب تھا۔ ہماری اپنی دانست میں۔ کسی محترم کے "آپ بڑے وہ ہیں!" جیسے میٹھے بول سے بہتر۔ جو اندر سے کڑوے ہوتے ہیں۔ ہم بھی بہت کچھ کہنے کی خطا سے اس طرح صاف بچ گئے۔

باقی
ستمبر ۷۱ء کے شمارے میں
ملاحظہ فرمائیے

قدیر امتیاز

وقار خلیل
تاریخی و تہذیبی ورثے کا شاعر

وقار خلیل کی شاعری کا محور و مرکز تاریخ و تہذیب رہا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران جو حقیقت ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ وقار نے تاریخ و تہذیب سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا ہے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ دنیا میں جو مد و جذر ہوتے رہے ہیں اس کا ارتعاش ان کی شاعری میں سنائی پڑتا ہے وقار نے دنیا، عالمی انسان برادری، ملک، معاشرہ قوم، تاریخ، تہذیب اور انسانی اقدار سے اپنے جذباتی لگاؤ کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیا ہے اور ان وسیلوں سے زندگی کو دیکھا اور پرکھا ہے وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں۔

"میں نے زندگی کو بالکل اسی طرح جانا اور پہچانا ہے جیسی کہ وہ ہے۔ اپنی شاعری کا میں اسے برتنے کے باب میں بھی احتیاط پسندی کو راہ دی ہے۔ اپنے دور کی سچائیوں، غموں اور آرزوؤں کو فکر کا موضوع بنایا ہے شاعری کا افق میرے اور آپ کے معاشرے سے عبارت ہے۔ انسانی اقدار کی شکست و ریخت پر فنکاروں کی طرح میں نے بھی جرأتِ اظہار کا مظاہرہ کیا ہے۔"

وقار امن و آشتی کے شاعر ہیں اور ظلم و تشدد کے دشمن ہیں اس لئے جب دنیا میں ظلم ہوتا ہے تو ان کے اندر چھپا ہوا انسان چلا اٹھتا ہے۔ یہ ظلم چاہے ویت نام میں ہو یا دنیا کے کسی کونے میں ہو انہیں قرار نہیں آتا ہے۔ وہ عالمی امن کے حامی ہیں اور خوش گوار فضا کے متمنی ہیں وہ تخریب کاری کو قوتِ بد دیانتی سمجھتے ہیں اس لئے لوگوں کو تعمیر کا پیغام دیتے ہیں ان کیفیات کو لئے انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں "ویت نام" "روشن افق" اور "دریچے کھول دو سائے" قابلِ ذکر ہیں۔ غزلوں میں بھی یہ موضوعات در آئے ہیں ؎

میرے معبود جو تو چاہے تو آجائے بہار
اک بھرے گھر کو خرابہ نہ بنایا جائے
چشمِ تاریخ میں روشن تو ہے انسان کا وقار
اور ادھر لوگ بضد ہیں کہ بجھایا جائے

موجودہ دور میں اخلاقی و تہذیبی اقدار جس طرح پامال ہوتے جا رہے ہیں اس کا وقار کو شدید احساس ہے اور اس بات کا بڑا ملال ہے کہ اب یہ باتیں کتابی ہوتی جا رہی ہیں اور عملی زندگی سے اپنا علاقہ کھو رہی ہیں۔ اخلاقی باتوں کو آج کا انسان ایک طرح کی کمزوری سمجھنے لگا ہے۔ ایک طرف سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ انسان آسمان پر کمندیں ڈال رہا ہے اور دوسری طرف وہ انسانیت سے کوسوں دور ہوتا جا رہا ہے نظم "آنکھ سوچتی ہے" میں انسانی تہذیب کے اس المیہ کو انہوں نے بڑی خوبی سے نظم کیا ہے خاص طور پر نظم کا آخری حصہ کرب سمیٹے ہوئے ہے۔

نئی تہذیب کی بے اعتدالیوں کو بھی وقار نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ نئی تہذیب کی چکا چوند روشنی نے اہلِ مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ مشرقی تہذیب کی روشنی سے محروم ہو گئے ہیں جو ان کا اپنا تہذیبی ورثہ ہے۔ نئی روشنی کی تمازت سے آنکھوں کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے اور اس دور میں صحیح روشنی کی تلاش مفقود ہوتی جا رہی ہے کچھ اسی طرح کا احساس وقار کی نظم "آرزو ایک واہمہ ٹھہرے" سے ہوتا ہے اور اسی ہی قبیل کی ایک اور نظم "تہمتِ بینائی" ہے جس میں مغربی تہذیب کی کورانہ اور اندھی تقلید پر طنز کیا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس نقالی میں ہم اپنی اصلیت کھوتے جا رہے ہیں وصف تو اپنا باقی رہ گیا ہے چہرہ کسی اور

کا دکھائی پڑتا ہے۔

وقار نئی نسل کے بے حسی سے نالاں ہیں نئی نسل زبان و تہذیب کے ورثے سے جس طرح اپنا ناتہ توڑ رہی ہے اور اسلاف کے کارناموں کو بھلاتی جا رہی ہے وہ قوم کی بدبختی کا المیہ ہے۔ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنے اسلاف کے کارہائے گراں سرمائے کو سینے سے لگائے رکھتی ہیں اور جن کے سینے ان کے مخزن بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "مخطوطہ" میں نئی نسل کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

قدیم بوسیدہ کاغذوں کے کتاب خانے
میں جاکے دیکھو
تمھاری تہذیبِ رفتہ خود تم پہ طعنہ
زن ہے
کہاں ہو تحقیق کرنے والو!
وہ ایک قلمی بیاض ہیں پر تمھاری ناقدریوں
کے کیڑے
خود آج تم پر ہی خندہ زن ہیں
ذرا تو ان کی زبان سمجھو
وہ عہدِ رفتہ کی ان کہی داستاں کے
صفحات کی جبیں سے
اندھیری راتوں میں چپکے چپکے
سحر کا غانہ چرا رہے ہیں
وہ ایک قلمی بیاض جس کے ہر اک ورق
پر ہیں داغ لاکھوں
انھیں مٹاؤ!
اور اگلی نسلوں کے کارناموں کو
تم نئی روشنی میں لاؤ

وقار نئی نسل سے پوری طرح مایوس بھی نہیں ہیں۔ اسی مایوسی کے عالم میں بھی انھیں اُمید کی کرن دکھائی پڑتی ہے نظم "بازیافت" میں وہ اپنے بیٹے کو نئی نسل کا نمائندہ سمجھ کر امید کرتے ہیں کہ وہ اس تاریخی و تہذیبی ورثے کی بازیافت کرے گا جسے نئی نسل نے بھلا دیا ہے اسی قبیل کی ایک اور نظم "صبح کا ہیرا" میں اپنے فرزند سے بڑی امید و آس لگائے کہتے ہیں ؎

مرا لڑکا بساطِ دہر پر شمعِ یقیں بن کر
شبِ تیرہ کی وادی سے سحر آسا طلوع ہوگا
مرا لڑکا عقیق: انگشتری میں صبح کا ہیرا

انسانی بغض و عناد، تنگ نظری، تعصب اور مذہبی منافرت کو وقار نے اپنی نظموں میں ہدفِ نشانہ بنایا ہے اس ڈھنگ کی دو نمائندہ نظمیں "کس کو ہند یاد گے" اور واسوخت ہے۔ "واسوخت" میں یہ طنز کہیں کہیں گہرا ہو چلا ہے۔ شہر آشوب کی طرح اس نظم میں تباہی، بربادی اور ابتری کے مرقعے ملتے ہیں۔ خاص کر اس نظم کا آخری حصہ توجہ کا طالب ہے ؎

اور پھر یوں ہوا
آپ کے شہر میں
خواب کے شہر میں
کچھ ہوائیں چلی، آگ اڑنے لگی
رہ گزر، موڑ، کانونیاں سب کی سب
دیکھتے دیکھتے خاک کا ڈھیر تھیں

اور کچھ دور اک ادھ جلے پیڑ پر
فاختہ اپنے آنسو بہانے لگی
جاگتا شہر یوں مرثیہ بن گیا۔

وقار کے یہاں انسانی بے بسی کا احساس بھی پایا جاتا ہے "شبابِ تار تار میں" اور "انسان بیچارا" اس ہی کم مایہ پیر محیط ہیں لیکن انھوں نے انسان اور اس کی تسخیری صلاحیتوں سے انحراف نہیں کیا ہے ان کے یہاں انسان کی عظمت کا احساس بڑی شد و مد کے ساتھ ملتا ہے۔ "یزداں بہ کمند آور" میں انسان اور تسخیرِ کائنات" کے موضوع کو بڑی فنی کارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ آدم سے پُر امید ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کائنات کو مسخر کرنے والا ہے اس کے حوصلے اور عزائم بلند ہیں اس سلسلے میں نظم "نیا آدم" کا بھی نام لے سکتے ہیں ؎

ہلکی پھلکی نازک چڑیا
اپنے قفس کے دروازے کو
نرم طلائی چونچ سے جھٹکے اور جھنجوڑے
اے سونے کی نازک چڑیا
آزادی کی آس نہ کھونا
دنیا بھی ہے آس لگائے
کون قوی؟ فولاد کہ سونا

وقار خلیل کی جمالیاتی حس غضب کی ہے ان کی رومانی نظمیں پڑھیئے کہ غزلیں، ان کا حسنِ جمال فنکاری کے ساتھ ساتھ چلتا ہے ان نظموں اور غزلوں میں ان کی فنکارانہ نزاکتیں صاف دکھائی پڑتی ہیں۔ ان کے رومانی لہجے میں

جہاں کلاسیکیت کی خوشبو ہے وہیں جدید
حسیت بھی جگہ پائی ہے۔ الفاظ کی در و بست
تشبیہات و استعارات کی آرائش، ان نظموں
و غزلوں کا خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ امیجری
کے وصف سے بہرہ ور ہیں اور بڑے خوب صورت
پیکر تراشتے ہیں ؎

اے بنتِ شجر
تقدیسِ وفا
خلوت میں ردائے شبنم شب
جلوت میں رداے صبحِ رواں
گلشن میں بہارِ آوارہ
محبوبۂ گل کا شہ پارہ
نسرین کا چلن، چمپا کی ادا
لہجے میں وفا کی خوشبوئیں
عارض پہ جمالِ صبحِ اودھ
قدموں میں بنارس کی شامیں
پلکوں کے جلو میں تجسمِ سحر

(بنتِ شجر)

ان کی کامیاب نظموں میں نور جبین
کائنات، لینن کی جناب میں، شہرِ ملن،
بنتِ شجر، اردو، سونے کی چڑیا، مخطوط
مدرسہ گر گیا اور یزداں بہ کمند آور کا شمار
کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حمد بھی خوب
کہی ہے۔ ساری حمد خلوص میں ڈوبی ہوئی
ہے۔ ان کی کامیاب غزلوں میں ہر تارِ نفس
شعلہ بدن شعلہ بجاں ہے، وہ ایک
شخص جو تنہا دکھائی دیتا ہے، اب کفر زیاں ہے
نہ اسلام بہت ہے، قتلِ حجاب ہے ہنگامہ
بپا ہو جائے۔ ان غزلوں کو اردو شاعری کی بہترین
غزلوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ویسے
ان کی غزلوں پر نظمیں بھاری ہیں میں انہیں
نظم کا شاعر سمجھتا ہوں۔ نظم ہی ان کی شاعری
کی پہچان بن سکتی ہے وہ غالب، اقبال،
مخدوم اور فیض سے متاثر ہیں۔ انہوں نے
اقبال سے تراکیب و شعری وقار، غالب سے
لہجہ، مخدوم سے انقلابیت اور فیض سے
رومانیت لی ہے اور ان سب کو شعری سانچا
میں گوندھنے سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے
وقار نے کم و بیش زندگی کے
ہر مسئلہ پر لکھا ہے اور کھل کر لکھا ہے وہ
صرف حالات کے تماشائی نہیں ہیں ان کے
یہاں مورخ کی نگاہ اور مبصر کا شعور ملتا
ہے اس لئے ان کے شعری پیکروں میں
زندگی دل بن کر دھڑکتی ہے۔ وہ شاعر کے
وصف سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس لئے
معاشرے اور ماحول کے ناسوروں پہ نشتر زنی
بھی کرتے ہیں۔ زندگی ان کے یہاں محدود
نہیں ہے وہ اس کی وسعت کے قائل ہیں
وہ فرد اور معاشرے کے ربط کو ناگزیر
سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا درک
اور فن کاری کی دروں بینی ہے وہ شاعری
کو تفریحِ طبع نہیں بلکہ قومی ورثہ سمجھتے ہیں
اور شاعر کو اپنے وقت کا نقیب جانتے ہیں
وہ شاعری کو موقتی نہیں بلکہ ابدی شئے
سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں ادب کے تہذیبی
ورثے کا احترام ہے۔ وہ فن کو عزیز رکھتے
ہیں اس لئے ان کے یہاں فنی التزام پایا
جاتا ہے وہ شاعری کی مقصدیت کے قائل
ہیں اس لئے اپنی شاعری میں صالح شعری
روایات کو جگہ دی ہے اور اکثر ہیئت پہ
مواد کو ترجیح دی ہے۔ ان کی شاعری تاریخی
و تہذیبی ورثے کی بازیافت ہے جو نئی نسل
کا رشتہ تاریخ و تہذیب سے جوڑتی ہے ■

بقیہ:

صلیب پہ لٹکتی زندگیاں

بائیں پسلی سے قدرت کے ہاتھوں وہ تشکیل پائی ہے
آئے گا اور اُسے اپنی جیون ساتھی بنا کر اپنے دامن سے
اُسکا آنچل باندھ لے گا۔ اس دور میں وہ اکیلی نہیں۔
کئی ریتوا اس زمین پر اسی اُمید کو اپنے سینے سے لگائے اپنی
بڑھتی ہوئی عمر کا ماتم کئے بغیر جی رہی ہیں۔ زندگی کی
صلیب پر لٹکتی ہوئی یہ لڑکیاں ایک تلخ حقیقت
کی نقیب ہیں۔ حالات کے اشاروں پر ناچنے
والی کٹھ پتلیاں! ایک اہم سماجی مسئلہ کا نفرت
انگیز رُخ!! جس دن ریتوا کی شادی ہوگی
وہ دن اُس کے لئے یومِ نجات ہوگا۔
ریتوا اگلے سال ستائیس[27] سال کی
ہو جائے گی۔ اُسے کوئی لڑکی نہ کہے گا۔ لڑکی
نہ سمجھے گا۔ وہ عورت کہلائے گی۔ لیکن وہ
مایوس نہیں ہے۔ اُسے یقین ہے کہ اُس کی شادی
ہوگی۔ اور ضرور ہوگی! یہی یقین اُس کی زندگی
ہے! اگر اس سے اس کا یہ یقین چھن جائے تو وہ
ایک چلتی پھرتی لاش بن کے رہ جائے گی!

آمنہ ابوالحسن

دھوپ بال کھولے آنگن میں کھڑی ہے
اور زندگی کے گھنیرے درخت سے
گزرے ہوئے دن
سوکھے پتوں کی طرح ٹوٹ رہے ہیں
آنے والے دنوں کے ننھے قافلے
شاداب شگوفوں کی طرح
خالی جگہوں پر پھوٹ رہے ہیں
سڑک بے چاری صدیوں سے خاموش
قدموں کو راہ دے رہی ہے
مگر! ہوائیں نئے نئے سندیسے لے کر
جیسے سرگوشی کرتی ہوں
ہوشیار، خبردار، ساودھان....
کہ ہوگی اگر چوک ذرا بھی
لاعلمی نگل جائے گی تم کو
اور پھر دھوپ
آنگن میں نہ آئے گی کبھی ــــ

رُباب جعفری

خودسر و تیزگام انساں

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے
نئی سحر کی ہے یہ بشارت
نہیں ہے تقدیر پر بھروسہ
عمل کی دنیا ابھر رہی ہے
فرشتے سہمے کھڑے ہیں کہ
خودسر و تیزگام انساں
جہانِ نو کی تلاش میں ہے
وہ چاند تاروں میں اپنا مسکن بنا رہا ہے
فضائیں مصرف میں لا رہا ہے
نہ وہ ہراساں بلندیوں سے
نہ خوف کھاتا ہے پستیوں سے
ہوائیں قابو میں کر رہا ہے
سمندروں پہ ہے حکمرانی
جہاں سے موتی نکالتا ہے
زمیں کے سینے میں اس کی دولت چھپی ہوئی تھی
وہ دستِ انساں میں آ گئی ہے
رہے گی جذبوں میں گر صداقت
یہ آسماں و زمیں ہیں اس کے

مہدی پرتاب گڑھی

(ضلعات کی دین)

زندگی پھر مرثیہ خواں ہے، کھلے سر دیکھئے
ہر طرف ملتے ہیں خوں آشام منظر دیکھئے
ہر نفس منت کش احساں ہوا کیوں سوچئے
آج کا انسان ہے کتنا سبک سر دیکھئے
ایک اک چہرہ ہے مایوسی کا صحرائے عظیم
ہو گیا خشک ان کی آنکھوں کا سمندر دیکھئے

خار کی مانند پائے زیست میں چبھتے نہیں
زندگی میں کیا مزہ ہے پھول بن کر دیکھئے
ایک اک چہرہ بنا ہے درد و غم کا اشتہار
کرتا ہے سب کو مخاطب مجھ کو پڑھ کر دیکھئے
اپنی محنت سے کھلا دیتے ہیں صحراؤں میں پھول
گھر پہ ہم رکھ کر نکلتے ہیں مقدر دیکھئے
نوچنا چاہیں اگر اپنوں کے چہروں سے نقاب
اک ذرا اپنے کو دیوانہ بنا کر دیکھئے
کیا خبر کب اپنے ہاتھوں سے ہی کر لے خودکشی
ہاتھ میں تہذیبِ حاضر کے ہے خنجر دیکھئے
آپ کے محلوں میں تو نغمہ سرا ہے زندگی
اک ذرا اونچی فصیلوں سے بھی باہر دیکھئے
ایک میں ہی تو نہیں ہوں اجنبی اس شہر میں
آ گئے ہیں اس طرف کتنے ہی بے گھر دیکھئے
کس قدر بدلا ہے مہدی آج اقدارِ حیات
پھول جن ہاتھوں میں تھا اب ان میں خنجر دیکھئے

نصیر پرواز

مسئلے فکر و نظر کے جتنے پیچیدہ ہوئے
سارے ہی کردار افسانوں کے نم دیدہ ہوئے
جل گئے ہیں خواب بچپن کے زمانے ڈھل چکے
آئینے بھی سامنے آئے تو سنجیدہ ہوئے
دھیرے دھیرے سب سمٹ آئے ازل کی گود میں
مشغلے عہدِ جنوں کے ہی پسندیدہ ہوئے

لے گئی آندھی اڑا کر ان جزیروں میں جہاں
قرب کے ویران لمحے غیر طلبیدہ ہوئے
بخت کی محرومیوں نے نوچ ڈالے بال و پر
آسمانوں کے بلاوے جب پسندیدہ ہوئے
میرے چہرے پر لکھا ہے آج بھی بچپن کا نام
دیکھ کر احباب مجھ کو کتنے رنجیدہ ہوئے
صرف اتنی بات پر دنیا نے رسوا کر دیا
حادثوں کے درمیاں ہم پیکر دیدہ ہوئے
دفن کر آئے انھیں صدیوں کی اندھی قبر میں
بجھ گئی تحریرِ غم اوراق بوسیدہ ہوئے
پچھلے موسم میں تو کام آتا تھا خونِ آرزو
اس برس پتھر بھی مجھ کو چھو کے نم دیدہ ہوئے
کیسے کیسے حادثے دل میں اتر کر کھو گئے
کیسے کیسے لوگ ان آنکھوں سے پوشیدہ ہوئے
رات میں باقی نہیں پرواز اسرار و رموز
شام آئی اور سارے شہر خوابیدہ ہوئے

اسلم شیخ

اگر بہار بھی آتی ہے آج کل لو
تو کس کے گھر میں سماتی ہے آج کل لو
غلط کہ گرد فقط آندھیاں اڑاتی
صبا بھی خاک اڑاتی ہے آج کل لو
خزاں تو خیر مسلسل جراحتِ دل
کسے بہار بھی بھاتی ہے آج کل لو
بنام قند و بنام شرابِ انگور
حیات زہر پلاتی ہے آج کل لو
نظام عصر کے سازوں کی مدھ بھری آ
مجھے تو خون رلاتی ہے آج کل
بہ فیضِ سازشِ گلشن بہار لالہ و گ
لہو سے روز نہاتی ہے آج کل ا
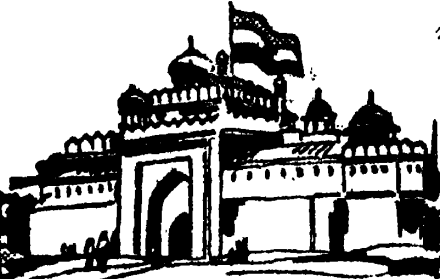
بھارت بھاگیہ ودھاتا
15 اگست 1947 کو ہم بھارت کے لوگ اپنے مقدر کے مالک، (بھارت بھاگیہ ودھاتا) خود بنے۔
آیئے آزادی کی 32 ویں سالگرہ پر آج :۔
★ اپنی کامیابیوں سے قوت اور تحریک حاصل کریں۔
★ مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تازہ دم ہو کر کام کریں۔
آزادی کے 32 برسوں میں .....
★ ہم نے سب بیرونی حملوں کو پچھاڑ کر ملک کی سالمیت کی حفاظت کی ہے۔
★ ہماری متوقع اوسط عمر 32 سے بڑھ کر 52 سال ہوگئی ہے۔
★ ہم نے اناج کی پیداوار دوگنی سے بھی زیادہ بڑھالی ہے۔
★ ہماری صنعتی پیداوار میں چار گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
★ ہمارے بدیشی سکے کے ذخائر 5,000 کروڑ روپے سے زائد ہیں۔
" قوم بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ ہماری معیشت جو جامد اور دوسروں کی دست نگر تھی جدید اور خود کفیل بن گئی ہے " یہ ہمارے رواں پانچسالہ منصوبے کے ڈرافٹ کا اقتباس ہے۔
آزادی اور خوشحالی کی خاطر اتحاد اور یکجہتی قائم رکھیں۔
davp 79/184

ایس۔ ایم۔ حیات

(افسانہ)

صلیب پر لٹکتی زندگیاں

ریوا اپنے بستر پر چت لیٹی دیوار
آویزاں گھڑی کو پلکیں جھپکائے بغیر
دیکھے جا رہی تھی، گھڑی کی سوئیاں بارہ
بجانا چاہتی ہیں۔ آدھی رات کا سناٹا اور
گھڑی کی ٹک ٹک۔ ریوا کے دل کی دھڑکنیں
تیز تر ہونے لگیں۔ چہرے پر اضطراب اور
پریشانی کے تاثرات ہویدا ہیں۔ اس کی
بوڑھی ماں اپنی چارپائی پر سمٹ کر گٹھری بنی
پڑی سو رہی ہے۔ اسے جیسے سب کچھ
برداشت کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔
مشکل اب اس کے لئے آسان ہو گئی ہے
لیکن ریوا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ اس
کی سانسیں بھی پھولنے لگی تھیں جیسے وہ
میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو، گھڑی
اب کوئی دم میں بارہ کے گھنٹے بجائے گی اور
فضا میں تیرتی آواز کی لہروں کی گونج کے
ختم کے ساتھ ہی ریوا آج چھبیس سال کی
ہو جائے گی۔ چھبیس طویل سال! وہ
ایک چونک سی اٹھی۔ کسی ان دیکھی قوت
نے جیسے اس کی پشت میں چھرا گھونپ دیا ہو
گھڑی گھنٹے بجانے لگی۔ ٹن، ٹن ٹن،
ٹن، ٹن، ٹن، چار۔ پانچ، چھ، سات

ہر ایک گزرتے گھنٹے کی ٹن ریوا کے لئے
تازیانہ کی چوٹ سے کم نہ تھی جو اس کے
جسم پر برابر پڑ رہی تھی۔ آج ریوا چھبیس
سال کی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس
کے ہاتھ سے کوئی گراں قدر شئے پھسل کر
چکنا چور ہونے لگی ہے۔ پارہ کی طرح۔
وہ مایوس اور بے بس ہے۔ اسے بڑھ کر
گرنے سے روک نہیں سکتی۔ اسے گرنا ہی
چاہیئے۔ بمقتضائے فطرت وہ گر کر
ہی رہے گی۔ اس نے گھبرا کر اپنے آپ کو کمبل
میں چھپا لیا۔ لیکن گرمی ناقابلِ برداشت تھی
وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اس کے ملیح ملیح
چہرے پر پسینہ کی بوندیں سطحِ آب پر
تیرتے کنول پر گرے شبنم کے قطروں کی طرح
لرزاں تھیں۔ کمبل کو ایک طرف پھینک کر وہ
بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اضطراری کیفیت
کے زیر اثر برآمدہ میں ٹہلنے لگی۔ وہ چاہتی تھی
کسی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آ جائے
مولسری اور چنبیلی کی خوشبو سے معطر ہوا کے
جھونکے اسے روح افزا محسوس ہونے لگے۔
اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ جیسے اپنے
پھیپھڑوں میں زیادہ سے زیادہ ہوا بھر لینا

چاہتی تھی، اس کے فکرمند اور پریشان کن چہرے
پر تازگی عود کر آئی تھی۔ آسمان پہ چاند بادلوں
کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اس طلسمی فضا
نے اس کی زندگی کے سونے پن کو اور گہرا کر دیا
تھا۔ سینے سے نیچے ڈھلک آنے آنچل
کو درست کرتے ہوئے اس کی نگاہیں اس
کے سینے کے ابھاروں پر کچھ دیر کے لئے
جم کے رہ گئیں۔ وہ خود پر نازاں تھی۔ اس
کا دل ارمانوں کے ہنڈولے میں ڈولنے لگا
تھا۔ اس نے اپنے جسم میں خون کی بجائے آتشیں
سیال کو بہتے ہوئے محسوس کیا۔ مستی کے عالم
میں جھوم کر ناچنے اور گانے کو اس کا دل چاہا
دفعتاً یوں ہوا جیسے مدھر راگ۔ لا اپنے
لگی تھیں۔ ریوا نے بھرپور انگڑائی لی۔
حسن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ابھر آیا تھا
آج نہ جانے کیوں ریوا کو انگڑائیوں پر
انگڑائیاں آنے لگیں۔ اس کا جی چاہ رہا
تھا اتنی انگڑائیاں لے کہ جسم کا انگ انگ
ٹوٹ جائے۔ اس نے جھٹ سے اوپر
اٹھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ گھبرا کر
چھوڑ دیئے جیسے کسی شوخ اور بیباک
نگاہوں کو اس عالم بے خودی میں اپنی طرف
نگراں پایا ہو۔ برآمدہ میں اچانک زرد
ملائی چاندنی در آئی تھی اور اس سے پہلے چھایا
ہوا دھندلکے کا سماں رنگ و نور کے عالم میں
تبدیل ہو چکا تھا۔ اپنی اس حماقت پر اسے
بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ جلترنگ جیسی مترنم
ہنسی۔ سحر طراز فطرت کی اس کرشمہ سازی

پر اُسے غصہ بھی آیا۔ ساکت اور خاموش
پانی میں پتھر پھینک کر اُس میں گرداب کی
سی کیفیت پیدا کردینا اور خود تماشائی کی
طرح دُور کھڑے چُپ چاپ اس متلاطم
کیفیت کا نظارہ کرنا یہ ستم ظریفی ہی تو
ہے! ریوا سوچتی کاش اُسے غصہ آجاتی
دائمی اور ابدی! وہ ہمیشہ کے لئے سو
جاتی۔ پھر اُسے اپنے دل کی اس حالت پر
ہنسی آگئی اور وہ خواب آگیں احساس کے
زیر اثر اپنے کمرے میں داخل ہوگئی جیسے وہ
بلوریں سطح زمین پر پھسل رہی ہو ـــــ اور
اُس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ تکیہ کو
اپنے سینے سے بھینچے وہ کروٹیں بدلنے لگی۔
کبھی مُنہ کے بل لیٹے دونوں پاؤں کو موڑ
لیتی ایسے میں اُس کی گداز اور گوری گوری
پنڈلیاں اپنا جادو آپ جگانے لگتیں۔ کبھی
چت لیٹ کر اپنے ہاتھ پاؤں کو ایک دم
ڈھیلا چھوڑ دیتی۔ اُس کا جی چاہتا آج وہ
اپنی ساری کو بھی بدن سے الگ کر دے تاکہ
اپنے آپ کو ہلکی سی محسوس کرے۔ لیکن وہ
ایسا نہ کر سکی۔ شرم دامن گیر تھی۔ دیواروں
کے بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھی تاکنے
لگتی ہیں۔ ان کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ
اُٹھ بیٹھی اور جا کر الماری میں لگے آئینے کے
سامنے جا کھڑی ہوئی۔ نائٹ لیمپ کی دھندلی
روشنی میں اُس نے اپنے جوان سراپا کا جائزہ
لیا۔ وہ "مینکا" اور "اروشی" نہیں ہے
لیکن ہے خوب صورت اور پُرکشش غمزوں
عشوؤں کا دلنواز پیکر۔ لیکن وہ آج تک
کنواری ہے اس کی زندگی سونی سونی ہے
یہ بات نہیں کہ ماں باپ نے اپنے فرض سے
چشم پوشی کی۔ باپ اپنی زندگی کی آخری سانس
تک اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے جسے وہ اپنا
بیٹا ملتا تھا، مناسب داماد ڈھونڈتے
ڈھونڈتے چل بسا۔ وہ ایک ایماندار
با اصول انسان تھا۔ ملازمت کے دوران
ہی اس کی موت ہوگئی۔ وہ دوسرے
با اصول اور ایماندار سرکاری ملازموں کی
طرح مقروض ہی مرا۔ اُسے ایسے داماد کی
تلاش تھی جو اُس کی طرح جوڑے کی رقم کا
مطالبہ نہ کرے۔ دنیا بہت آگے نکل
چکی تھی۔ اصول اور اخلاقی ضابطے اس کی
برق رفتاری کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ
صرف مصلحان قوم کی تقریروں کا موضوع
بنے رہے اور اگر عملی اقدامات کی شکل میں
کاربند نظر آتے تو صرف دوسروں کے لئے اور
اپنی ذات اُن سے مستثنا ہوتی۔ یہ صرف
خاندانوں کے رواج سے منسلک ہو
جاتے جن سے انحراف بزرگوں کی روایات
سے بغاوت کے مترادف ہوتا۔ یہ ریوا کی
خوش قسمتی تھی یا پتہ نہیں اس کے سورگباشی
باپ کے نیک کرموں کا پھل کہ اُسے سرکاری
ملازمت مل گئی۔ وہ آج ایک اسٹینو تھی۔
وہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ ایک باعزت
شہری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن اسے معاشرہ
میں اپنا ایک مقام بنائے رکھنے کے لئے گو کہ
متوسط ہی سہی کئی قربانیاں دینی پڑتی تھیں
اپنے اصلی چہرے پر کئی جھوٹے چہرے لگا
پڑتے تھے۔ اُسے اپنے دفتر کے عملے میں ا
ساکھ بنائے رکھنے کے لئے دھلی اور استر
کی ہوئی ساری پہننی پڑتی تھی۔ ایک سا
لیکن پاک پلاؤ۔ اُس کے پاس صرف چا
ساریاں تھیں جنھیں وہ چھ دنوں میں با
باری پہنتی تھی۔ صبح کا ناشتہ گھر میں جو کچھ
ہو لیکن دوپہر کا ٹفن تو اسے اپنی سہیلیوں
ساتھ کھانا پڑتا تھا اور اس دوران دو ایک
چیزیں بھی اُن میں بانٹنا پڑتا تھا۔ اسٹین
اسٹیل کا ایک چھوٹا سا ڈبہ، سلیقن بیگ
سلیقہ سے رکھا ہوا ہو۔ کلائی پر ایک سکنڈ
گھڑی جو مہینہ میں دو بار احتجاج کراٹھتی
قدرے مہنگے سینڈل، جوڑے میں ہر
گلاب کا ایک پھول۔ بس کے ٹکٹ کا خر
گھر کا کرایہ، دو افراد پر مشتمل ایک چھوٹی
گرہستی کے اخراجات ـــ ایک طرف ا
اخراجات اور دوسری طرف اُس کی معمولی
تنخواہ ـ بچت ہو تو کیونکر ـ ریو
انھیں سوچوں میں غرق تھی کہ اُس کی م
جاگ گئی۔ اُسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ ریوا
اُٹھی، وہ گھبرا گئی۔ یہی وہ کھانسی تھی جو ا
باپ کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ م
وہ دوڑ کر ماں کے پاس جا بیٹھی۔ شفیق ماد
اُنگلیاں ریوا کے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ ما
جاگ رہی تھی۔ وہ سو نہیں رہی تھی۔ کتنی
جوان بیٹیوں کی مائیں ساری رات جاگ

ہیں۔ انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ ماں کا سارا زیور ریوا کی تعلیم اور باپ کے چھوڑے ہوئے قرضوں کی ادائیگی کے کام آ چکا تھا۔ وہ اپنے داماد کے لئے جہیز کا انتظام نہ کر سکتی تھی۔ مایوس کن حالات میں انسان کسی ایسے خیال کو جو اُس کے لئے خاطر خواہ مفید ثابت ہو اپنا ایمان سمجھنے لگتا ہے۔ ماں کو کسی پڑوسن نے سمجھا دیا تھا کہ روزگار پر لگی ہوئی لڑکی وہ مرغی ہوتی ہے جو سونے کے انڈے دیتی ہے اسے جہیز کی ضرورت نہیں۔ کئی داماد اس لڑکی کو صرف جسم کے کپڑوں سے بیاہ کر لے جائیں گے۔ ماں کتنی معصوم اور سادہ تھی کتنی بھولی۔ ماں اپنی چھوٹی سی ضمیر پر لپیٹ جاتی اور اپنے خول میں سکڑ جاتی، بوڑھی اور فکر مند ماں کی آنکھوں میں اُمڈ آئے آنسوؤں کے سیلاب نے ریوا کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ اُسے احساس دلا رہا تھا کہ ریوا جوان ہو چکی ہے۔ اس کی اب تک شادی ہو جانی چاہیئے تھی۔ شادی جوان ریوا کی عمر کا تقاضا ہے۔ ہر ریوا کو اس کی زندگی کے تحفظ کے لئے کسی جیون ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریوا اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اُسے سہارے کی ضرورت ہے۔ ایک مرد کے سہارے کی۔ جسے وہ اپنا کہہ سکے جو اس کی سرپرستی کا ذمہ لے۔ یہ عورت کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ جوانی کے مچلتے ارمان اور تتلی جیسے رنگین خوابوں کی تکمیل کا تقاضہ ہے۔ یہ فطرت کا تقاضہ ہے

لوگ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ جوانی اور محبت دونوں اندھے ہوتے ہیں۔ اُس کے کانوں میں کئی قہقہے ایک ساتھ گونجنے لگے۔ اُس کی سہیلیوں کے قہقہے۔ پدما بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ وہ برہمن تھی لیکن اس نے مسلمان ندیم سے سول میرج کر لی تھی۔ گوری اور اُما چندرن کے معاشقے کی داستانیں تو دفتر کے کینٹین اور ڈائننگ ہال میں گونج رہی ہیں۔ کملا تو دیالن کے ساتھ ایسے ہی رہنے لگی ہے۔ گیتی کے بارے میں تو سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ کنواری ماں بن چکی ہے۔ حمل ضائع کرنے کی اُس کی ساری کوششیں ناکام ہوئیں۔ تین ماہ کی چھٹی کے بعد وہ کام پر ابھی ابھی لگی ہے۔ سرلا دیکھنے میں تو بھیگی بلی نظر آتی ہے لیکن ہے بڑی شیطان! اپنے بوائے فرینڈس کے ساتھ وہ بلا تامل اور بے جھجک سینما دیکھنے جایا کرتی ہے اور ہوٹلوں میں آزادی سے کھُل کھیلتی ہے اور اکثر اوقات ریوا کو اپنی رنگین داستانیں اس فخریہ انداز کے ساتھ سُناتی کہ جوان ریوا کے بدن پر جیسے سینکڑوں چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ کتنی بے باک اور نڈر ہوتی ہیں دفتروں میں کام کرنے والی یہ لڑکیاں۔ لیکن ریوا۔ ان سب سے الگ ہے۔ بس اسٹینڈ کی لمبی قطاروں میں، لوگوں سے بھری بسوں میں، سڑکوں پر سیلاب کی طرح بہتے مصروف انسانوں کی ریل پیل میں ریوا نے ہمیشہ محسوس کیا کہ مردوں کی ہوس پرست بھوکی نگاہیں اس کے جوان سراپا میں پیوست ہوتی چلی جا رہی ہیں اور ہر ہر عورت کے جسم سے چپکے لباس کو ان کے جسم سے الگ کر دیتی ہیں۔ کئی ایک تو اس سے ٹکرا کے نکل جاتے تھے۔ دفتر میں ایک سے بڑھ کر ایک اُس کے ہمدرد اور خیر خواہ نظر آتے تھے۔ کیلاش تو ہمیشہ اُس سے قریب سے قریب تر ہونے کی دھن میں اس کا شیدا نظر آتا تھا۔ لیکن ریوا انھیں جی بہلاوے کے کھلونوں کے سوا اور زیادہ اہمیت نہ دیتی تھی۔ وہ بزدل ہے۔ اُس میں خطرات سے کھیلنے کی جرات نہیں ورنہ اب تک وہ کنواری نہ بیٹھی رہتی۔ اُس کی ساتھی لڑکیوں میں سے زیادہ لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ مائیں بھی بن چکی تھیں۔ انھیں خیالات میں ڈوبی پتہ نہیں وہ کب سو گئی۔ اگلی صبح کو وہ جاگے گی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر دفتر چلی جائے گی۔ دفتر کے فرائض سے فارغ ہو کر تھکی ہاری وہ شام کو گھر پہنچے گی۔ زندگی کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی محور پر گھومتی رہے گی۔ وقت کا دھارا نہ کبھی رُکا ہے اور نہ رُکے گا۔ ریوا جیئے جا رہی ہے۔ اُسے اُمید کا سہارا ملا ہے جس کی تکمیل کے خواب سجائے وہ جی سکتی ہے۔ اُسے انتظار ہے اُس مبارک دن کا جب کہ اُس کا جیون ساتھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں جس کی تقدیر مقید ہے، جس کی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مسعود مفتی

منی افسانہ

قبرستان..... رنجیدہ چہرے.....
خاموش قدم... بے بس جنازہ... خلاف معمول پُر خلوص نماز..... دبی دبی سسکیاں...
قبر کے چاروں طرف سے مٹی بھر بھر مٹی۔
ہر طرف سوگوار سکوت.....

پھر کدالوں کی چیختی ضرب اور مٹی گرنے کی آواز سے یہ سکوت بکھر گیا۔ اور دھیرے دھیرے مٹی کا ڈھیر سطح زمین سے بلند ہونے لگا۔

فضا کا اطمینانی کھچاؤ ڈھیلا پڑنے لگا۔ قبر سے پرے ہٹ کر دو دو چار چار لوگ دھیمی آوازوں اور مختصر فقروں میں باتیں کرنے لگے۔ متوفی کے متعلق۔ متوفی کی موت کے متعلق۔

اسے معمولی بخار ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے دوا دی اور کہا کہ دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے.... مگر دوا میں ملاوٹ تھی۔ نہ معلوم کیپسول میں کیا بھرا ہوا تھا۔ کہ دوائی کھاتے ہی حالت بگڑنے لگی۔ چند گھنٹوں میں آخری منزل کی اذیت آ پہنچی۔
ہوا اضطراب۔ متوفی کے تین نابالغ بچے جاں نثار بھی نہ تھی۔ سرکاری مکان کے علاوہ صرف نیلی چھت کا سائبان تھا۔

میں نے دیکھا تو قبرستان کے ایک کونے میں تینوں بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ اور اپنے باپ کو منوں مٹی میں دبتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ حیرت سے ان کی بلکیں ساکت تھیں۔

کسی نے پوچھا "دوائی کس کمپنی سے لی تھی ؟"

دوسرے نے نام بتایا تو میں چونکا میں جانتا تھا کہ اس کمپنی کی دواؤں سے پہلے بھی تین چار اموات واقع ہو چکی ہیں گو ڈاکٹر نے مصلحت کوشی کی وجہ سے یہ بات علی الاعلان تسلیم نہ کی تھی۔

کسی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔
" تو کیا اس کمپنی کے لئے کوئی گرفت نہیں ہے ؟"

سب سننے والوں نے اس سوال کو دانستہ نظرانداز کر دیا۔ جیسے یہ بے معنی اور فضول بات ہو۔ کیا کہنے کی ضرورت نہ اچکاتے۔

میں نے سوچا کہ جب لوگوں کے کندھے بھی منجمد ہو جائیں تو یہ بے حسی کے عذاب کی آخری شکل ہوتی ہے۔ کیونکہ دل اور دماغ اس سے بہت پہلے مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے میں قبرستان سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں پارک میں ایک اور ہجوم نظر آیا۔

یہ ہجوم قبرستان کے پُر سکوت ہجوم سے بہت مختلف تھا۔ یہاں لوگ شور کر رہے تھے۔ جوش سے اچھل رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

میں بھی قریب گیا اور پھر ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

ہجوم کے بالکل سامنے چبوترے پر ایک آدمی ٹکٹکی پہ باندھا ہوا تھا اور محتسب اسے کوڑے مار رہا تھا۔

ہر کوڑا لگنے پر وہ تڑپ کر جھول سا جاتا۔ ہجوم میں نعرے لگتے۔ اور لوگ اچھلنے کودنے لگتے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ وہی کمپنی ہجوم میں سب سے پیش پیش ہے اور جوش سے بے قابو ہو کر چلا رہا ہے۔

" اور مارو ____ اور مارو ____
یہ کیا سمجھتا تھا کہ ہمارے اسلامی ملک میں شراب پینے پر گرفت نہ ہوگی ▲

شکیلہ رفیق

افسانہ

مُقدّر کی روایت

"ارے بٹو کا کیا ہے وہ رشیدہ کا پچھلے سال عید والا بادامی جوڑا پہن لے گی ابھی سا پڑانا ہو گیا ہے وہ" اماں نے سوکھا کتھا سروتے سے کترتے ہوئے کہا۔

ہاں یہ ٹھیک ہے مگر.....

رشیدہ کے لئے تو نیا ہی بنوانا پڑے گا۔ بڑی ہے سب کی نظروں میں آتی ہے" خالہ اماں نے تشویش سے پیشانی سکوڑ کر بولیں۔

"خیر رشیدہ بھر کے پیسے تو نکل آئیں گے میرے پاس" اماں نے کہا اور کتھا کی کلیا میں پانی ڈال کر پاندان بند کر دیا۔

قصہ سارا یہ تھا کہ اگلے ماہ خالہ اماں کی لڑکی ساجدہ کی برات تھی اب اس کے لئے ضروری تھا نئے کپڑوں کی، لہذا تنگیٔ داماں کے سبب یہ فیصلہ کیا گیا تھا بڑی ہونے کے سبب رشیدہ کا نیا جوڑا لازمی تھا اور حمیدہ (بٹو) وہ اگر رشیدہ کا جوڑا پہن لے تو کام چل سکتا ہے اس طرح بار بھی نہ پڑے گا اور سفید پوشی کا بھرم بھی رہ جائے گا۔

بٹو نے یوں تو بچپن سے چپ چاپ رشیدہ کی اُترن پہنی تھی مگر جب سے اس نے شعور کی حدود کو چھوا تھا اسے احساس ہو چلا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے یہ احساس اس لیے اور بھی زیادہ تھا کہ رشیدہ صورت شکل میں بھی اس سے کہیں اچھی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور رشیدہ کے اُجلے اُجلے روپ کے آگے وہ باقاعدہ کالی لگنے لگتی تھی اس لمحے اسے خیال آتا کہ اگر وہ بھی نئے کپڑے پہنے ہوتی تو یوں ماند نہ پڑتی — اپنی سوچ کے سبب اب کبھی کبھار وہ اماں سے ہلکا سا احتجاج کر بیٹھتی۔ جس پر اماں گرج پڑتیں۔" اب کیا کروں! ایک دو نہیں سات ہیں سات! سات دوزخ بھرنے ہیں اور تن بھی ڈھانکنا ہے اکیلی تو ہی تو نہیں ہے میری جان یہ جو تیرا ہر نخرا پورا کروں —" تب وہ سر جھکا دیتی۔ سچ تو کہتی ہیں اماں! رشیدہ بجیا ہیں طاہر، صادق، اظہر، فریدہ اور سب سے چھوٹی منی، سات جانوں کو اس مہنگائی کے دور میں نمٹانا وہ بھی جب باپ محض چھ سو کماتا ہو کاروبار نہیں تو اور کیا ہے وہ جی ہی جی میں اماں کی تاویل تسلیم کرتی اور جھلملاتی آنکھوں سے رشیدہ کا کرتا اور دوپٹہ نکال کر دیکھنے لگتی جس کی کرن ماند پڑ گئی تھی اور جو اگلے کسی موقعے پر اسے اوڑھنا تھا۔

ساجدہ کی برات کے روز رشیدہ آتشی گلابی غرارے کا جوڑا پہنے تھی۔ قیامت لگ رہی تھی۔ ادھر حمیدہ بھی بادامی رنگ کا بیل باٹم سوٹ میں آج کچھ نکھری نکھری لگ رہی تھی مگر جب رشیدہ اس کے برابر آ کھڑی ہوتی وہ ڈوبتی شام کی مانند سنولا گئی جو نگاہیں اس کی جانب ہوتیں وہ رشیدہ پر جیسے جم کر رہ جاتیں اور اس نے کئی بار جھنجھلا کر سوچا، اونہہ! موت آ جائے مجھے دفع ہو جاؤں اس دنیا سے تو اچھا ہے... زندگی بھر بجیا کی اُترن ہی پہنتی رہوں گی۔ پندرہ سولہ برس ہو گئے ہیں تماشہ دیکھتے کوئی موقع اور اماں نے جھٹ بولیں بٹو کا کیا ہے وہ رشیدہ کے کپڑے پہن لے گی پتہ نہیں کیسے دل پر پتھر رکھ کے اماں عید بقر عید میرے کپڑے بناتی ہیں ورنہ ان کا بس چلے تو اس وقت بھی مجھے بجیا کی اُترن ہی پہنا دیں اب... اب اگر اس وقت میں بھی نئے کپڑوں میں ہوتی تو شاید.... شاید" نجانے کتنی دیر وہ یونہی دل ہی میں گھٹتی رہی — کھانے کا وقت آیا تو گھر والوں کے ساتھ وہ اور رشیدہ بھی مہمانوں کا کھانا کھلانے میں لگ گئے۔ اسی وقت ذرا دم

لینے کو رشیدہ قنات پکڑ کر کھڑی ہو گئی تو کوئی اسے دیکھتے ہی مرتا تھا اور وہ تھا سلمان! بلا کا عاشق مزاج، وہ قنات کے سامنے کے رخ سے جاسنے کہہ سے ٹکٹکی لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی ہے کہ قیامت! اس نے کئی بار دل ہی دل میں داد دی۔

ساجدہ کی شادی کو چار روز بھی نہ گزرے تھے کہ سلمان کے گھر والے رشیدہ کا پیغام لے کر آ پہنچے اور کچھ ایسے ڈٹے کہ ہاں کروا کے ہی دم لیا۔ یوں بھی نہ کیا سوال تھا۔ پھر سلمان کا اپنا ذاتی کاروبار تھا۔ کماتا تھا، صورت شکل کا بھی اچھا تھا پھر اور کیا چاہئے۔ وہ تو کچھ رشیدہ کا حسن کام آ گیا ورنہ بھلا اس جیسا آدمی ایسے گھرانے میں رشتہ دیتا۔

دو ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی۔

اب اماں نے اور بھی کنجوسی سے کام لینا شروع کر دیا۔ "پیسہ پیسہ بچاؤں گی تب ہی تو تھوڑا جہیز دے سکوں گی" وہ ہر وقت کہتی رہتی۔ کچھ کپڑے تو انہوں نے پہلے سے جمع کر رکھے تھے زیور اپنا ہی اجلوا کر دینے کا ارادہ تھا۔

"اماں! رشیدہ کی شادی میں تو میرا نیا جوڑا بنے گا نا ——" ایک روز اس نے بڑے پیار سے اماں سے کہا جو آتا بی رنگ کے غرارے کا گوٹا بیچ بیچ کا جاز بنا رہی تھیں۔

"ہاں ضرور —" اماں نے غرارہ ایک طرف رکھ دیا اور اسے گھور کر بولیں۔ "رشیدہ کے ہے گت کی کچھ چیزیں بن جائیں اسے ہی غنیمت جاننا۔ تیرے لئے نیا جوڑا اپنا کلیجہ بیچ کر بناؤں گی کیا۔؟"

"اماں! وہ گھگھیائی تم شکر بھیا کی شادی میں تو اترن نہ پہناؤ۔"

"میں کہتی ہوں رشیدہ کے آتشی گلابی غرارے کے جوڑے میں کیا برائی ہے۔ وہ بالکل نیا کا نیا رکھا ہے ایک بار ہی تو پہنا ہے اس نے ساجدہ کی برات پہ۔" اماں نے سخت لہجے میں کہا پھر اس کے اترا سے دہ چہرے پر نظر پڑی تو شفقت سے بولیں۔ "رشیدہ کے بعد تیری ہی باری ہے اس کے بعد تو بس تیرے ہی ٹھاٹھ ہوں گے اور تیری شادی میں تو میں تیرے دو ماہ سے کہہ کر ایسا جوڑا برات کا بنواؤں گی کہ اپنے سارے پچھلے غم بھول جائے گی تو ٹھیک ہے نا۔ اماں کے لہجے میں کچھ ایسی مٹھاس گھلی تھی کہ وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے مسکرا پڑی۔

بٹو کے انتظار کے زندگی نکلنے لگے

تیسرے روز سلمان اور رشیدہ کی شادی تھی شادی کے روز پرانے جوڑے کے باوجود بٹو خاصی اچھی لگ رہی تھی اس کے مقابلے پر رشیدہ جچ نہ رہی تھی۔ سلمان نے کئی بار بڑی بے باکی سے اس کی تعریف کی اور وہ شرما کر رہ گئی۔

سلمان کی جانب سے بری میں تیس جوڑے تھے اور سب ایک سے ایک عمدہ زیور کے دو سیٹ تھے۔ جنہیں دیکھ کر بٹو کے منہ میں پانی بھر آیا تھا "ہائے اللہ آپا! میتھی کے تیس جوڑے... بھیا روز ایک بھی بدلے گی تو سارا مہینہ لگ جائے گا ——" اس نے دل تھام کر سوچا تھا۔

دوسرے روز صبح رشیدہ فیروزی موتیوں کے کام کا غرارہ پہن کر آئی تو سورج کی کرنوں کی طرح جگمگا رہی تھی۔

"ہائے بجیا تم کتنی حسین لگ رہی ہو" وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

"ارے تمہیں بھی ایسے ہی کپڑے بنا دیں گے ——" سلمان نے کہا تو وہ کھسیا کر رہ گئی۔

اس کے بعد تو معمول ہو گیا رشیدہ جب آتی ایک نیا جوڑا پہنے ہوتی۔ رشیدہ کو نت نئے کپڑوں اور زیورات میں دیکھ دیکھ کر اب بٹو کا جی بھی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ اس کی بھی شادی ہو پھر اس کا دولہا بھی اسے روز ایک نیا جوڑا پہنائے —— نیا جوڑا ——! جس کی وہ ایک طویل مدت سے آرزومند تھی —— ادھر اماں ابا بھی رشیدہ کو خوش دیکھ کر مطمئن تھے اور انہوں نے سلمان سے کہہ دیا تھا کہ وہ بٹو کے لیے بھی کوئی اپنے جیسا اچھا سا لڑکا دیکھے سلمان نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور کوشش کرے گا —— اور اس سلسلہ میں وہ اکثر بٹو سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا تھا اور بڑے بے باک مذاق کرتا تھا۔ ابتدا میں تو بٹو

ان باتوں سے محظوظ ہوتی تھی مگر اب اسے سلمان کی اس قدر بے باکی کھلنے لگی تھی اسی لیے اب اکثر وہ سلمان کی آمد پر منہ بنا لیا کرتی تھی ۔

رشیدہ کی شادی کو سال بھر ہونے کو آیا تھا ۔ آج کل وہ ماں کے گھر پر ہی رہ رہی تھی سارا دن اس کا جی ماندہ رہتا کبھی متلی ہوتی اور کبھی قے ہو جاتی وہ نڈھال ہونے لگتی تو جلو جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگتی ۔ زچگی کے دن اب صرف دو مہینے رہ گئے تھے اسی لیے اب اماں نے اپنے ہاں بلا لیا تھا سلمان کا تھا ہی کون جو اس کی دیکھ بھال کرتا ۔ ماں اس قدر ضعیف کہ خود دوسروں پر انحصار کرتی تھی ایک بھائی تھا جس کی شادی ہو چکی تھی اور اپنے بیوی بچوں اور ماں میں مصروف رہتا یہی سب دیکھتے ہوئے اماں نے اسے اپنے ہاں رکھنا مناسب سمجھا تھا ۔

" جھوٹ نہا لے گی پھر اپنے گھر لے جانا ۔ اماں نے سلمان سے کہا تو وہ ادب سے بولا ۔ "بہت بہتر "

" تمہارے ہاں تو خوب صورت ہی بیٹا ہو گا بھیا کیونکہ تم دونوں خوب صورت ہو " ایک روز جلو نے رشیدہ سے ہنس کر کہا ہمیشہ کی طرح سلمان نے اس کی بات اچک لی ۔

" فکر نہ کرو تمہارے ہاں بھی خوب صورت ہی ہو گا ۔ " اور اس کا غصہ اور شرم سے برا حال ہو گیا ۔ " بڑے بدتمیز ہیں آپ ۔ " اس نے خفگی سے کہا ۔

" تم ہی تو دیکھو ہم جیسے بدتمیزوں سے ہی کہا گیا ہے کہ تحمل اور دعا تلاش کریں " وہ ہنسا تو رشیدہ بھی ہنس کر بولی ۔

" ارے کس سے شکر لے رہے ہیں ان جیسوں سے کوئی جیت پایا ہے بھلا ۔ "

" اب دیکھ لو تمہاری بھیا ہی ہارے بیٹھی ہیں ۔ سلمان برجستہ بولا ۔ تو رشیدہ خوب ہنسی اور جلو کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی ۔

پچھلے ہفتے رشیدہ ہسپتال سے معائنہ کرا کے آئی تو سلمان کچھ چپ چاپ سا تھا رشیدہ نے کئی بار اس سے خاموشی کی وجہ پوچھی مگر وہ ٹال ہی گیا ۔ اماں بھی ایک نظر میں بھانپ گئیں کہ سلمان متفکر ہے انہوں نے علیحدگی میں سلمان سے پوچھا اور سلمان کے جواب پر خوف سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔

ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کیس سرجری کا ہو رشیدہ کا کیس کچھ مشکل معلوم ہوتا ہے دعا کیجئے اماں ۔ اماں کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ۔ سارا سارا دن مصلے پر بیٹھی اپنی بچی کی خیریت کی دعا مانگا کرتیں ۔ رشیدہ نے کئی بار ان سے پوچھنا چاہا مگر انہوں نے رشیدہ پر کچھ بھی ظاہر نہ کیا اور ہنس کر ٹال گئیں ۔ دو مہینے میں ایک دن بھی اماں چین سے نہ سوئیں ۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب رشیدہ کو تکلیف شروع ہوئی ۔ سلمان گھبرا کر ٹیکسی لینے بھاگا اور اماں نے جلدی جلدی سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھنے لگیں ۔ اور پھر اماں اور سلمان اسے لے کر اسپتال روانہ ہو گئے ۔

اسپتال میں جتنی دیر رشیدہ کے کمرے کا دروازہ بند رہا وقت کا شمار دو بھر ہو گیا ۔ اماں ، ابا اور سلمان کی ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل ہو گئیں کئی گھنٹہ بعد ڈاکٹر مائی صاحبہ باہر نکلی اور سلمان سے بولی ۔

" مسٹر سلمان ! ہم نے اپنی پوری کوششیں صرف کر دیں مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم ماں کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ "

ڈاکٹر ۔ !!! اماں اتنی زور سے چیخیں کہ ان کی کان کی رگیں تک کھنچ گئیں کیا مطلب ڈاکٹر ۔ ؟ سلمان خود پر قابو پا کر بولا ۔

" آپ کی بیوی نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہے مگر افسوس کہ وہ خود زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں ۔ " ڈاکٹر نے افسوس سے سلمان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ اور سب رونے لگے ۔

یوں بچے کی آمد رشیدہ کی رخصت کا سبب بن گئی وہ بچے کی صورت بھی نہ دیکھ سکی اور بے ہوشی ہی میں چل بسی ، رشیدہ کی موت کا غم معمولی نہ تھا اماں کا

کا تو غم سے بُرا حال تھا۔ ابا بھی ہر وقت آنکھوں میں آنسو بھرے جاتے۔ کیا سوچتے رہتے۔ سارا گھر اداس تھا اور نجانے کتنے عرصہ سب یونہی اداس رہتے اگر مُنّے کی کلکاریاں سب کو اپنی جانب متوجہ نہ کر لیتیں مُنّے کو اماں اپنے ساتھ ہی لے آئی تھیں گھر میں کون اس پر توجہ دیتا ۔۔ اماں کے ہاں وہ بھرپور توجہ سے پل رہا تھا ہر فرد اس پر جان چھڑکنے کو تیار ۔۔ سلمان کا زیادہ وقت بھی اب یہیں گزرتا تھا گویا کہ ہر فرد کی دلچسپی مُنّے سے وابستہ تھی سلمان بھی روز شام کو دفتر سے سیدھا یہیں آجاتا اور گھنٹوں بے زبان مُنّے کو گود میں لیے اس سے باتیں کرتا رہتا۔ اماں سلمان کا سوکھا منہ دیکھتیں تو ان کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہائے میری بچی! جس نے بچہ کی شکل بھی نہ دیکھی۔ سینے پر ہاتھ رکھ کے ٹھنڈی سی سانس بھر کے رہ جاتیں۔

دن یوں ہی جیسے تیسے گزرتے رہے تھے کہ اچانک اس بات کو سب نے ہی محسوس کیا کہ سلمان کی آمد میں کمی ہو گئی ہے اب اکثر وہ ایک دن بیچ کر کے آتا ۔۔ اور کبھی دو دو روز کا ناغہ بھی ہو جاتا۔ اماں کو تشویش ہوئی تو انہوں نے ابا سے اس کا ذکر کر دیا۔

"جوان آدمی ہے کہاں تک گھر میں گھسا رہے کہیں دوستوں میں چلا جاتا ہو گا دل بہلانے ۔۔" ابا نے اماں کی تشویش کچھ کم کرنی چاہی۔ مگر اماں کی تشفی اتنی آسانی سے کہاں ہونے والی تھی وہ رشتہ کی ماں جو تھیں۔

"مُنّے سے بڑھ کر دل بہلانے کا سامان اور کیا ہو سکتا ہے... تم پتہ کرو آخر جاتا کہاں ہے ۔۔؟" اماں نے ذرا سختی و فکر سے کہا۔

اچھا اچھا معلوم کروں گا ۔۔ ابا نے کہا اور دل ہی دل میں وہ بھی متفکر ہو گئے۔

اور پتہ کرنے پر جو کچھ معلوم ہوا وہ دونوں کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا ۔۔ پتہ کرنے پر عجیب راز کھلا کہ سلمان کسی عورت کے چکر میں مبتلا ہے جو ایک بچے کی ماں ہے خاوند مر چکا ہے سارا سارا وقت وہیں رہتا ہے اکثر اس کے ساتھ گھومتے پھرتے بھی دیکھا گیا ہے ۔۔ سب کچھ سن کر اماں کا بُرا حال تھا۔

اب کیا ہو گا ۔۔؟ وہ بوکھلا کر بولیں۔

میں اس سے بات کروں گا۔ ابا نے کہا اور اماں کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ مگر جب ابا نے سلمان سے بات کی اور کمرے سے باہر نکلے تو ان کا چہرہ بالکل دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

کیا کہا اس نے ۔۔؟ اماں نے کافی کچھ اندازہ کر کے اندیشے سے پوچھا۔

کہتا ہے آپ کا اب مجھ پر کیا اختیار ہے جو میری مرضی میں کروں گا ۔۔ ابا نے شدید مایوسی سے کہا۔

"ہائیں ۔۔!" اماں کو یقین نہ آیا۔

صبر کرو اور دعا کرو خدا اسے نیک راہ دکھائے ہم سب کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ابا نے صدمہ سے کہا اور دونوں کو مجبوراً کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر خاموش ہی ہو جانا پڑا لڑائی جھگڑا کرنے سے صورت حال مزید بگڑ جانے کا خدشہ تھا لہذا خاموشی ہی کو بہتر سمجھا گیا۔

مُنا سات ماہ کا ہی ہوا ہو گا کہ سلمان نے دوسری شادی کا اعلان کر دیا ۔۔ بھلا عاشق مزاج یوں بھی کبھی رُکتے ہیں ۔۔؟ بہار نہ معقول کہ مُنا بھلا بنا ماں کے کب تک یونہی پلتا رہے گا؟ ساری زندگی ایسے کیسے چلے گا؟ سنتے ہی اماں ابا دونوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے سوتیلی ماں کے تصور سے ہی جھرجھری آگئی مُنا سوتیلی ماں کے زیر سایہ پلے گا تو جو سلوک اس سے ہو گا اس کا اندازہ انہیں بخوبی تھا پھر اس پر سے ایک سوتیلا بھائی بھی ' ادھر سلمان تھا کہ جلد از جلد شادی کرنے پہ بضد ۔۔ ابا نے سلمان کو ہر قسم کی صورت حال سے آگاہ کیا مُنّے کے دردناک مستقبل کے ایک ایک رُخ کو اسے دکھا دیا مگر اس کی تو ایک ہی رٹ تھی کہ ساری زندگی رنڈوا نہیں رہوں گا۔ رہی مُنّے کی بات تو میری ہونے والی بیوی اسے ماں

اسے ماں جیسا پیار دے گی یہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بچے سے بڑھ کر منے کو چاہے گی۔ اماں منے کو اپنے سے جدا کرنے پر کسی قیمت پر تیار نہ تھیں اور سلمان لے جانے پر بضد ــــ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس مسئلہ کا ایک حل اماں نے نکال ہی لیا ـــ بٹو کی شادی سلمان سے! اگر ایسا ہو جائے تو منے کو ماں کا سا حقیقی پیار مل جائے گا اور بٹو بھی ٹھکانے لگ جائے گی۔ اس کا کوئی رشتہ ویسے بھی اب تک نہ آیا تھا یوں یہ مسئلہ بڑی خوبی سے حل ہو جائے گا ـــ تجویز ابا کو بھی پسند آئی اور انہوں نے فوراً ہی سلمان سے اس کا ذکر کر دیا۔ سب سن کر سلمان اتنی آسانی سے رضامند ہو گیا کہ ابا بھی حیرت زدہ رہ گئے اسے تو شادی سے مطلب تھا خواہ وہ کسی عورت سے ہوتی کون سا اس عورت کے پیچھے وہ مجنوں ہو گیا تھا پھر بٹو جس طرح منے کا خیال رکھے گی وہ عورت تمام زندگی نہیں رکھ سکے گی اور اس کے بیٹے کے بوجھ سے الگ آزادی مل۔ یہی سب سوچ کر اس نے فوراً حامی بھر لی تھی۔

بٹو نے یہ فیصلہ سنا تو رو رو کر جل تھل کر دیا اس کے رونے پر اماں کو آگ ہی تو لگ گئی۔

"اب کیا تیرے لئے آسمان سے شہزادہ اترے گا؟ کوئی پوچھتا تو ہے نہیں وہ تو سلمان کی مہربانی کہو ورنہ اگر وہ بھی انکار کر دیتا تو؟" اماں کے کڑے تیور دیکھ کر اور اور یہ سچی اور تلخ حقیقتیں سن کر ایک بار پھر اسے چپ ہو جانا پڑا یوں اس کا یہ احتجاج بھی ہمیشہ کی طرح آنسوؤں میں بہہ گیا۔

نکاح کے لئے اگلا جمعہ طے ہوا تھا اپنی شادی کے روز اس نے طویل عرصہ بعد نیا جوڑا پہنا تھا ـــ اماں نے سلمان کو سب گزشتہ واقعات سے آگاہ کر دیا تھا اور اسی لئے سلمان نے اس کے لئے بڑا قیمتی جوڑا بنایا تھا ـــ سرخ زرتار کا نیا جھلملاتا جوڑا۔! مگر یہ سب پاکر بھی وہ برف کی طرح ٹھنڈی تھی اس کے بدن میں کوئی حرارت نہ تھی، نیا جوڑا پہننے کے بعد بھی اس کے دل میں کوئی امنگ نہ جاگی تھی وہ تلخی سے سوچ رہی تھی "ہونہہ! نیا جوڑا ملا بھی تو کب؟ کیسے؟ کس کے ذریعے!" سوچتے ہوئے اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔

سلمان کمرے میں داخل ہوا تو وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی ـــ سلمان نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو بےساختہ کہہ اٹھا۔

"واللہ! آج تو تم پر بہاروں کا سا نکھار ہے۔" مگر وہ یونہی چپ چاپ کپکپاتی رہی "بٹو! رشیدہ کے بعد تو مجھے اچھا لگنے لگی تھی مگر۔۔۔ یہ بات کہنے کی بھلا مجھ میں ہمت کہاں سے لاتا مگر دیکھو قسمت خود بخود ہم پر مہربان ہو گئی کہ تم۔۔ ہمیں مل گئیں ـــ" جواب میں وہ صرف ایک دکھا سا سانس لے کر رہ گئی۔

کورے بدن کو جب پہلی بار کوئی مرد ہاتھ لگاتا ہے تو کیسی سنسنیاں سی سارے بدن میں دوڑتی ہیں مگر سلمان نے جب اپنی جلتی ہوئی انگلیاں اس کے برف جیسے ہاتھوں سے چھوائیں تو وہ پتھر کی سل کی طرح بےحس بیٹھی رہی "بٹو!" سلمان نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا "ہمیں معلوم ہے کہ اس شادی میں تمہاری رضا شامل نہیں.... مگر میں اور تم.... دونوں تقدیر کے آگے بےبس ہیں۔ ویسے بھی تم تو جانتی ہو کہ اماں ابا کے بےانتہا اصرار اور مجبور کرنے کے بعد میں اس رشتہ پر رضامند ہوا ہوں اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے بٹو! پھر بھی میں تم سے معذرت کرتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہارا دل دکھا!"

اور وہ آنسوؤں کے بڑے بڑے گولے بےحد ضبط سے حلق کے پار اتارتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں سلمان بھائی! بھلا آپ کیوں معذرت کریں یہ تو ہمارے مقدر کی روایت ہے پھر.... پھر بھلا یہ کیوں ٹوٹتی.... ہم تو.... ہم تو بچپن سے بجیا کی اترن پہنتے چلے آئے ہیں... سو آج... آج بھی یہی ہمارا مقدر ہے۔"

[illegible] اور جہاں
[illegible] احساس [illegible]
[illegible] شکنتلا کو
[illegible] شکنتلا نے اس
[illegible] شکنتلا
[illegible] تمام کو [illegible]
[illegible] ایک عجیب سا نگ
[illegible] ریزہ ریزہ
[illegible] پل اور
[illegible]

ہمانے بڑے ضبط سے کہا۔ ہاں
میں ہی وہ انیل ہوں، دھن پور کا انیل
جی چاہ رہا تھا پوچھیں کہ بتاؤ ہم دونوں
میں قاتل اور مقتول کون ہے؟ لیکن
میں کچھ کہہ نہ سکا۔ شدت جذبات نے
مجھے گنگ کر دیا تھا۔

ایک اجنبی آواز میں شکنتلا نے
کہنا شروع کیا یہ میرا لڑکا سنیل ہے
جب میں سنیل کو دیکھ رہا تھا تو بچے سے
کہنے لگی۔ "بیٹا انہیں سلام کرو یہ ہمارے
دھن پور کے تحصیلدار کے بیٹے ہیں۔" لڑکے
نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔

بچے کو سر سے پیر تک دیکھنے کے
بعد خوشی اور حیرت نے مجھ سے سوال کیا
کہ سنیل تمہارا ہم شکل کیں

طلب کر رہی ہو۔ پھر کہنے لگی وہ آپ کی
گھر والی کیسی ہیں۔ جواب میں میں نے
ٹھیک ہے کہہ دیا اور سنیل کو اپنی طرف
کھینچتے ہوئے گھر چلنے کی دعوت دی۔

چائے ختم کر کے شکنتلا نے
پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"روپا کی کوئی تصویر ہے تو دکھا دو۔"
مجھے شکنتلا کے چہرے پر رنج و کرب کے
خطوط پڑھنے کو ملے اور اس کی آنکھیں
بس پر سناہی چاہتی تھیں۔ مجھے وہ البم
دکھانا پڑا جس کی پہلی تصویر جامن، پل
مولسری کے انیل کی تھی جس کو سنیل بڑی
دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر البم کے آخری ورق
پر میری ایک تنہا تصویر دیکھ کر شکنتلا کی
آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر شکنتلا نے اجازت
[illegible] دونوں ماں بیٹے گھر سے رخصت
[illegible] کے

[illegible]

مماثلت ہے اچانک چلی جاتی ہے۔ [illegible]
خود بخود آ جاتی ہے شاک دینا اس کی
فطرت ہے۔ آنکھوں میں اگر بصیرت
ہو اور روشنی چلی جائے تو آدمی خواہ مخواہ
[illegible] بلکہ فطرتاً بے چین ہو جاتا ہے اور
[illegible] کوئی کام کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اندھیرے
میں ہر چیز ڈل ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر
کوئی عورت اندھیرے میں ہو تو کچھ ذہن
[illegible] بصیرت بڑھ جاتی ہے۔ یہی خیالات
اندھیرے اور روشنی میں گڈ مڈ ہو رہے تھے
[illegible] موم بتی چیر مراکر خاموش ہو گئی۔

نہیں سکتا لیکن میرے [illegible]
کہ بھول جاؤں کیونکہ دل کے دھڑکنے کا
احساس یہیں سے شروع ہوا تھا۔

وہ سلونے دن آج بھی مجھے اچھی طرح
یاد ہیں اسکول بھاگ کر یا اسکول کے بعد
ہم چار دوست اس گاؤں کی ایک خاص
سڑک پر جاتے تھے۔ جہاں سڑک کے
دونوں طرف جامن کے بڑے بڑے پیڑ
تھے اور ہم پیڑ پر جا کر باہوں میں
باہیں ڈالے ایک دوسرے کو چومتے
پھرتے اور لال لال کالے کالے جامن

[illegible] شکنتلا [illegible]
پسند کرتی تھی۔ [illegible]
[illegible] ان کے [illegible]
تھی۔ ان [illegible] کے [illegible] میں [illegible] وہ چیز
زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی جو مجھ میں نہیں
تھی۔ جیسے پیڑ پر چڑھنے کے مقابلے میں سب سے
پیچھے رہ جاتا، نیچے ریت اکٹھا کر کے پل سے کودا
جاتا۔ سب ایک کے بعد دیگرے کود جاتے
لیکن میں کمزور تھا۔ کودنے سے ڈرتا اور انکار
کر دیتا تو شکنتلا کو سخت غصہ آ جاتا مجھے کودنے
پر مجبور کرتی یا خود میرا ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ

جنسی، جسمانی و نفسیاتی کمزوریوں کے مایوس العلاج کے لئے
حضرت حکیم امجدی رحمۃ اللہ علیہ کے ۷۵ سالہ تجربات بیش قیمت طبی جواہرات

جوہرین ۱ — مردانہ خاص قوتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ مایوس اور کمزور مریضوں میں توانائی پیدا کرتا ہے۔
۱۰ خوراک ۶۰ روپے، مکمل کورس ۲۷۵ روپے، پورا جہاعلی ۵۰۰ روپے

لبوبہ جواہر طلائی:۔ اعضاء جوارح کے افعال میں تازہ روح پیدا کرتا ہے۔ جسم میں برقی رو دوڑا دیتی ہے۔ خواہشات کو ابھارتا ہے۔ طبیعت میں امنگ پیدا کرتی ہے اور زندگی میں تازہ بہار لاتی ہے۔ اس کا ایک کورس حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے

پورا کورس ۵۷۵ روپے

اسٹومی پاوڈر ۲— گیاس، بدہضمی اور جملہ پیٹ کی شکایتوں کا کامیاب علاج
قیمت ۳ روپے

طب یونانی کا عظیم الشان دواخانہ

بیت الشفاء یوسفی

ترپ بازار، حیدرآباد (اے پی)

فون نمبر ۴۴۲۹۵

اوقاتِ مطب: ۹ تا ۱ دن
۵ تا ۸ شب

کسی بھی قسم کے مرض میں حاذق حکیم محمود خاں محوی کامل الطباء دہلی سے مشورہ کیجئے!

قمر حیدری

آئینہ

(افسانہ)

جب میں لکھنے کی میز پر بیٹھا تو بجلی فیل ہوگئی یک لخت آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو سارے محلے میں اندھیرا تھا۔ کون جانے اب روشنی کب آئے۔

اب مجھے موم بتی تلاش کرنا تھا نہ جانے رو بانے موم بتی کہاں رکھ چھوڑی تھی رو بامیری بیوی آج پھر مجھ سے جھگڑا کر کے اپنے میکے چلی گئی ہے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک موم بتی مل گئی۔ میں اُسے جلا کر سوچ رہا تھا کہ بیوی اور بجلی میں کس قدر مماثلت ہے اچانک چلی جاتی ہے۔ پھر خود بخود آجاتی ہے شاک دینا اس کی فطرت ہے۔ آنکھوں میں اگر بصیرت ہو اور روشنی چلی جائے تو آدمی خواہ مخواہ نہیں بلکہ فطرتاً بے چین ہو جاتا ہے اور پھر کوئی کام کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اندھیرے میں ہر چیز ڈل ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی عورت اندھیرے میں ہو تو کچھ ذہن کی بصیرت بڑھ جاتی ہے۔ یہی خیالات اندھیرے اور روشنی میں گڈ مڈ ہو رہے تھے کہ موم بتی پھڑ پھڑا کر خاموش ہو گئی۔

اب محمود بستر پر لیٹ کر ماضی کے ایک ایک دن کو بلا کر مزاج پرسی کرنے لگا۔ ماضی کی قندیل روشن ہو گئی نہ جانے اب وہ گاؤں کیسا ہوگا۔ شکنتلا کیسی ہوگی۔ کتنے بچوں کی ماں ہوگی۔ وہ گاؤں جو آج ایک تعلقہ بن گیا ہے کبھی ایک چھوٹا سا دیہات تھا۔ بچپن گزرتا گیا میرے چہرے پر تبدیلی آتی گئی۔ دیہات تعلقہ بن گیا اور میں نے بچپن کو جوانی سے بدل لیا۔

ہمارا گاؤں کوئی شاندار تاریخ نہیں رکھتا لیکن میرے لئے نا ممکن ہے کہ بھول جاؤں کیونکہ دل کے دھڑکنے کا احساس یہیں سے شروع ہوا تھا۔

وہ سلونے دن آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں اسکول سے بھاگ کر یا اسکول کے بعد ہم چار دوست اس گاؤں کی ایک خاص سڑک پر جاتے تھے۔ جہاں سڑک کے دونوں طرف جامن کے بڑے بڑے پیڑ تھے اور ہم پیڑ اوپر جا کر بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے کو چومتے پیتے اور لال لال کالے جامن پتوں میں جھولتے رہتے۔

انھیں جامن کے پیڑوں کے پاس ایک پُل تھا جس کے نیچے برساتی نالہ بہتا تھا اور پُل کے بازو مولسری کا درخت تھا سامنے سڑک کی بائیں جانب شکنتلا اور سرلا دو بہنیں رہتی تھیں۔ سرلا چھوٹی سی سانولی لڑکی تھی اور شکنتلا بھی سانولی ہی تھی مگر تھی بڑی شریر اور معصوم۔ شکنتلا کی معصومیت نے میرے شعور کو تازگی عطا کی تھی۔ محبت کچی گولیوں کی طرح نرم تھی جذبات کی آگ ابھی نا مکمل تھی۔ اخلاص و محبت کے گیت گاتے ہم نالے کی ریت پر گھروندے بناتے اور کبھی ڈوبتے سورج کو جامن کے پیڑ کی آخری چوٹی سے الوداع کہتے۔ سرلا پیڑ کے نیچے کھڑے رہتی اور شکنتلا ہمارے ساتھ اوپر چڑھ آتی تھی۔

ہم چاروں مشترکہ طور پر شکنتلا کو پسند کرتے تھے لیکن شکنتلا ہر وقت میرے ہی ساتھ رہنا پسند کرتی تھی۔ جھاڑی جھاڑی لئے مجھے گھومتی، اپنی ماں کے آگے میرے ہی گن گاتی تھی۔ ان تینوں کے مقابلے میں مجھ میں وہ چیز زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی جو مجھ میں نہیں تھا۔ جیسے پیڑ چڑھنے کے مقابلے میں سب سے پیچھے رہ جاتا نیچے ریت اکٹھا کر کے پُل سے کودا جاتا۔ سب ایک کے بعد دیگرے کود جاتے لیکن میں کمزور تھا۔ کودنے سے ڈرتا اور انکار کر دیتا تو شکنتلا کو سخت غصہ آجاتا مجھے کودنے پر مجبور کرتی یا خود میرا ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ

کو دیکھ جاتی اور زخمی ہو جاتی میں چاہتا کہ اس کے زخمی گھٹنے کی ریت صاف کر دوں لیکن وہ ذرا سی چھینک کر خفا ہو جاتی اور اکثر اس کی میری لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔

ہمارے پتاجی نائب تحصیلدار تھے۔ رات کو جب وہ سو جاتے بستر پر میری آنکھیں جلتی رہتیں، ذہن سلگتا رہتا اور جامن کے پیڑ، پل اور مولسری کے اطراف ہی گھومتا رہتا جہاں مضبوط اعصاب کا لمبے دانت والا لڑکا علی حسن اپنی نیکر کی جیب سے شکنتلا کو کالے کالے جامن دیتا ہوا نظر آتا کیونکہ کالے جامن شکنتلا کو بہت پسند تھے۔

علی حسن ہمارے گاؤں کے محبوب حسین زمین دار کا تیسرا لڑکا تھا شکنتلا کے پتا اور چاچا انہیں کی زمین کے حصہ پر گنا اور لال مرچی پیدا کرتے تھے جس سے سال میں دو بار زمین دار کو اچھی آمدنی تھی۔ محبوب حسین زمین دار اور شکنتلا کے پتا ایک دوسرے کے مخلص اور دوست تھے۔ دونوں میں اونچ نیچ ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ عورتیں بھی ایک دوسرے کے گھر آتی جاتیں۔ جب دیپاولی آتی تو سارے گاؤں کے گھروں کے ساتھ ساتھ زمین دار محبوب حسین کے گھر کو بھی رواداری میں لیپ دیا جاتا۔ صحن کے منڈوے کو نئے آم کے پتے بھر دیئے جاتے اس منڈوے کے نیچے زمین دار آرام کرسی پر بیٹھا کھیت مزدوروں کو دیپاولی کا انعام دیتا۔ پیچھے ایک طرف دھرم راج کمہار اور اسمٰعیل مجاور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔

بوڑھا جولاہا سنہرے گوٹے کا رومال بنا کر ہر سال کی طرح زمین دار کو پیش کرتا جب میں پتاجی کے ساتھ عید ملنے جاتا تو میرے کپڑوں پر عطر مل دیا جاتا اور میں دیکھتا کہ چراغوں کی قطاریں شکنتلا کے گھر سے شروع ہو کر زمین دار کی دیوار پر سے ہوتے ہوئے دروازے پر ختم ہو جاتیں۔

کیونکہ دونوں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ حسن اور شکنتلا صبح ہی صبح میل بھری آنکھوں سے ملتے اور کھیتوں میں دور دور تک دوڑتے پھرتے۔ میرا بھی دل چاہتا کہ دوڑتے پھروں لیکن مجبوری یہ تھی کہ ہمارا گھر یہاں سے ذرا دور تحصیل کے دفتر میں واقع تھا۔ پتاجی ایک آفیسر کہلاتے تھے۔ سارے گاؤں میں بڑی دھاک تھی اور پھر پتاجی کے پاس ہی سارے گاؤں میں ایک اچھی سیکل تھی جس کو چپراسی روزانہ گھر پر ہی تیل لگا کر صاف کرتا۔ سیکل کو ہاتھ لگانے مجھ پر پابندی تھی کیونکہ پتاجی اصول پسند آدمی تھے۔

زمین دار کا بیٹا حسن گھوڑے پر بیٹھ کر پوز کرتا بالکل اسی طرح جس طرح ہماری تاریخ کی کتاب میں شیواجی کا تھا۔

جب شکنتلا سیکل اور گھوڑے کا مایوسی کے ساتھ تقابل کرتی تو میں اسے پھول چننے کی دعوت دیتا ہم جھاڑیوں میں پھر پھر کر رنگ برنگ کے پھول اکٹھا کرتے جس کو شکنتلا اپنی ماں کے ساتھ پیتل کی تھالی میں سجائے مندر لے جاتی اور شکنتلا حسن کے ساتھ شیواجی کا وہ سبق بھی بھول جاتی جو ہماری تاریخ کی کتاب میں تھا۔

دن گذرتے گئے ریڈیو روی، حسن نے اتحاد کر لیا اور مجھے اپنی دوستی سے خارج کر دیا موسم بدلتے رہے۔ کھیت کٹتے رہے، جوانی محبت کے نغمہ پر الاپ تلاش کرتی رہی۔ ہماری ملاقاتیں کم ہوتی گئیں۔

کبھی سر شام آموں کے پیڑ پر کوئل پکارتی تو پہلو میں درد ہوتا اور کبھی کبھی صبح سویرے سردیوں کے شبنمی قطرے مجھ سے کہتے کہ آؤ یہاں دیکھو شکنتلا یہاں چھپی ہے تو بیلے کے پھول کھل کھلا کر ہنس پڑتے اور کبھی ملگجی سنہری چاندنی میں شکنتلا مجھ سے ملنے آجاتی تو وقت کی سانس رک جاتی، کائنات محبت کا لبادہ اوڑھے کہیں کھو جاتی، وقت محبت کے رنگ میں پہچانا نہیں جاتا تھا۔

ایک آخری شام شکنتلا کی آنکھوں نے میرے آستین پر کاجل اور آنسوؤں سے محبت اور امانت کے دو نشان بنا دیئے۔ زندگی بھر ایک رہنے کی قسم کھائی گئی اور میں شہر چلا آیا۔ یہاں چاچاجی اور ایک کالج میرا انتظار کر رہے تھے۔

وقت گذرتا گیا۔ زندگی اور احساس کے ماحول نے میرا انتظار نہ کیا دو سال بعد بوڑھوں کی انگشت نمائی نے شکنتلا کو تشنہ بنایا پھر لوگوں کی لب کشائی نے اس پر سماج کا پرانا جال ڈال دیا اور شکنتلا کی شادی ہو گئی۔ ذہن کے تمام کھڑکیوں نے ایک ساتھ چوکھٹ چھوڑ دی ایک بھیانک طوفان نے محبت کے تاج محل کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ تمام جامن کے پیڑ اکھڑ گئے پل اور سڑک کے مولسری کو کہیں بہائے جا رہے تھے۔ اس میں شکنتلا مجھے ڈوبتی تیرتی، تیرتی ڈوبتی نظر آتی۔

اب زندگی کے ہر سمت اندھیرا..

جب وقت نے برسوں کو کھا لیا تو روشنی کی تلاش میں میں نے رُوپا کو اپنا جیون ساتھی مان لیا۔ رُوپا میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ خوب صورت ہے لیکن یہ خوبصورتی بکھر ختم ہو جاتی ہے جب رُوپا مجھ سے جھگڑا کرتی اور نتیجہ میں اپنی ماں کے پاس چلی جاتی پھر خود بخود آجاتی۔ وقت گذرتا رہا ہر سال پابندی سے میں اپنے مکان کو سفیدی کرنے لگا۔ گاندھی جیون بھاشی گیٹ کی موڑ پہ اچانک میری زبان سے شکنتلا نکل گیا کیونکہ یہاں شکنتلا ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ساتھ کھڑی تھی تذبذب کا ایک لمحہ ضائع ہوتے ہی ہلکی سی چیخ کا دم گھونٹ کر اس نے کہا۔

"انیل — آپ انیل ہی ہیں نا۔"

میں نے بڑے ضبط سے کہا۔ ہاں میں ہی وہ انیل ہوں، دھن پور کا انیل، جی چاہ رہا تھا پوچھیں کہ بتاؤ ہم دونوں میں قاتل اور مقتول کون ہے؟ لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا۔ شدت جذبات نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔

ایک اجنبی آواز میں شکنتلا نے کہنا شروع کیا یہ میرا لڑکا سنیل ہے جب میں سنیل کو دیکھ رہا تھا تو بچے سے کہنے لگی۔ "بیٹا انہیں سلام کرو یہ ہمارے دھن پور کے تحصیلدار کے بیٹے ہیں۔" لڑکے نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

بچے کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد خوشی اور حیرت نے مجھ سے سوال کیا انیل یہ بچہ سنیل تمہارا ہم شکل کیسے طرح ہو سکتا ہے۔ ہو بہو وہی آنکھیں پتلی سی ناک، پتلی گردن، وہی رنگ، وہی چہرہ جو کبھی مولسری، جامن، پل کے اطراف کھیلا کرتا تھا یہ کس طرح ممکن ہے۔ کتنے سوال تھے جو مجھے شکنتلا سے کرنے تھے لیکن مجھے زبان کے وجود کا احساس کہاں تھا۔

شکنتلا خاموش گردن جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہی صندلی بدن لئے۔ لیکن مجھے خوشبو سنیل کے جسم سے آرہی تھی۔

میں نے کہا "گھر چلیں چائے پہ باتیں ہوں گی تو شکنتلا نے جواب طلب نظروں سے سنیل کو دیکھا جیسے اجازت طلب کر رہی ہو۔ پھر کہنے لگی وہ آپ کی گھروالی کیسی ہیں۔ جواب میں میں نے ٹھیک ہے کہہ دیا اور سنیل کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے گھر چلنے کی دعوت دی۔

چائے ختم کر کے شکنتلا نے پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"رُوپا کی کوئی تصویر ہے تو دکھا دو۔"

مجھے شکنتلا کے چہرے پر رنج و کرب کے خطوط پڑھنے کو ملے اور اس کی آنکھیں بس برسنا ہی چاہتی تھیں۔ مجھے وہ البم دکھانا پڑا جس کی پہلی تصویر جامن، پل مولسری کے انیل کی تھی جس کو سنیل بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر البم کے آخری ورق پر میری ایک تنہا تصویر دیکھ کر شکنتلا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر شکنتلا نے اجازت چاہی اور دونوں ماں بیٹے گھر سے رخصت ہو گئے۔ اور میں تنہا اپنے گھر کی سفیدی کے بارے میں سوچتا رہا ▲▼

کو دجاتی اور زخمی ہو جاتی میں چاہتا کہ اُس کے زخمی گھٹنے کی ریت صاف کر دوں لیکن وہ فراک نیچے کھینچ کر خفا ہو جاتی اور اکثر اس کی میری لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔

ہمارے پتاجی نائب تحصیلدار تھے۔ رات کو جب وہ سو جاتے بستر پہ میری آنکھیں جلتی رہتیں، ذہن سلگتا رہتا اور جامن کے پیڑ، پلّ اور مولسری کے اطراف ہی گھومتا رہتا جہاں مضبوط اعصاب کا لمبے دانت والا لڑکا علی حسن اپنی نیکر کی جیب سے شکنتلا کو کالے کالے جامن دیتا ہوا نظر آتا کیونکہ کالے جامن شکنتلا کو بہت پسند تھے۔

علی حسن ہمارے گاؤں کے محبوب حسین زمین دار کا تیسرا لڑکا تھا شکنتلا کے پتا اور چاچا انہیں کی زمین کے حصہ پر گنا اور لال مرچی پیدا کرتے تھے جس سے سال میں دو بار زمین دار کو اچھی آمدنی تھی۔ محبوب حسین زمین دار اور شکنتلا کے پتا ایک دوسرے کے مخلص اور دوست تھے۔ دونوں میں اونچ نیچ ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ عورتیں بھی ایک دوسرے کے گھر آتی جاتیں۔ جب دیپاولی آتی تو سارے گاؤں کے گھروں کے ساتھ ساتھ زمین دار محبوب حسین کے گھر کو بھی رواداری میں لیپ دیا جاتا۔ صحن کے منڈوے کونے میں آم کے پتے بھر دیئے جاتے اس منڈوے کے نیچے زمین دار آرام کرسی پر بیٹھا کھیت مزدوروں کو دیپاولی کا انعام دیتا۔ پیچھے ایک طرف دھرم راج کمہار اور اسمعیل مجاور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔

بوڑھا جولاہا سنہرے گوٹے کا رومال بناکر ہر سال کی طرح زمین دار کو پیش کرتا جب میں پتاجی کے ساتھ عید ملنے جاتا تو میرے کپڑوں پر عطر مل دیا جاتا اور میں دیکھتا کہ چراغوں کی قطاریں شکنتلا کے گھر سے شروع ہو کر زمین دار کی دیوار پر سے ہوتے ہوئے دروازے پر ختم ہو جاتیں۔

کیونکہ دونوں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ حسن اور شکنتلا صبح ہی صبح میل بھری آنکھوں سے ملتے اور کھیتوں میں دُور دُور تک دوڑتے پھرتے۔ میرا بھی دل چاہتا کہ دوڑتے پھروں لیکن مجبوری یہ تھی کہ ہمارا گھر یہاں سے ذرا دور تحصیل کے دفتر میں واقع تھا۔ پتاجی ایک آفیسر کہلاتے تھے۔ سارے گاؤں میں بڑی دھاک تھی اور پھر پتاجی کے پاس ہی سارے گاؤں میں ایک اچھی سیکل تھی جس کو چپراسی روزانہ گھر پر ہی تیل لگا کر صاف کرتا۔ سیکل کو ہاتھ لگانے مجھ پر پابندی تھی کیونکہ پتاجی اصول پسند آدمی تھے۔

زمین دار کا بیٹا حسن گھوڑے پر بیٹھ کر پوز کرتا بالکل اسی طرح جس طرح ہماری تاریخ کی کتاب میں شیواجی کا تھا۔

جب شکنتلا سیکل اور گھوڑے کا [illegible]
ساتھ تقابل کرتی تو [illegible]
کی وسعت میں [illegible]
رنگ برنگ کے پھول [illegible]
شکنتلا اپنی ماں کے ساتھ [illegible]
سجائے مندر جاتی اور [illegible]
ساتھ شیواجی کا وہ [illegible]
ہمارے [illegible]

[illegible]
جوانی محبت
رہی، ہماری ملاقات
کبھی سر [illegible]
تو پہلو میں درد ہو
سردیوں کے شبنمی قطرے [illegible]
دیکھو شکنتلا یہاں چھپی [illegible]
کھل کھلا کر ہنس پڑے [illegible]
چاندنی میں شکنتلا [illegible]
کی سانس رک جاتی [illegible]
اور ڈر سے [illegible]
میں پہنچا تو [illegible]
ایک آخری [illegible]
میرے آنسو [illegible]
اور امانت [illegible]
پھر ایک [illegible]
آیا۔ یہاں [illegible]
کر رہے تھے

پیسکی چاندی

Price

محمد اکرام اللہ خان

فلمنامہ

جنتا گورنمنٹ کے ٹوٹتے ہی فلم والوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ جنتا حکومت سے انھوں نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں اور جن شرائط پہ فلم والوں نے جنتا پارٹی کی انتخابی مہم میں حصّہ لیا تھا۔ ان کا پورا ہونا تو کجا شنوائی تک نہ ہو سکی۔ آپ کو یاد ہوگا پہلی مرتبہ فلم والوں نے کانگریس کے خلاف کھُل کر مہم چلائی تھی وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ اس وقت کے وزیر اطلاعات مسٹر شکلا سے تنگ آگئے تھے اس کے علاوہ دیگر مرکزی وزرا اور مسٹر سنجے گاندھی کی زیادتیوں نے بھی انھیں کافی پریشان کر رکھا تھا۔ حکومت کا رویہ فلم والوں کے ساتھ بالکل اسی طرح کا تھا جس طرح ایک بڑا افسر اپنے چپراسیوں سے سلوک کرتا ہے۔ ایک مرتبہ دیو آنند کو شکلا صاحب سے ملنے کے لئے تین دن ان کے دفتر میں بیٹھنا پڑا تھا اس کے باوجود ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ اور وہ مایوس لوٹ آئے تھے۔ کانگریس حکومت کے اسی رویے کی بدولت فلم والوں نے جنتا پارٹی کا خلوص کے ساتھ دیا۔ جنتا پارٹی کی تائید میں فلمی دنیا کی کئی اہم شخصیتوں کے علاوہ دیو آنند، شتروگھن سنہا اور پران نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ جنتا پارٹی جیت گئی۔ فلم والوں نے جنتا وزراء کو گاندھی جی کی سمادھی پر حلف لیتے ہوئے بھی دیکھا۔ مسٹر اڈوانی مسٹر شکلا کی جگہ وزیر اطلاعات مقرر ہوئے آغاز اچھا تھا۔ فلم والوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن اڈوانی صاحب نے بہت جلد اپنے وعدے فراموش کر دیئے اور ریڈیو، اخبار، اور دوسرے شعبوں کو آر۔ ایس۔ ایس کے زیر اثر لانے کی کوششوں میں ایسے مصروف ہو گئے کہ انھیں فلم والوں سے کئے گئے وعدے قطعی یاد نہ آسکے۔ وزیر موصوف کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ میوزک ڈائرکٹر کلیان جی کہا تھا کہ

"جن لوگوں نے اندرا گاندھی اور ایمرجنسی کو شکست دے کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اب ان کے لئے اس ممکن کو قائم رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

★

دھرمیندر بڑی انوکھی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی ہر بات اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ مینا کماری سے ہیما مالنی تک ہر بڑی ہیروئن کا تذکرہ اس سے وابستہ رہا۔ کبھی اس کی شراب نوشی کے چرچے ہوئے تو کبھی اس کی عاشقی کا بازار گرم رہا۔ یہ سب باتیں درست ہوں یا نہ ہوں ایک بات بالکل صحیح ہے کہ دھرمیندر دوست نوازی میں اپنی مثال نہیں رکھتا ہر وہ شخص جو اس کے برے دنوں کا ساتھی تھا آج بھی دھرمیندر کا اتنا ہی رفیق اور دوست ہے اس کے گھر پر رشتہ داروں اور دوستوں کا ہمیشہ میلا لگا رہتا ہے ہر جانا پہچانا بلا روک ٹوک دھرمیندر کے گھر میں چلا جاتا ہے۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ دھرمیندر کے گھر ایک بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بلائے ہوئے مہمانوں سے زیادہ بن بلائے مہمانوں کی تعداد پارٹی میں شریک تھی۔ رات دیر تک شراب و کباب کی محفل گرم تھی۔ نشہ میں بدمست لوگ آتے اور جاتے رہے۔ جب صبح کے قریب پارٹی ختم ہوئی تو سب لوگ اپنے گھروں کو واپس ہو گئے لیکن جب صاحب خانہ دوسرے دن بڑی دیر کے بعد جاگے تو کیا دیکھتے ہیں ڈرائنگ روم میں صوفوں پر ایک مرد اور ایک عورت بلا تکلف آرام کر رہے ہیں۔ دھرمیندر نے گھر کے تمام لوگوں کو بلوا کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر یہ کس کے شناسائی ہیں۔ جب تمام لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی تو دھرمیندر ان کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اور جب وہ بہت دیر گئے نیند سے جاگے تو سلام دعا کے بعد دھرمیندر نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگ رات اپنے گھر کیوں نہیں گئے جس پر دھرمیندر کو جواب ملا کہ وہ دونوں الہ آباد کے رہنے والے ہیں بمبئی شہر دیکھنے کی

غرض سے آتے تھے۔ یونہی سیر و تفریح کی نذر ہو گئی۔ اپنے کسی شناسا کی تلاش میں جب اتفاق سے ادھر سے گذرے تو انھیں یہاں بڑی رونق نظر آئی۔

دوسرے مہمانوں کے ساتھ بلا روک ٹوک اندر آ گئے۔ سب کے ساتھ ہی گھل کر شراب پی اور کھانا کھایا اور چونکہ بمبئی میں کہیں ٹھکانا نہیں تھا اس لیے یہیں سو رہے جب انہوں نے کھانے اور شراب کی تعریف کرتے ہوئے صاحبِ خانہ کا شکریہ ادا کیا تو دھرمیندر کو ان کی سادگی اور صاف گوئی بے حد پسند آئی پھر اس نے ان کو مزید ایک اور دن مہمان رکھ کر دوسرے دن واپسی کا انتظام کر دیا۔

*

ابھی ابھی ایک خبر نظروں سے گذری ہے کہ پاکستان میں رمضان کے احترام میں تمام سینما گھر بند کر دیئے گئے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایک تو اسلامی حرکت ہوئی لیکن حکومت پاکستان کا یہ اقدام بعض حلقوں میں آج کل موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ جہاں مختلف عقاید اور مذاہب کے لوگ بستے ہیں وہاں ایک عقیدے کے تحت زندگی کو بے رنگ اور تفریح سے محروم کرنا کہاں تک درست اقدام [illegible]

تماشائی

فلمی ڈائری

اسکائی لیب نے ساری دنیا میں سنسنی پھیلادی تھی۔ ہندوستان تو خاص طور پر خوف و دہشت کا شکار تھا کیونکہ جنوبی ہند دنیا کے ان علاقوں میں شامل تھا جہاں اس کے گرنے کے اندیشے تھے۔ بمبئی کی فلمی دنیا بھی اس سنسنی کی لہر سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ ۱۱ر جولائی کو جس دن اسکائی لیب کرۂ ارض کی فضا میں داخل ہوا۔ بمبئی کے سینما گھروں میں تماشائیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت سے لوگوں نے جنہوں نے مختلف فلموں کی اڈوانس بکنگ کروائی تھی، فلم دیکھنے کی بجائے گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔ سنیل دت نے لندن سے واپس آنے کے بعد ۱۶ر جولائی کو ایک پارٹی دی تھی ہر ایک کی زبان پر اسکائی لیب کا تذکرہ تھا اور لوگ اپنے اپنے انداز میں خوف و ہراس کا اظہار کر رہے تھے لیکن فلم ساز راج کرو ور بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ جب ان سے خاموشی کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے بے تعلقی کے سے انداز میں جواب دیا میری فلم "طاقت" تو نورنگ لیب میں ہے مجھے اسکائی لیب سے کیا لینا دینا۔ اور لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ اس محفل میں ایک نوجوان ڈسٹری بیوٹر کرتی جوشی بھی شریک تھا [illegible] جب اسکائی لیب فضا میں چھوڑا گیا تھا میں نے اپنے والد کے ڈسٹری بیوشن کے کاروبار میں عملی حصہ لینا شروع کیا تھا آج جب اسکائی لیب زمین پر آ رہا ہے تو کہیں وہ مجھے ہی اپنا نشانہ نہ بنا لے۔

کرتی جوشی کی زبان بہت منحوس ثابت ہوئی اس کی کالی زبان نے اس کی بیوی اور بچوں کے مستقبل کو تاریک کر دیا۔ یہ نوجوان ڈسٹری بیوٹر اسکائی لیب کا نشانہ تو نہیں بنا لیکن اسکائی لیب کے زمین پر گرنے سے چار دن پہلے موٹر کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔

اسکائی لیب جس دن گرنے والا تھا اس دن کرتی جوشی کا تعزیتی جلسہ تھا جس میں سینما گھروں کے مالکوں اور ڈسٹری بیوٹروں کے علاوہ فلمی دنیا کی کئی اہم شخصیتیں شریک تھیں۔

پرکاش مہرہ یورپ اور امریکہ کے دورے سے واپس لوٹ کر اخبار نویسوں کو بتا رہے تھے کہ امریکہ میں ان کے دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک پارٹی دی۔ جس میں ایک دوست نے مزاحیہ انداز میں ان سے دریافت کیا کہ وہ کیا پینا پسند کریں گے؟ انہیں پینے کے لئے سب کچھ مل سکتا ہے سوائے "اس" کے۔ یہ "اس" مرارجی دیسائی کے مشروب [illegible] سن کر چپ ہو رہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں گالیاں دیں۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ گالیاں اپنے دوست کو دیں یا مرارجی بھائی کو ...! ویسے پرکاش مہرہ نے جن کی فلم "مقدر کا سکندر" باکس آفس کا سکندر بنی ہوئی ہے اپنی چوتھی فلم کا اعلان کیا ہے۔ یہ فلم ہندی اور انگریزی میں ایک ساتھ بنے گی۔ امیتابھ بچن اور امجد خاں کے علاوہ ہالی ووڈ سے ایک نیگرو ہیرو کو لیا جائے گا۔ دو ہیروئنوں میں ایک ہندوستانی ہوگی اور دوسری ہالی ووڈ کی۔ فلم ۷۰ یم۔ ایم میں بنائی جائے گی جس کی موسیقی کلیان جی آنند جی دیں گے۔ ہندی فلم کے مکالمے قادر خاں تحریر کریں گے۔

مرارجی دیسائی کی حکومت کے زوال پر فلم والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "جوالا مکھی" کے سیٹ پر شتر گھن سنہا، پران اور پرکاش مہرہ نے ایل۔ کے اڈوانی سے نجات پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان تینوں نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے موقع پر جنتا پارٹی کی بڑی زور و شور سے تائید کی تھی۔ شتر گھن سنہا نے کہا کہ اڈوانی نشر و اشاعت کے وزراء میں سب سے بدترین ثابت ہوئے جنتا پارٹی نے پہلے تو فلموں پر لیوی کو بڑھا دیا پھر سیلس ٹیکس بل پیش کیا جس میں فلموں کے ڈسٹری بیوشن پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا ہے

[illegible] کی فلم "نوری" باکس آفس

یہ بہت زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی ہے لیکن سپر ہٹ "نوری" نے یش چوپڑہ کی گولڈن جوبلی فلم "کبھی کبھی" کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جہاں "نوری" کی نمائش پر ڈسٹری بیوٹر کو تین ہفتوں میں ایک لاکھ روپیے کا منافع ہوا ہے جبکہ "کبھی کبھی" کی نمائش پر ڈسٹری بیوٹر کو (۱۹) ہفتوں میں صرف ایک لاکھ بیس ہزار روپیے ملے تھے۔

ہالی ووڈ کی شاہ کار فلم STAR - WARS نے باکس آفس کی کامیابی میں ساری دنیا کی فلموں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کی لاگت پر ۸ کروڑ روپیے صرف ہوتے تھے جبکہ اس فلم نے ۳۶ ہفتوں میں ۲۷۲ کروڑ کا بزنس کیا ہے۔

شرمیلا ٹیگور کے شوہر نواب آف پٹوڈی کو کرکٹ کی دنیا میں اور عام طور پر ٹائیگر (شیر) کہا جاتا ہے۔ شرمیلا ٹیگور ٹائیگریس (شیرنی) تو نہیں بن سکی۔ لیکن اس کی ایک آنے والی فلم "باگنی" (شیرنی) ہے۔

ہمارے ہاں فلم ساز اور ہدایت کار فلموں کی مہورت کرنے سے پہلے جیوتشی سے شگون نکالتے ہیں اور کسی موزوں اور مناسب دن فلم کی مہورت کی جاتی ہے۔ فلم کے نام کے سلسلے میں بھی جیوتش کے ہندسوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن ہالی ووڈ میں ایک فلم ساز نے ہمارے وہمی وشکی فلم سازوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ فلم ساز جاپانی ہے جو ایک بہت بڑی فلم "OHINCHO N" بنا رہا ہے۔

اس نے اپنی فلم کیلئے ایک روحانی خاتون جوتشی کی خدمات حاصل کی ہیں جو فلم کے اسکرپٹ سے لیکر اداکاروں اور شوٹنگ تک ہر معاملے میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اس خوبصورت جوتشی کا نام ہے جین ڈکسن، جس نے کینیڈا کے قتل کی پیشن گوئی کی تھی۔

گلزار کی فلم "دیوداس" کی شوٹنگ جو ایک عرصے سے بند تھی پھر شروع ہو گئی ہے۔ پچھلے دنوں پانچ دن کی شوٹنگ میں دھرمیندر، ہیما مالنی، سلتین کپوا اور انور حسین نے حصہ لیا۔ اس فلم کے پروڈیوسر کیلاش چوپڑہ ہیں۔ اور موسیقی آر ڈی برمن کی ہے سہگل اور دلیپ کمار کے بعد یہ تیسری "دیوداس" ہے جس کا ہیرو دھرمیندر ہے۔

پاکستان میں عورتیں ہیروئینیں ہی نہیں بلکہ ہدایت کار بھی ہیں۔ لیکن ہمارنا فلمی دنیا میں ابھی کسی صنف نازک نے ہدایت کاری کے میدان میں قدم نہیں رکھا۔ اب پہلی مرتبہ ایک ٹامل ہیروئن اپنی فلم کی ہدایت دے رہی ہے۔ یہ فلم ہندی فلم "کھٹا میٹھا" کی کہانی پر بنائی جا رہی ہے۔

کسی زمانے میں دھرمیندر کا ٹیلیفون نمبر ۵۷۸۷۹۷ تھا اب یہ نمبر ہدایت کار روی ٹنڈن کا ہے دھرمیندر کے شیدائی اب بھی اسی نمبر پر دھرمیندر سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ روی ٹنڈن کو بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑانا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں جب ایک فون کال کے جواب میں روی ٹنڈن نے کہا کہ دھرمیندر اس نمبر پر نہیں رہتے ہیں تو دھرم کے مشتاق نے روی ٹنڈن سے کہا "آپ مجھے جا دھرمیندر جی کو خبر کر دیں ہم ہیما مالنی کے گھر سے بات کر رہے ہیں۔

ہدایت کار دلال گوہا سائی بابا کے بہت معتقد ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کی فلم کمپنی کا نام سائی چترا رکھا ہے۔ ناسک میں ان کے باغ کا نام سائی باغ ہے۔ ان کے گھر کا نام سائی کیٹر ہے وہ خود سائی بابا تنظیم کے بڑے سرگرم کارکن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۷۵ء میں جب وہ اپنی فلم "چاند اور سورج" کی نمائش کے بعد سائی بابا کے درشن کیلئے جا رہے تھے تو راستے میں ان کی کار خراب ہو گئی۔ ڈرائیور نے کہا کہ ابھی پانچ منٹ میں وہ کار درست کر دیگا۔ لیکن کار ایک گھنٹے تک بھی درست نہیں ہوسکی۔ دلال گوہا نے زچ ہو کر کہا کہ اگر کار پانچ منٹ میں درست نہیں ہوگی تو وہ سائی بابا کے درشن کے لئے نہیں جائیں گے اور پھر سائی بابا کا کرشمہ یہ ہوا کہ کار دو منٹ ہی میں درست ہو گئی۔

Registered with the Registrar of Newspaper-Registered No. 8285/64

:: 6 Phone: 52957

POONAM URDU MONTHLY

e : Azampura, Hyderabad-500 024 Editor ; Nasir Kurnooli, M A

Price 1-25
September

e: 52957

ooll, M A

n

TED

I.A.S.

ماعت کا پندرھواں سال — جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت — علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد (۱۵)
شمارہ (۹)
ستمبر ۱۹۷۹ء

یٹر:۔
ناصر کرنولی

سالانہ ۱۵ روپے
زیریز کیلئے ۲۰ " "
دنی ممالک سے ۲۵ شلنگ

پونم

خط وکتابت کا پتہ
مینجر ماہ نامہ "پونم"
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدرآباد 24

ترتیب

مطبوعہ:۔ دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

گرہست خواتین اور مالکین ہوٹل متوجہ ہوں

سنگارینی کالریز کمپنی لمیٹڈ

اب پیش کر رہی ہے

کفایت بخش، قابلِ اعتماد، بغیر دھوئیں کا ایندھن،
مسلسل پانچ (۵) گھنٹے تک سلگتا رہے گا۔ برتن بھی صاف رہیں گے

۴۰ کیلوگرام تھیلے کی قیمت صرف ۲۲ روپے
تفصیلات کیلئے ربط پیدا کیجئے

میسرز یونین کول ڈپو۔ ملے پلی حیدرآباد

اسی وقت فون کیجئے، ہم موجود ہیں۔ فون: 220056: 481
سربراہی فوری آپ کے مکان پر۔

سلیم تمنائی — قسط نمبر ۲

آبروئے ادب
رشید احمد صدیقی

رشید صاحب نے لفافہ چاک کر کے قادر صاحب کی چھٹی پڑھنا شروع کی۔

"اچھا تو نئے صاحب زادے تشریف لا رہے ہیں؟" آپ نے مسکرا کر فرمایا اور ہم اس بات کی تہہ کو پہنچ گئے کہ قادر صاحب نے اپنے گھر نئے مہمان کی آمد آمد کی خبر دی ہے۔

"بھئی! رشید صاحب تعجب سے بولے بھلے آدمی نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔"

"شاید بھول گئے۔" ہم نے وکالت فرمائی یا صفائی پیش کی۔

"خوب! رشید صاحب نے مسکرا کر فرمایا صاحب زادے کے پیدا کرنے میں بھول نہیں ہوئی مگر آپ کا نام لکھنے میں کیسے بھول ہو گئی؟"

ہماری ہنسی میں حافظ محمد عبداللہ حیدرآبادی نے ہمارے نام کی مالا جپنی شروع کر دی اور ہم نے ۱۹۵۸ء کی ملاقات کی بات یاد دلائی تو کچھ یاد کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ "ہماری زبان" میں بھی لکھتے ہیں نا!

ہم نے نہایت انکساری میں صرف "ہاں" کہا۔ اس پر وہ مسکرا کر بولے! بھئی! آپ تو خلصے بدنام آدمی ہیں!"

ہم اس بدنامی پر دل ہی دل میں سچ مچ خوش ہو گئے کیوں کہ اس بدنامی میں ہماری نیک نامی تھی۔ ہمت افزائی، بزرگانہ شفقت اور کیا کچھ اس لفظ میں نہیں تھا۔ اُن کا اپنا طرز تھا اور وہ اس طرز کی ابتدا بھی تھے اور انتہا بھی۔

"دیکھئے سلیم صاحب! آپ کل ضرور آئیے۔" رشید صاحب نے فرمایا۔ طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ سلیم تمنائی کی حیثیت سے۔"

ہم خدا حافظ کہہ کر لوٹ آئے۔

ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ میسور میں بڑوں اور بزرگوں کو ان کے نام سے خطاب نہیں کیا جاتا۔ یہ بات بے ادبی میں شمار ہوتی تھی۔ "حضرت" "حضرت قبلہ" وغیرہ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں لفظ "جناب" بھی "حضرت" کے مقابلے ایچ سمجھا جاتا تھا لیکن شمال میں اس کا رواج نہیں۔ خصوصاً ان معنوں، موقع اور محل پر۔ رشید صاحب میسور میں ہوتے تو ہم "حضرت" کل ضرور حاضر خدمت ہو جاؤں گا "قبلہ بات یہ ہے" "خدا حافظ" "حضرت" وغیرہ کہتے۔ رشید صاحب کو

رشید صاحب یعنی ان کے اپنے نام سے خود انہیں مخاطب کرتے شرم محسوس ہوتی تھی۔ رواج کے بندھن میں محصور جو تھے! رواج آگے چل کر عادت اور عادت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ بہرحال ہم نے ایسا محسوس کیا جیسے ہم سے کوئی خطا ہو رہی ہے جرم و قصور کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ہم دوسرے دن جانے سے رہے کیوں کہ "امتحان کا چکر تھا۔ دو چار دن بعد اس چکر سے کُلّی نہیں جزوی طور پر نکل رشید صاحب کے در دولت پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں دل کا عارضہ ہے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ قسمت پر افسوس کرتے یا کوستے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے مکان ہم سب چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اصل حقیقت بتائی کہ رشید صاحب کے کوئی عزیز دوست سخت علیل ہیں۔ لہذا اس علالت نے آپ کو بُری طرح متاثر کیا اور نتیجے میں دل کا دورہ پڑا ہے۔ آخر دل ہی تو ہے ہم نے دل میں کہا۔ لیکن کتنا حسین، اہل دل بزرگوں کا دوست اور محبت نواز دل۔

گرمی بڑھ رہی تھی۔ ہم اکیلا کسی دوست کے گھر ٹھہرا نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ میرا کاروان تھا لہذا سرائے میں قیام رہا۔ مسافر سرائے میں ہی رہے تو بہتر ہے۔

امتحانی کشمکش کی کھینچی ہوئی لکیر کو پھلانگ چکے تھے اور میسور جانے کے لیے سیٹ بھی ریزرو کرا دی تھی۔ محترمی خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی بھی پرانے شناسا تھے۔ مخلص اور اچھے ادیب و شاعر بھی، اتنا سے مل کر "جنوبی ہند کا بہترین ادب" ان کی نذر

سلیم تمنائی

قسط نمبر ۲

آبروئے ادب رشید احمد صدیقی

رشید صاحب نے لفافہ چاک کر کے قادر صاحب کی چھٹی پڑھنا شروع کی۔

"اچھا تو نئے صاحب زادے تشریف لاتے ہیں؟" آپ نے مسکرا کر فرمایا اور ہم اس بات کی تہہ کو پہنچ گئے کہ قادر صاحب نے اپنے گھر سے مہمان کی آمد آمد کی خبر دی ہے۔

"بھئی! رشید صاحب تعجب سے بولے پچھلے آدمی نے آپ کا ذکر نہیں کیا۔"

"شاید بھول گئے۔" ہم نے وکالت فرمائی یا صفائی پیش کی۔

"خوب! رشید صاحب نے مسکرا کر فرمایا صاحب زادے کے پیدا کرنے میں بھول نہیں ہوئی مگر آپ کا نام لکھنے میں کیسے بھول ہو گئی؟

ہماری ہنسی میں حافظ محمد عبداللہ حیدرآبادی نے ہمارے نام کی ملا جپنی شروع کر دی اور ہم نے ۱۹۵۸ء کی ملاقات کی بات یاد دلائی تو کچھ یاد کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ "ہماری زبان" میں بھی لکھتے ہیں نا!

ہم نے نہایت انکساری میں صرف "ہاں" کہا۔ اس پر وہ مسکرا کر بولے! بھئی! آپ تو غلط بدنام آدمی ہیں!"

ہم اس بدنامی پر دل ہی دل میں سچ مچ خوش ہو گئے کیوں کہ اس بدنامی میں ہماری نیک نامی تھی۔ ہمت افزائی، بزرگانہ شفقت اور کیا کچھ اس لفظ میں نہیں تھا۔ اُن کا اپنا طرز تھا اور وہ اس طرز کی ابتدا بھی تھے اور انتہا بھی۔

"دیکھئے سلیم صاحب! آپ کل ضرور آئیے۔" رشید صاحب نے فرمایا۔ طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ سلیم تمنائی کی حیثیت سے۔"

ہم خدا حافظ کہہ کر لوٹ آئے۔

ہمارے لئے مشکل یہ تھی کہ میسور میں بڑوں اور بزرگوں کو ان کے نام سے خطاب نہیں کیا جاتا۔ یہ بات بے ادبی میں شمار ہوتی تھی۔ "حضرت" "حضرت قبلہ" وغیرہ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں لفظ "جناب" بھی "حضرت" کے مقابلے ہیچ سمجھا جاتا تھا لیکن شمال میں اس کا رواج نہیں۔ خصوصاً ان معنوں، موقع اور محل پر۔ رشید صاحب میسور میں ہوتے تو ہم "حضرت" کل ضرور حاضر خدمت ہو جاؤں گا "قبلہ بات یہ ہے" "خدا حافظ" "حضرت" وغیرہ کہتے۔" رشید صاحب کو رشید صاحب یعنی ان کے اپنے نام سے خود انہیں مخاطب کرتے شرم محسوس ہوتی تھی۔ رواج کے بندھن میں محصور جو تھے! رواج آگے چل کر عادت اور عادت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ بغرض ہم نے ایسا محسوس کیا جیسے ہم سے کوئی خطا ہو رہی ہے جرم و قصور کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ہم دوسرے دن جانے سے رہے کیوں کہ "امتحان کا چکر تھا۔ دو چار دن بعد اس چکر سے کلی نہیں جزوی طور پر نکل، رشید صاحب کے در دولت پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں دل کا عارضہ ہے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ قسمت پر افسوس کرتے یا کوستے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے مکان ہم سب چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اصل حقیقت بتائی کہ رشید صاحب کے کوئی عزیز دوست سخت علیل ہیں۔ لہذا اس علالت نے آپ کو بُری طرح متاثر کیا اور نتیجے میں دل کا دورہ پڑا ہے۔ آخر دل ہی تو ہے ہم نے دل میں کہا۔ لیکن کتنا حسین، اہل دل بزرگوں کا دوست اور محبت نواز دل۔

گرمی بڑھ رہی تھی۔ میں اکیلا کسی دوست کے کمرے میں رہ نہیں سکتا تھا کیوں کہ میرا کا روا تھا لہذا سرائے میں قیام رہا۔ مسافر سرائے میں ہی رہے تو بہتر ہے۔

امتحان ملکشمن کی کھینچی ہوئی لکیر کو پھلانگ چکے تھے اور میسور جانے کے لیے سیٹ بھی ریزرو کرادی تھی۔ محترمی خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی بھی پرانے شناسا تھے۔ مخلص اور اچھے ادیب و شاعر۔ ان سے مل کر "جنوبی ہند کا بہترین ادب" ان کی نذر

جہاں مختصر رسالہ اردو ادب میں حضرت نظام
الدین اولیاؒ، حضرت کاکیؒ، امیر خسرو، چچا غالب
کے دیار اور لال قلعہ کی عمارت کے ساتھ زندہ
ادیب، جیسے مہرتی گوپال متل، سجاد محمود سعیدی
اور عرش ملسیانی کے دیدار سے بھی مشرف ہو
کر میسور پہنچا۔

ماہنامہ (انٹرکالجیٹ) میسور کے سالنامے
کی اشاعت کے لئے میں نے اپنے بزرگ دوستوں
ادبا و شعراء کے مضامین نظم و نثر اور پیغامات
کے لئے خطوط لکھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب
جعفر علی خاں اثر، مولانا صلاح بادی، رشید احمد صدیقی
گوپال متل، آل احمد سرور، سید محمد فاروقی، سید
احتشام حسین وغیرہ نے بھی مجھ پر بڑا کرم فرمایا
تھا۔

رشید صاحب کا فی دلچسپ پیغام
روانہ کیا اور پیغام کے اوپر ذاتی خط لکھا تھا۔
میں نے پیغام بصورت مضمون بعنوان "پیوستہ
رہ شجر سے امید بہار رکھ" شائع کر دیا۔

۶۹-۱۲-۲۱ ،

مکرمی تسلیم۔

نوازش نامہ مورخہ ۲۵ دسمبر صادر
ہوا۔ آپ نے اپنا تعارف کرانے میں بڑی تفصیل سے
(لیکن راقم نے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر تفصیل سے
کیا تھا) سے کام لیا ہے۔ جس کی ایسی ضرورت
نہ تھی۔ آپ نے "ایشیا" (۲) ہفتہ وار
"ایشیا" دہلی میں بعنوان "ایک ادبی ملاقات" اپنی
پہلی اور تیسری ملاقات کا ذکر اور اپنی عقیدت کا
اظہار کیا تھا) میں جس مضمون کا ذکر کیا ہے وہ تو
میری نظر سے نہیں گزرا لیکن زیر نظر محبت نامے
میں جو باتیں جس محبت و مہربانی سے لکھی ہیں غالباً
"ایشیا" میں اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے
لکھا ہوگا۔ اس سے خوش بھی ہوں شرمندہ بھی،
شرمندہ اس لئے کہ ویسا ہوں نہیں جیسا آپ
اپنے کرم سے سمجھتے ہیں۔ آپ کا شکریہ بھی
ادا کرتا ہوں اس لئے (۳ یہ بڑوں کی بڑائی ہے)
مگر قاعدہ یہ ہے کہ ہم اپنے خوردوں کا
شکریہ ادا نہیں کرتے۔ اُن کو دعائیں دیتے
ہیں۔ آپ کے لئے دونوں ہیں۔ (۴) (یہ راقم کی
خوش قسمتی ہے کہ ایک بزرگ نے اس کے
دعائیں بھی دیں) عبدالقادر صاحب کو سلام
پہنچائیں اور اُن کی بیوی بچوں کو دعائیں۔ اُمید ہے
وہ خوش و خرم ہوں گے۔ اپنے بھی دوسروں
سے بھی، آپ نے اپنے اردو میگزین کے لئے
پیغام طلب کیا ہے۔ پیغام دینے کا اپنے کو
اہل نہیں سمجھتا۔ اس طرح کے مشغلے بڑے لوگوں
کو زیب دیتے ہیں۔ گو ان میں سے بہتوں کا پیغام
پڑھ کر بڑا بننے یا کہلانے کا شوق بے جان نہیں
تو نیم جان ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ مقتبس (یہ
آخری سطور رشید احمد صدیقی مرحوم کے طنز و مزاح
کے آئینہ دار ہیں۔ ہلکا سا تبسم آپ کے ہونٹوں
پر ہے۔ دل میں یہ چٹکیاں بھی لے رہا ہے
اس سیاسی دور میں دین و دنیا کے ہر مسئلہ پر
ہر سیاسی آدمی کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے یا بقول رشید
صاحب خانہ پُری کرتا ہے، یا عوام یہ کام اس
سے کراتے ہیں تاکہ ان کی سرکار میں ان کے چھپنے
کام آزادانہ رہے ہوں) کی بات نہیں کہتے
بے وقوفوں کی مانند خانہ پُری کرتے ہیں۔

"پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ"

اُردو کا مسئلہ پیغام دینے کا نہیں، چیلنج
قبول کرنے کا ہے اور میں اسے نہایت درجے
نیک فال اور اُمید افزا سمجھتا ہوں کہ آپ ملک کے اس
دُور دراز گوشے میں اور بہت سے ذرائع اور
وسائل سے محروم رہ کر اُردو کا دیا جلائے رکھنے
اور اس کو آندھیوں کے صدمے سے بچانے کا
حوصلہ رکھتے ہیں۔ قوم اور ملک کے لئے نوجوان
یوں بھی کیا کم نعمت ہوتے ہیں، چہ جائیکہ آپ
ایسے نوجوان جو ایک اعلیٰ مقصد کی حمایت کرنے
پر آمادہ ہیں، میں ایسے نوجوانوں پر فخر کرتا ہوں۔
مشکل یہ ہے کہ اُردو کی صفات اور اس کی
گراں بہا خدمات ہی اس کی خود قرار دادِ جرم
کی سب سے زیادہ سنگین دفعات ہیں۔ پھر کس
کا واسطہ دلا کر دوسروں سے اس کی تائید کی درخواست
کروں؟ البتہ ایک عمر معلمی کرنے اور نوجوانوں کے
ساتھ رہنے سے یہ بات دل میں راسخ ہو گئی ہے کہ
بات کتنی ہی معمولی ہو اگر وہ مفید اور معقول ہے
تو اسے گوش گزار ضرور کر دینا چاہیئے۔ اچھے ذہنوں
میں وہ جگہ بنا لیتی ہے اور جڑ پکڑ لیتی ہے
چاہے اس کے برگ و بار لانے میں کتنی ہی دیر
کیوں نہ لگ جائے۔ اپنے اس تجربے یا عقیدے
پیش نظر رکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ اُردو ہندوستان
میں اور ہندوستان کی ایک قابلِ فخر جدید زبان
ہے۔ اس لئے کہ اس کے بنانے اور بڑھانے
میں ملک کے ہر طبقے کا چھوٹا بڑا اپنی اپنی ضرورت

اور اپنی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے مطابق بغیر کسی جبر یا
لالچ کے شعوری یا غیر شعوری طور پر سرگرم کار رہا ہے
اُردو نے بحیثیت زبان اور بحیثیت تہذیب
ہندوستان کی جو ہمہ گیر خدمت انجام دی ہے اس کی
ساتھی زبانیں انجام نہیں دے پائیں۔۔۔ لیکن جس
طرح اقوام کی تقدیریں بنتی بگڑتی رہتی ہیں زبانوں
کی بھی تقدیر بدلتی رہتی ہے۔ حالات کچھ اس طرح
کے پیدا ہو گئے ہیں جو اُردو کے لئے سازگار نہیں،
اس سے اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا ہے
کیوں اور کیسے؟ اس کو سب جانتے ہیں، ایسی
حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اُردو کو عزیز
اور عزت سے رکھنے والے اس کے تحفظ و ترقی
کے لئے اپنی بہترین تعمیری صلاحیتیں برسرِکار لائیں۔
اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ
ہم کو اپنی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا
آجائے گا۔ اور اس کی مدد سے ہم جلد یا بدیر ان
مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوں گے۔ دو
چیزیں ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ ایک جھگڑنا، دوسرے
مایوس ہونا۔ جھگڑنے اور مایوس ہونے سے وقت
اور طاقت دونوں ضائع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کو
ضائع کر دیجئے گا۔ تو اچھے اور بڑے کام کیوں کر
انجام دیجئے گا۔

نوجوان سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک بات
نہیں کر پاتے۔ انتظار اور تحمل۔ نوجوان ہی جو ٹھہرے
حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ نوجوان ایسا کریں تو
وہ ناقابلِ تسخیر ہو جائیں۔ بوڑھوں میں تحمل و انتظار
خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اس لئے وہ کچھ نہیں
کر سکتے! یہ صفات نوجوانوں ہی کو زیب دیتی
ہیں اور حصولِ مقصد میں انھیں کے وسیلے برگ و
بار لاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو
کو اس کا جائز حق دلانے میں ہم اب تک
ناکامیاب رہے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور
نہیں۔ مخالف قوتوں کی غلط رائی سے یہ سب
کچھ ہوا۔ بایں ہمہ مایوس اور بیزار نہ ہونا چاہئے
اس لئے کہ اس سے اُردو کو نقصان پہنچے گا اور
اس سے اُردو کی مخالف قوتیں اور زور پکڑیں
گی۔ ہم کو اس پر ایمان رکھنا چاہئے کہ اچھے
مقاصد کے حصول میں جو قربانی دی جاتی ہے
وہ رائیگاں نہیں جاتی۔ جلد یا بدیر بالضرور
کامیاب ہوتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ دیر تک
کامیابی کا در بند رہنے سے مقاصد کو نقصان
پہنچتا ہے جیسا کہ اُردو کو پہنچ چکا ہے پھر بھی
اپنے کو حق پر سمجھ کر کوشش کئے جانا چاہئے
آپ اور آپ کے رفقاء ہر اعتبار سے تہنیت
کے مستحق ہیں کہ اتنا مشکل کام خندہ پیشانی سے
کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو
ضرور کامیاب ہوں گے۔ اس پر ایمان رکھیئے۔
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ، ہم سے
بہت پہلے اقبال کہہ گئے ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب نے بڑی سنجیدگی سے بڑی
اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جھگڑنا اور
مایوس ہونا یہ دونوں روگ یا باتیں صرف بڑی
ہی نہیں بلکہ قوموں کی زندگی میں باعثِ زوال و
شکست بھی ثابت ہوئی ہیں۔ اور رشید صاحب
کا یہ ریمارک کتنا سچا ہے کہ ہمارے نوجوانوں
میں تاملِ استغنا ہے اور نہ قوتِ تحمل۔ یہ دونوں
عمل کے لئے زہر ثابت ہوتی ہیں اور انسان کو
محض جذباتی بنا دیتی ہیں۔ پھر ہر لمحہ اور منٹ
انہیں مایوسی کے گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں
پھر قربانی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ ہم اس سے
آنکھ چرانا چاہتے ہیں اور کامیابی بھی ہم سے
آنکھ چرا جاتی ہے۔ صاف بچ کر نکل جاتی ہے اور
جس طرح ٹھہرا پانی گندہ ہو جاتا ہے اسی طرح
دیر تک کامیابی کا در بند رہنے سے مقاصد کو
نقصان پہنچتا ہے۔

خوش قسمتی سے پھر علی گڑھ پہنچا!۔
بھائی عبدالغفار صاحب شکیل کے مکان قیام رہا۔
یہ یونیورسٹی کا پُرآشوب دور تھا۔ پروفیسر،
یونیورسٹی کے حلقے میں [illegible] تھا۔ اس کے
باوجود زندگی کبھی آہستہ خرام اور کبھی رواں دواں
نظر آتی۔

مجنوں گورکھپوری سے پہلی بار زیارت کا
شرف حاصل ہوا۔ انہی صاحب زادی کی شادی پر
مدعو فرمایا۔ سید محمد ٹونکی مرحوم سے خاص رسم و شناسائی
تھی۔ میسور سے تشریف لاتے تھے۔ وہ سراپا
مخلص و شفیق استاد تھے۔ ان کی شخصیت میں کافی
جاذبیت اور دلکشی تھی۔ میں ان سے کافی متاثر ہوا۔

ایک دن جناب نثار قریشی سے ملاقات
ہوگئی تو جامعہ اُردو کے تقسیمِ اسناد کے اجلاس میں
شرکت کی دعوت دی۔ دعوت رقعہ عنایت فرمایا۔
رشید صاحب قبلہ جامعہ اُردو کے نائب شیخ الجامعہ
تھے اور [illegible] شیخ الجامعہ۔ اس اجلاس

جہاں خصوصی سید مسعود حسین صاحب رضوی تھے۔
رشید صاحب چلے آئے۔ نثار قریشی نے انھیں بتایا کہ اس اجلاس میں حقیر بھی حاضر ہے۔ مسکرا کر ہاتھ ملایا اور پوچھا آپ جلسے میں شرکت کے لئے میسور سے آگئے۔
میرے ہاں کہنے پر فرمایا! بھئی! آپ کے خلوص کی حد ہو گئی۔

اور میرا خلوص جلا پا گیا۔ میں نے اپنا رسالہ فاروق رشید صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ناچیز تحفہ فاروقیہ ہائر سکنڈری کے طلباء و طالبات اور اساتذہ کی جانب سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔
رسالے کے اوراق ادھر ادھر سے اُلٹے۔ اپنے خط اور پیام کو دیکھ کر مسکرایا۔ پھر جلسہ شروع ہو گیا۔

صاحب موصوف نے زخیر مقدمی یا اختتامی تقریر فرمائی۔ ایک خاص اور منفرد انداز و لہجہ تھا۔ دل کو چھونے والے الفاظ تھے۔ ہر جملہ خاصے کی تعریف میں آجاتا تھا۔
پنڈت کنزرو کے بارے میں فرمایا۔ حضرات جس طرح اردو غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے اس طرح پنڈت کنزرو جامعہ اردو کی آبرو ہیں۔
جلسے کے اختتام پر منزپر خاصہ جما گیا۔ پنڈت جی سبزی خور تھے اور ہم گوشت خور، ان کے لئے علاحدہ انتظام تھا۔ پنڈت کنزرو اور مسعود حسین رضوی سے حقیر کا تعارف رشید صاحب نے کرایا۔ پھر میرے تعلق سے آپ کے خلوص کی حد ہو گئی والا جملہ دہرا کر مجھے سہما ہی فیاض کر دیا۔

ایک شام میں اور شکیل صاحب دونوں رشید صاحب سے ملنے گھر کی طرف چلے۔ ہم نے ان کو گھر کے قریب، پھر مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ بڑے دھان پان نظر آرہے تھے، پیٹھ کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے وہ چل نہیں رہے بلکہ ہوا انھیں سہارا دیتے یا دھکیلے لئے جارہی تھی۔ میں نے شکیل صاحب سے میسوری لہجے میں کہا۔ " بالکل تنکا ہو گئے ہیں۔ مکان کے اندر، سرسبز و شاداب مہکتے مہکتے آنگن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چمن کے ہر پھول اور پتّی سے بھی صاحبِ مکان کے ذوقِ سلیم کا پتہ چل رہا تھا، کتنے قرینہ سے سجایا گیا تھا چمن۔
دنیا جہاں کی باتیں ہوئیں۔ بدقسمتی سے یونیورسٹی کے متعلق ہوئیں۔ اور ادب کے تعلق سے نہیں۔ میں اکثر رشید صاحب جیسے بزرگوں کے سامنے کہتا کم سنتا زیادہ ہوں۔ اس میں بڑا مزہ ملتا ہے۔ یہ میرے لئے دولت ہے۔ تجربہ ہے۔
ہم اُٹھے۔ مصافحہ کیا۔ پوچھا۔ آپ میسور کب تشریف لے جارہے ہیں!
شکیل صاحب نے کہا۔ کل چلا جاؤں گا۔
میں نے جواب دیا۔ دو دن اور رہوں گا علی گڈھ میں۔

جب تک خط و کتابت کے ذریعے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ مل جاتا۔ زندگی کچھ ایسی مصروف ترین ہو گئی تھی اور کچھ کام تو ایسے تھے جو ہم نے لینے او پر اپنی فطرت سے مجبور

اوڑھ رکھے تھے۔ یا آدمیل مجھ مارو والی بات تھی۔
علم و ادب، درس و تدریس کا میدان اپنی اپنی ذات کی حد تک شوق و ذوق کے ہاتھوں بڑا دلچسپ اور سہانا تو بجائے خود زندگی ہی ہو تاہے۔ بہتوں کے لئے یہ کڑوی دوا پینے اور پلانے والی ہی بات ہے۔ سرسید اور راجا رام موہن جیسے دل و دماغ اور جگر گردے والے بزرگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔
جب بھی ادب کے تعلق سے سمجھنے میں کچھ دقت اور اُلجھن ہوتی باادب آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ " زنجیر ہلائی اور انصاف ملا " کی طرح جہاں میرا زحمت نامہ پہنچا اسی وقت جوابی کرم نامے سے سرفراز و شاد فرمایا۔ آپ کا شمار ان ہستیوں میں تھا جو کسی علمی معاملے میں ممد و معاون ثابت ہونے اور کچھ بخشنے میں حاتم دوراں تھے۔ کسی علمی گتھی کو سلجھانا کچھ بخشنا ہی تو ہے۔
انجمن اشاعتِ اردو میسور کی ایک علمی و ادبی مجلس میں اقبال کے ایک شعر کے مطالب میں اختلاف ہوا تو ہم نے کئی دانشوروں اور بزرگوں کے خطوط لکھے، اکثر حاتم ثابت نہ ہوئے۔ لیکن رشید مرحوم نے فوراً جواب سے شاد و کرم فرمایا۔

رشنبہ ۳۱ جنوری ۱۹۶۷ء
مکرمی! تسلیم، والانامہ مورخہ ۲۷ ابھی موصول ہوا۔ اقبال کے اس شعر کی تعبیر میں ؎
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی ترا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے (راقم ناچیز نے لکھا تھا کہ "میرا اپنا خیال ہے کہ " حرفِ شیریں"

سے مراد کلام اقبال ہے لیکن چند ایک
بزرگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حرفِ شیریں
سے مراد صرف قرآن ہے خواہ مخواہ یہ نوجوان
کٹ حجتی اور تاویلات سے اپنی بات منوانا
چاہتے ہیں۔ گو ایسی بات ہرگز نہیں تھی) یہ ہے
کہ "حرفِ شیریں" سے مراد اقبال (یا شاعر)
کی شیریں نوائی ہے۔ اگر یوں نہیں تو نہ ہو۔ محمدؐ
جبریلؑ اور قرآن تو یقیناً نہیں ہیں۔ ان میں سے
کوئی ایک بھی نہیں۔ آپ نے نوازش نامے
میں بہت سی بھولی بسری باتیں یاد دلائیں
(میں نے پچھلی ملاقاتوں کا ذکر میں وغیرہ کیا تھا
جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔) اس کرم کا
شکر گذار ہوں۔ دعا ہے کہ آپ اور آپ کے
اعزا و احباب سب مع الخیر ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

ایک دن خواجہ محمد شفیع کو [illegible] رہا تھا
چاند کے دیکھنے کے لئے خواجہ صاحب نے لفظ
"محوٗ" کا استعمال کیا تھا۔ "محو و ماہ"
اس لفظ کو میں نے پہلی بار ان معنوں میں پڑھا
تھا۔ میں نے لکھا کہ یہ لفظ کہاں زیادہ بولا
جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بڑی پیاری اور ٹکسالی
زبان لکھتے اور اس زبان کے ماہر ادیبوں میں ان
کا شمار تھا، اس لئے گمان ہوا کہ شاید ٹکسالی
زبان کا لفظ ہوگا یا بیگماتی زبان کا۔
رشید صاحب کا کرم نامہ نظر نواز ہوا۔

سہ شنبہ ۴ مارچ ۷۱ء
ذاکر باغ علیگڑھ یونیورسٹی
علیگڈھ

مجی! سلام مسنون!
۲۶ر ۲ ۱۹۷۱ء (۲۶ فروری ۱۹۷۱ء)
کا نوازش نامہ ابھی موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا
شکریہ۔ "محو و ماہ" سے متعلق آپ نے
جو باتیں دریافت فرمائیں۔ وہ میں نے اپنے مکرم
اور فاضل دوست پروفیسر ضیا احمد بدایونی کو
لکھ بھیجی ہیں اور درخواست کی ہے کہ جواب سے
آپ کو براہ راست مطلع فرمائیں۔ اس مسئلہ
میں موصوف کا قول بہت وقیع ہوگا۔ آپ
پسند فرمائیں یا ضرورت ہو تو براہ راست
حسب ذیل پتے پر گفتگو کر سکتے ہیں۔

PROFESSOR ZIA AHMED OF
BADAUN
C/O
DR. ZAHEER AHMED SIDDIQI
READER IN URDU
DEPT OF URDU
DELHI UNIVERSITY
DELHI - 7

آپ نے جامعہ اردو کی تقریب میں
اپنی گذشتہ شرکت کی یاد دلا کر کتنی خوش گوار
باتوں کی یاد [illegible] تفصیل میں نے جامعہ اردو
[illegible] نے تقسیم اسناد کے اجلاس کے ذکر میں
[illegible] تازہ کر دی جن میں آپ سے
ملاقات بھی تھی۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ
جب سے اب تک آپ صحت مند اور خوش
و خرم اور جامعہ اردو یوماً فیوماً رو بہ
ترقی ہے۔
میری دعا ہے آپ کی بہتر مند
صلاحیتیں آپ کے بہترین مشاغل یعنی زبان

ادب اور تہذیب کی ترقی پر صرف ہوتی رہیں
جیسا کہ اب تک ہوتی رہی ہیں۔ [illegible] رشید
صاحب جیسے بزرگوں کی دعاؤں کا ہی یہ صدقہ
ہے کہ اللہ میاں اس حقیر سے زبان و ادب
اور تعلیم کی حقیر سی ہی سہی خدمت لے رہا ہے
یہ احسان ہے خدا کا اپنے حقیر بندے پر)
خدا آپ کی مدد فرمائے۔ آمین

مخلص

رشید احمد صدیقی

اس خط کو پڑھ کر ایک اچھے ادیب اور
اس سے بڑھ کر اچھے انسان کی بڑائی کا قائل
ہوگیا۔ وہ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ
محترمی ضیا احمد صاحب بدایونی سے آپ لکھ
کر دریافت کریں۔ مگر خود تکلیف اٹھائی۔
انھیں لکھا اور کچھ ہی دن بعد حضرت ضیا احمد
بدایونی نے خط لکھ کر بڑا کرم فرمایا۔ بڑے آدمی
دوسروں کی بڑائی کے بھی دل سے قائل ہوتے ہیں۔
اور یہ ان کی اپنی بڑائی اور عظمت کی دلیل ہے۔

نقوش لاہور کے ضخیم خطوط نمبر کے سلسلے
میں محترمی محمد طفیل مدیر نقوش نے مضمون اور
خطوط کی فرمائش کی تھی۔ راقم ڈاکٹر اقبال، داغ
دہلوی، حبیب اللہ سندھی، نیاز فتح پوری، مولوی
عبدالحق، رشید احمد صدیقی، نسیم میسوری وغیرہ کے
غیر مطبوعہ خطوط کے علاوہ حیدر علی خاں سلطان ٹیپو
اور علمائے عرب کے خطوط سلطان ٹیپو کے
نام کے فارسی اور عربی خطوط کے تراجم بھی ارسال
کرنا چاہتا تھا۔ مگر وقت اتنا کم تھا کہ پروفیسر
رفعت مرحوم نے بھی زور دیا کہ کم از کم اردو خطوط

ہی روانہ کر دوں، کیوں کہ مدیرِ نقوش نے
ان کے خط میں بھی تاکید کر دی تھی کہ کسی طرح
مجھ سے حاصل کر کے انھیں روانہ کر دیں،
ہم خاطرِ نقوش بہ طفیل طفیل اس سے زیادہ
کیا کر سکتے۔ اردو خطوط ان کے پس منظر کے
ساتھ روانہ کر دیئے۔ میں نے اپنے مضمون
میں یہ خواہش اور درخواست کی تھی کہ کسی
صورت نقوش، رشید نمبر شائع کر کے
دنیائے ادب کی دعائیں لے۔ چاہے
اس کے لیے رشید صاحب کی ناراضگی ہی
کیوں نہ مول لینی پڑے۔
رشید صاحب قبلہ کا جو دلچسپ
خط اور فکر انگیز پیغام نقوش کے لئے
بھیجا گیا تھا، اسے میں نے سالنامہ فاروق
میں چھاپ دیا تھا اور رشید صاحب کے
میں نے خود علی گڑھ حاضر ہو کر یہ نمبر ان کی
خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس لیے
اطمینان تھا کہ کوئی قیامت نہیں آئے گی۔
اسی بیچ کئی حضرات ان کے خطوط حاصل کر
کے مجموعے کی صورت میں شائع کرنا چاہتے
تھے مجھ سے بھی خواہش کی گئی۔ مگر میں نے
انکار بہتر سمجھا کیونکہ مجھے اس بات کا پتہ
تھا کہ رشید صاحب نجی خطوط کو کاتب
کی امانت سمجھتے ہیں، برا مان جائیں گے۔
مولانا دریابادی کی آخری زندگی
میں فروغِ اردو نے دو خاص نمبر اور تصاویر
شائع کرنے کی بڑی ہمت اور جسارت کی
ماجدیہ نمبر شائع کرنے کی کسی مردِ میدان
و صحافت نے جسارت نہیں کی۔ ؎

(؎ جناب سلیمان اطہر جاوید نے ڈاکٹر مسعود
حسین خاں کی رہنمائی میں آپ پر مقالہ
لکھا اور شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین
خاں نے جب ہماری طلب پر "ہماری زبان"
کی ادارت سنبھالی اور بڑی حسن و خوبی
سے اپنے فرائض ادا کئے تو پسندیدگی کی
شکل میں چند خطوط رشید صاحب نے انھیں
لکھے۔ ان کے اقتباسات کتابی صورت
میں آپ نے شائع کر دیئے)

منٹو تو کہتے تھے۔ "یار طفیل
میرا نمبر چھاپ دو۔ میں خود مرتب کر دوں
گا۔" یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ اس خواہش
پر انکار ہی انکار ہو رہا ہے۔
محترمہ سیدہ حبیب النساء بیگم
نے مجھے معروف پاکر ایک دلچسپ خط
مرحوم کے نام لکھا تھا۔ جس میں
نقوش نمبر کی بات بھی لکھ دی اور
مدیر نقوش سے راقم نے جو خواہش
رشید نمبر کے سلسلے میں کی تھی وہ
حرف بہ حرف نقوش سے نقل کر دی
شاید یہ سمجھ کر کہ رشید صاحب خوش
ہوں گے مگر معاملہ الٹا ہوا اور
عتاب نامہ انھیں کے نام آیا۔

محترمہ

آداب

نوازش نامہ موصول ہوا۔
یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ سلیم تمنائی
صاحب نے میرے خطوط جو قطعاً نجی تھے
چھپنے کے لئے مدیر نقوش کو بھیج دیئے
مدیر موصوف میرے قدیم کرم فرما ہیں لیکن
وہ مدیر پہلے ہیں اور بعد میں۔ انھوں نے
جو کچھ کیا ہے ممکن ہے بحیثیت مدیر ان
کے صحیفۂ اخلاق میں قابلِ گرفت نہ ہو۔
یہ بات بھی گراں گزری کہ میری زندگی میں
اور مجھ سے پوچھے بغیر رشید نمبر نکالنے
کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اور میرا واسطہ
دلا کر خطوط حاصل کر رہے ہیں۔
پرائیویٹ خطوط کا احترام کرنا ہم سب
کو ابھی دیر میں آسکے گا۔ ایسے خطوط کاتب
کی امانت ہوتے ہیں جس کا لحاظ کرنا اور
رکھنا مکتوب الیہ پر لازم آتا ہے۔
امید ہے آپ اور متعلقین بخیر
ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

میں سخت پریشان ہوا۔ سالنامہ
فاروق میں پیغام تو چھپوانے ہی کے لئے
روانہ کیا تھا مگر پیغام کے اوپر جو دلچسپ
خط تھا غلطی سے کاتب نے اس کی بھی
کتابت کر دی اور یوں اس طرح خط شائع ہو گیا
جب میں نے رسالہ رشید صاحب کے
(جامعہ اردو علی گڑھ کے تقسیم اسناد کے
اجلاس میں) نذر کیا تو صاحب موصوف
نے ایک نظر اپنے خط اور پیغام پر ڈال لی
تو اطمینان ہو گیا تھا۔ اس اطمینان نے

مجھے نقوش لاہور کے خطوط نمبر کے لیے اپنے مضمون کے ساتھ یہ خط بھجوانے پر اُکسایا تھا۔ نتیجے میں رشید صاحب کا عتاب ملا اور دُکھ بھی۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ میرے والدین مجھ سے خفا اور ناراض ہیں۔ میں نے فوراً ساری حقیقت رشید صاحب کے لکھ بھیجی اور یہ غلط فہمی بھی دُور ہوگئی کہ مدیر نقوش رشید نمبر کے لیے خطوط حاصل کر رہے ہیں اصل میں مجیب بیگم صاحبہ کے خط میں ان صاحب کا نام تھا جو مجھ سے خطوط حاصل کر کے اپنے مجموعے میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ اور میرے انکار پر خاموش ہو گئے تھے۔ مدیرِ نقوش کا نہیں۔ بات دو باتوں کے بیچ اُلجھ گئی تھی۔ گڈ مڈ ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ غلط فہمی دُور کرنی لازمی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں اطمینان نصیب ہوا اور تحریر فرمایا۔

دوشنبہ

۱۴ر جنوری ۱۹۷۴ء

مکرمی

تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۱۰ر جنوری ابھی ابھی موصول ہوا۔ جو ہوا سو ہو گیا اب قصّہ کو ختم کیجئے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، اُس سے مجھے اطمینان ہو گیا۔

شکریہ مخلص

رشید احمد صدیقی

یقین مانیئے میں اس رات بڑے اطمینان سے سو سکا۔

خطوط کاتب کی امانت ہوتے ہیں بات پتہ کی ہے۔ کیا زمانہ رشید صاحب قبلہ کی اس خواہش کا احترام کرے گا؟ اگر دست بردِ زمانہ سے یہ خطوط بچ نہ سکے تو کتنا بڑا المیہ ہوگا۔ یہ خطوط اچھے ادب کے ضمن میں آتے ہیں۔ کون اس کی طرف سے آنکھ بند کرے گا غالب نے اپنے خطوط کو مکالمہ بنا دیا تھا اگر وہ خطوط نہ چھپتے تو دنیائے ادب اچھی نثر، ایک نرالے اسلوب و طرز سے محروم ہو جاتی۔ رشید صاحب کے خطوط نہ چھپ سکے تو کیا ادبی دنیا ایک صالح اور شیریں نشتر و تبسم سے محروم نہ ہو جائے گی؟

یار لوگوں نے حضرت فانی جیسے شاعر کی شاعری کو آنکھ سے سرمہ کی طرح لگایا تو کون نادان ایک ہزار ایک تبسّم اور صالح نشتر پر اپنا دل نچھاور نہ کرے گا کیوں کہ اس سوگوار دنیا میں یہ شے بڑی نایاب اور صحت مند ہے لیکن . . . ؟

"ایسے خطوط کاتب کی امانت ہیں جس کا لحاظ کرنا اور رکھنا مکتوب الیہ پر لازم آتا ہے۔" اب معاملہ غالب کی زبان میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل میں پڑ گیا۔

(انجمن اشاعت اردو کے تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا)■

— (بقیہ: خیابانِ خاطر) —

ماحول سے بعض اوقات سخت بغاوت کر کے میں نے اپنی محبوب مصروفیت یعنی لکھنے کو جاری رکھا ہے۔ لکھنے اور چھپنے میں کوئی مالی فائدہ نہیں ہے یہ میں ماننے کو آمادہ ہوں۔ اردو والے ناقدری کا نشانہ ہی بننے کے لائق ہیں مگر نہ لکھنا بھی تو اپنے بس کی بات نہیں ہے کیا کیا جائے؟

ادھر چند غزلیں کہی ہیں۔ ایک چھوٹی بحر کی مختصر غزل "پونم" کے لیے اس خط میں تحریر کر رہی ہوں۔ آپ کو مکرر "پونم" کی اشاعت پر تحسین و آفریں کہنے دل چاہتا ہے۔

نیاز مند

بانو طاہرہ سعید

(حیدرآباد)

مکرمی! سلام و رحمت

ایک غزل روانہ ہے کسی قابل ہو تو شریکِ اشاعت فرمائیں۔ حالیہ فرقہ وارانہ فسادات میں سارے ادبی دستاویز، کتابیں، رسائل دیگر ساز و ساماں کے ساتھ نذرِ آتش کر دیئے گئے اور ہم ہنوز بے گھر ہیں۔

مزاج گرامی بخیر ہوں گے

مخلص

رونق دکنی سیمابی

(جمشید پور)

راشد آذر

بارِ عقیدت

تمام رات امیدِ وفا میں گزری ہے
کھلی جو آنکھ تو منظر عجیب سا دیکھا
ہر اک افق پہ تماشائے بے وفائی ہے
ہر ایک گام پہ انصاف کا تقاضہ ہے
ہر ایک موڑ پہ پھیلا ہوا ہے سناٹا
گلی گلی میں، دو کانوں پہ بک رہا ہے شعور
وہ فلسفے، وہ عقاید، وہ ساتھ برسوں کا
ہر اک کے وام پہ جب بھی فساد ہوتا ہے
کوئی لٹی ہوئی بستی جلائی جاتی ہے
کسی کا پہلے سے برباد گھر اجڑتا ہے
جھکی ہوئی تھیں نگاہیں تو عجز حائل تھا
اٹھی نگاہ تو ہر چہرہ بے نقاب ہوا
پسِ نقاب چھپی تھیں جو جھریاں اب تک
وہ کھل کے سامنے آئیں تو راز فاش ہوا
جسے نہ دیکھ سکے اس کو کہہ رہے تھے خدا
وہ جن کو چھو نہ سکے وہ بزرگ و برتر تھے
برہنگی نے نظر سے گرا دیا سب کو
مگر وہ سر، جو عقیدت کا بار اٹھائے ہوئے
جھکے ہوتے ہیں، اٹھائیں تو کوئی بات بنے
ہم اپنی آگ میں جل بھی گئے تو کیا ہوگا
اگر ضمیر جگائیں تو کوئی بات بنے

-★-

وہ لمحۂ وصال

وہ لمحۂ وصال مجھے اب بھی یاد ہے
جب ایک لمحہ ایک صدی پر محیط تھا
قربت کی آنچ پا کے سلگتا رہا بدن
چھوٹے پلک پلک کی کمانوں سے نظر کے تیر
جب مل گیا خفیف تبسم کا آسرا
محراب لب میں میں نے سجایا زباں کا بت
ہونٹوں کے قفل بند ہوئے، آگ لگ گئی
باہوں کے شعلے قصرِ بدن خاک کر گئے
پھیلی جو آگ، فاصلۂ جسم و جاں جلا
اس آگ میں وجودِ زمان و مکاں جلا
جو بچ گیا وہ عشق و وفا کا خمیر تھا

دو ہستیوں کے بیچ فقط اک ضمیر تھا

غزلیں

اعجاز رحمانی

سخنوروں میں وہ شامل نہ تھے، سخنور تھے
جو تیری بزم میں خاموش تھے، سمندر تھے

بنا ہوا ہے مقدر عذابِ تنہائی
ترے وصال کے لمحے بڑے ستمگر تھے

کسی مکان پہ دستک میں کس طرح دیتا
مری طرح مرے ہمسائے بھی تو بےگھر تھے

عجیب رنگ سرِ شہرِ آرزو دیکھا
تھے جن کے پھول سے چہرے وہ لوگ پتھر تھے

جھلک گئے وہ اُجالوں کی آشنائی سے
جنھیں چراغ ہر اک گام پر میسر تھے

جو تو نہیں تو نہیں ایک بھی دیا روشن
یہ گھر کہ جس کے کبھی بام و در منور تھے

وہی تھے شہر کی رونق وہی تھے دشت کا نور
ہمارے خون میں ڈوبے ہوئے جو منظر تھے

سناتے ہم بھی حکایاتِ خونچکاں اعجاز
مگر سکوں کے لمحے کسے میسر تھے

انور مسعود

دیکھنا اس کا بھی ہے نعمتِ راحت جیسا
اب تو وہ شخص بھی لگتا ہے ضرورت جیسا

کس طرح رات بتائی ہے بتائیں کیسے
آخری پہر تو گزرا ہے قیامت جیسا

آئینہ خانہ ملا ہے کہ ملے ہیں دھڑکے
میں نے آرام بھی پایا ہے اذیت جیسا

چھوڑ تجرید و علامت کی پہیلی پیارے
چھیڑ قصہ کوئی سعدی کی حکایت جیسا

رنجِ پامالیِ اقدار نہ پوچھو یارو
کتنا بدنام ہوا لفظِ شرافت جیسا

ایک الزام ہے اب نقدِ وفا بھی انور
اور سہا یہ : خلوص بھی تہمت جیسا

انور شعور

ہزار بار بلانے پہ گو نہ آئے وہ
کبھی کبھی چلا آتا ہے بے بلائے وہ

صنم پرست نہ بن حسن سے مراد یہ ہے
کسی بھی شکل و شباہت میں آئے جائے وہ

کہاں یہ گھر کے جھمیلے، کہاں وہ اس کی رات
اگرچہ ایک مسافر تھا میں، سرائے وہ

اُمیدوارِ وفا آپ بھی تو رہتا ہے
نگاہ! ایک ترے ناز کیوں اٹھائے وہ

ہزار شہر بسالو، خلا نہ پُر ہوگا!
اُجڑ گئے ہیں گھرانے بسے بسائے وہ

توقعات سے بڑھ کے وہ خوب رو نکلا
مگر جو دل میں تھے نقش و نگار ہائے وہ

بہار میں بھی میخانہ ناشگفتہ ہے
جسے غرض ہو، ہوئے طلب سمجھائے وہ

شعور آج غزل ہوگئی ہے کچھ ایسی
کہ میں اسے نہ سناؤں، مجھے سنائے وہ

غزلیں غزلیں غزلیں غزلیں غزلیں غزلیں

غزلیں

رونق دکنی سیمابی

شعورِ غم بھی ہے عرفانِ آگہی کے سوا
بشر کی ذات ہے انساں بھی آدمی کے سوا

یہ صبح و شام کی پابندیِ قیام و سجود
نہیں کچھ اور عبادت بھی بندگی کے سوا

گھنیری راتوں میں جگنو سی ہے چمک بھی کبھی
ہے کوئی نور مقابلے بھی روشنی کے سوا

نہ جانے لوگ مجھے بے خبر کیوں سمجھتے ہیں
میں اپنے شہر میں سب کچھ ہوں اجنبی کے سوا

خودی ہے اصل میں اک بیخودی کا عکسِ لطیف
یہ بیخودی ہے کیا اک سلیقۂ خودی کے سوا

ادب میں فحش کلامی بطرزِ رنگِ جدید
ہے کیا یہ فکر و نظر کی برہنگی کے سوا

حیات لمحہ ہے فردا کی فکر سے غافل
اور موت کیا ہے اک احساسِ دائمی کے سوا

چلے ہو درسِ عمل دینے آج تم رونق
کیا ہے کام بھی کچھ تم نے شاعری کے سوا

ساجد رضوی

اُن سے ملنے کی جو صورت ہو گئی
اب مجھے اپنے سے فرصت ہو گئی

شاملِ غم ہر مسرت ہو گئی
کیا مرے دل کی بھی قیمت ہو گئی

بس گئے گُل دیکھ کر طرزِ خرام
صحنِ گلشن میں قیامت ہو گئی

اُن نگاہوں سے نگاہیں کیا ملیں
زندگی حرف و حکایت ہو گئی

سہمی سہمی ہے زندگی شامِ غم
ایک نعمت تھی جو رخصت ہو گئی

عشق میں آیا ہے اب ایسا مقام
خود مجھے مجھ سے شکایت ہو گئی

اب نہ کیجئے زحمتِ چارہ گری
درد کے بڑھنے سے راحت ہو گئی

اُن کے قدموں پہ ہے ساجد میرا سر
آج تکمیلِ عبادت ہو گئی !

حافظ حکیم محمد محمود خاں فہمی

تمھاری فرقت میں جی رہا ہوں، یہ زندگی زندگی نہیں ...
ہجومِ غم سے ہے اب یہ عالم، کہ جاں ابھی تھی ابھی نہیں ...

تمھارے رحم و کرم کا صدقہ، ذرا ادھر بھی ہو اک نظر ...
کبھی تو آ کر دکھا دو جلوہ، کہ دل میں اب روشنی نہیں ...

حیات کی تیرہ بختیوں نے ہمیں بہت دور کر دیا ...
تمھاری نسبت پہ جی رہے ہیں، حیات کی کچھ خوشی نہیں ...

تمھاری راہِ طلب کا اک ایک مرحلہ ہے عجیب ...
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمسفر اجنبی نہیں ...

تمھارے درد و الم کے مارے بھٹک نہیں سکتے تیرگی ...
کہ دل میں روشن ہے یاد اب تک تجلیوں میں کمی نہیں ...

وہ مرحلے یاد ہیں کہ جن پہ تمھارے نقشِ قدم تھے ...
مگر ہے اب بیکسی کا عالم کہ چاند ہے چاندنی نہیں ...

ہر ایک صدا پہ چونکتا ہے کہ تم نے شاید اسے پکار ...
اُٹھا کے تم نے کہ دل کا پردہ چلے بھی آؤ کوئی نہیں ...

عوض سعید

[illegible]

افسانہ

اُسے بالکل بہرہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس کے کانوں کے باریک و مہین پردے کمزور اور دبی آواز کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے اس کے قریبی ملنے والے بات کرتے وقت آواز کی اونچائی کا خاص طور پر خیال رکھتے تاکہ وہ ساری گفتگو سمجھ کر ان کے جواب دے سکے۔

وہ صورت شکل سے ذہین معلوم ہوتا تھا۔ چوڑی پیشانی، پتلی لانبی سی ناک موزوں حد تک پتلے خوبصورت ہونٹ چمکیلی اور نشیلی آنکھیں جن میں ذہانت کے ڈورے ہمیشہ دمکتے دکھائی دیتے۔

شروع شروع میں اُسے پتہ تک نہ چلا کہ وہ تیزی سے اپنی قوتِ سامعہ کو کھوتا جا رہا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے اُسے اپنی اس کمزوری کا احساس ہونے لگا خاص طور پر اس وقت جبکہ اس کے ساتھ بات کرتے وقت جھلّا اُٹھتے یا ہنس پڑتے تھے۔ بچپن میں اس نے بہروں کے متعلق جلیبیوں لطیفے سُن کر ہنسی کے کنول کھلائے تھے۔ لیکن آج یہ کنول سوکھ کر کانٹے کی مانند اس کے حلق میں چبھ کر رہ گئے تھے۔

اس کی شخصیت گھر میں بالکل غیراہم سی تھی۔ کبھی کبھار اس کے احتجاج کی لاج رکھ لی بھی جاتی تو اس طرح کہ اُسے احساس تک نہ ہو۔ لیکن وہ بلا کا ذکی الحس تھا۔ کبھی تو اس کے سامنے اتنی بلند آواز میں گفتگو کی جاتی جیسے بندوق کی باڑھ چل رہی ہو۔ اور کبھی اتنی آہستہ جیسے کوئی بیمار لاغر آواز میں کانا پھوسی کر رہا ہو۔

اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جم سی جاتیں۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں اداسی کی ڈورلائیں ہو جاتی۔ اور اس کے ہونٹ لرزش سے کانپ اُٹھتے۔

چچا کی بے رخی سے فائدہ اٹھا کر اس کی بہنیں اس کا مذاق اُڑاتیں۔ چچی بھی اپنے سفید بالوں کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنے پوپلے منہ کے ساتھ ہنسی میں شامل ہو جاتیں اور چچا۔۔۔

لیکن جب آدمی "زن مریدی" کے ڈربے میں دبے پاؤں گھس جائے تو اس کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔

اسے ان باتوں کا سخت صدمہ تھا۔

اور اسے اکثر اپنی بے بسی کا شدّت سے احساس ہوتا۔

جب آدمی زندگی کے آگے مجبور ہو جاتا ہے تو اس کی ذات میں بے حسی کے ساتھ ساتھ بہت دھیرج بھی در آتی ہے۔ شائد اسی لئے اس نے کبھی ہیئرنگ ایڈ استعمال کرنے کے مشوروں پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

شام وہ اکثر اپنے مکان کے سامنے والے تالاب کے کنارے گزارتا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوتیں جنھیں وہ تالاب میں پھینک کر ایک مسرت سی محسوس کرتا۔

تالاب میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینکنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی کی سطح کو چیرتی ہوئی تالاب کی تہہ میں جا بیٹھتیں تو اسے محسوس ہوتا جیسے اسے من کی شانتی مل گئی ہو۔

آج شام لوٹتے ہوئے وہ تالاب کے جنوبی کنارے تک گیا۔ لیکن خالی پڑی ہوئی بینچوں کو دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ حالانکہ روز یہ بینچیں اور کرسیاں بھری ہوئی ہوتیں۔

شام کے بادبان پنکھ بکھیرے ہوا میں اُڑ رہے تھے اور پرچھائیں سائیں سائیں

کرتی ہوئی چیخ رہی تھیں ۔ تالاب کے سامنے کے دور فی درخت چپ چاپ کھڑے تھے جن پر پرندے بیٹھے اونگھ رہے تھے ۔ وہ وہاں سے بجھا بجھا سا اٹھا۔ آخر اس کی ویران اور تاریک زندگی میں بہار کی چاپ کب سنائی دے گی ۔ آخر کب!

اسے تالاب کے کنارے بڑا ذہنی سکون ملتا ۔ یہاں نہ بازاروں کی طرح شوروغل تھا اور نہ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے گاڑھے دھوئیں کی تلخ بو ۔ شاید اس لئے اس کی روح یہاں آکر بڑی لطیف ہوجایا کرتی تھی ۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر آگیا ۔

دوسرے دن شام بڑی سلونی اور خوش گوار تھی ۔ اس کے قدم غیر شعوری طور پر تالاب کے کنارے کی سمت بڑھ رہے تھے ۔ وہ تارکول کی لانبی سڑک پار کرتا ہوا کچی سڑک پر آیا تو اسے تسکین سی ہوئی کیوں کہ یہاں سے تالاب کی سرحد شروع ہوجایا کرتی تھی ۔

آج تالاب کے کنارے غیر معمولی بھیڑ تھی ۔ وہ کنارے کنارے دور تک یوں ہی چلتا رہا ۔ اور جب کچھ تھک سا گیا تو ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر حسب معمول کنکریاں پھینکتا رہا ۔ کبھی کبھار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرتی ہوئی ۔ ان کنکریوں کو پکڑنے کے لئے منہ کھولتیں تو یہ منظر اسے بڑا حسین لگتا ۔

تالاب کے کنارے کے درخت بھی آج سرسرا رہے تھے کیوں کہ ہوائیں تیز چل رہی تھیں ۔ تھوڑی دیر بعد ہی آسمان پر کالے بادل چھا گئے اور موسلادھار پانی برسنے لگا ۔ لوگ دوڑ دوڑ کے سائبان کے نیچے ہو گئے اور جو لوگ کاروں میں آئے تھے ۔ وہ آئینے چڑھا کر بارش کا سماں دیکھنے لگے ۔ وہ تالاب کے کنارے یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے اس کے جسم پر ضربیں لگا رہے تھے ۔ لیکن وہ نہایت اطمینان سے تالاب میں کنکریاں پھینکتا رہا ۔

وہ موٹر میں بیٹھا اس عجیب و غریب انسان کو دیکھ رہا تھا ۔ اس نے سوچا ۔ ہوگا کوئی پاگل ۔ لیکن وہ صورت شکل سے شریف آدمی معلوم ہوتا تھا پھر وہ پاگلوں کی طرح خواہ مخواہ کیوں بارش میں بھیگے جا رہا ہے ۔ رہ رہ کر یہ سوال اس کے ذہن کے محور پر دوڑنے لگا ۔

تالاب کے دونوں کناروں تک کچی مٹی کی دورنگی لانبی سڑک دور تک چلی گئی تھی اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور اس کے قریب پہنچ کر ہارن کیا ۔ لیکن وہ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا ۔

وہ اب بھی بدستور تالاب میں کنکریاں پھینک رہا تھا ۔ بارش کا زور کم ہو گیا تھا صرف ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ وہ موٹر سے اتر کر اس کے پیچھے آیا ۔ پیروں سے آواز بھی کی ۔ لیکن اس کے استغراق میں کوئی فرق نہ آیا ۔

وہ تالاب کے کنارے چپ چاپ یوں بیٹھا تھا جیسے وہ انسان نہیں ۔ سنگی مجسمہ ہو ۔ اس کے کپڑے بارش میں لت پت ہو گئے تھے اور جسم پر سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ نیچے گر رہا تھا ۔

" دیکھئے کیا میں آپ سے بارش میں بھیگنے کا سبب پوچھ سکتا ہوں ۔"

مگر وہ خاموش رہا ۔

" آپ کو نمونیہ ہو جائے گا " وہ اس کے چہرے کے مقابل کھڑا کہہ رہا تھا ۔

وہ یک لخت اٹھا ۔ اس کے گہرے نیلے رنگ کا بش شرٹ پانی میں بھیگ کر اس کے سینے سے چمٹ گیا تھا ۔ اور پتلون کی بھی کچھ عجیب سی حالت ہو گئی تھی ۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا ۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں کی خلاؤں میں ایک عجیب سی نمی تیر رہی تھی جیسے سارے جہاں کی کلفتیں ان خلاؤں میں آکر ڈوب گئی ہوں ۔ اس کے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے ۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کوئی غیر مرئی طاقت اسے کچھ کہنے سے روک رہی ہے ۔ اس نے بش شرٹ کی جیب سے چارمینار سگریٹ کی

ڈبیہ نکالی۔ لیکن ڈبیہ کے اندر کے سگریٹ پانی میں بھیگ کر خراب ہوگئے تھے۔ یہ دیکھ کر اُس نے فوراً سگریٹ کیس نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

وہ شکریہ کہے بغیر کیس سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ اس نے دو تین لمبے کش لگائے اور اس کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔

" آپ کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ نے ابھی ابھی میری ذات کے تعلق سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میرے ہاں اس کا صرف ایک جواب ہے کہ میں بہرہ ہوں مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ آبدیدہ سا ہوگیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دُور نکل گیا۔

اس نے زور سے اُسے آواز دی۔

پھر اپنے آپ کہہ اُٹھا۔ وہ بھی کیا چغد ہے بے چارہ بہرہ ہی تو ہے، آواز کیا خاک سُن سکے گا۔

وہ بُت بنا اُسے دیر تک دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دُھند کی دبیز چادر میں وہ گُم ہوگیا۔

وہ ساری رات بستر پر پڑا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے چہرے کے تیکھے نقوش، اس کے بات کرنے کا انداز صاف اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ وہ ایک خاص کردار ہے لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھ کر اسے دُکھ ہو رہا تھا کہ اس نے اُسے بہروں کی صف میں جگہ دے دی۔

جہاں تک اس کا خیال تھا وہ بہرہ نہیں تھا۔ اگر کسی حد تک اُونچا سننے کا عادی بھی تھا تو بھی اس میں اس کے اپنے احساسِ کمتری کا زیادہ دخل تھا۔

اچانک اس کے دماغ میں مشہور ماہرِ نفسیات لُوئی کی کتاب " بہرہ پن۔ بیماری نہیں " اُبھر آئی۔

بہرہ پن دراصل کوئی مرض نہیں ہے ہوتا یوں ہے کہ کبھی کبھار آدمی کسی بات کو سُن نہیں پاتا۔ ایسے میں اگر کوئی اُسے کہہ دے۔ کیا تم اُونچا سنتے ہو؟ تو وہ بات اس کے تحت الشعور میں پھنس جاتی ہے اور آدمی اپنے آپ کو بہرہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور ایک نوبت ایسی بھی آجاتی ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی قوتِ سامعہ کو کھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے تحت الشعور سے یہ بات فوری نکال دینی چاہیئے کہ وہ اونچا سننے کا عادی ہے

یہ نفسیاتی اُلجھنیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔

اب اگر کہیں اس سے اس کی ملاقات ہوجائے تو وہ ضرور اُسے یہ کتاب پڑھنے کا مشورہ دے گا۔ کیا عجب کہ یہ کتاب اس کے لئے مفید ثابت ہو۔ پھر اس نے سوچا۔ آخر اس کی ذات سے دلچسپی کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ مانا کہ اس کی حرکات میں بڑے فن کاروں کی سی خوبی ہے۔ لیکن اس سے اس کی شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کوئی دلچسپی نہ بھی ہو تو کسی کے کام آنا بھی تو انسانیت ہے اس کے ذہن میں عمل اور ردِ عمل کا جو دورہ پڑا تو دیر گئے تک رُکنے کا نام نہ لیا۔

پھر ایک دن وہ گھر سے نکل کر بازار کے چوراہے پر آیا تو لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

" ارے رے رے... بے چارہ جوان آدمی تھا۔"

" خدا کی شاید یہی مرضی تھی۔"

" پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے "

" اُف اللہ رحم کرے۔"

" زندگی پانی کا بُلبُلا ہی تو ہے۔"

وہ مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ تالاب کے کنارے والا ساتھی تھا۔ کار کے پہیہ کی ضرب سے اس کا منہ بالکل پچک گیا تھا۔ خون سے مٹی گیلی ہوگئی تھی۔ اُس کے قریب ہی ایک کتاب پڑی تھی جس پر لکھا تھا۔

" بہرہ پن —— بیماری نہیں۔"

ترجمہ: خالدہ شاد

DREAM HOUSE
KATHRYN GOTTLIEB

(کہانی)
(انگریزی سے ترجمہ)

لبِ بام

سوچتا ہوں کہ شروع سے بات شروع کروں۔

پھر خود سے سوال کرتا ہوں کہ بات شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ شاید اس کہانی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب میں نے اپنے دوست رچی سے ایک ایکڑ زمین خریدنے کی بات کی تھی۔ وہ ان بور دنوں میں سے ایک دن تھا جب انسان زندگی کی یکسانیت سے تنگ آکر کچھ کرنا چاہتا ہے۔

یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ پہلے اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ میں ایک پولیس افسر ہوں ایک چھوٹے سے قصبے میں متعین ہوں۔ یہاں جرائم کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عموماً چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہتے ہیں جہاں مجھے ایک ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ دن بھر یا تو دفتر میں اونگھتا رہتا ہوں اور یا ڈنڈا بغل میں دبا کر شہر میں گشت لگاتا ہوں۔ عوام الناس مجھے مسخرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اگر آپ نے ٹی وی پر دکھائی جانے والی سیریز دیکھی ہیں تو آپ کو میری بات سمجھنے میں ہرگز کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

میری عمر اڑتالیس سال ہے۔ بیس سال کی ناکام ازدواجی زندگی کے بعد گزشتہ سال میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ بیس سالوں کے دوران ہم نے چند دن بھی خوشگوار نہیں گزارے تھے۔ لیکن اب وہ دن یاد بہت آتے ہیں اور یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیوں؟

دو سال بعد میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ میں نے زندگی میں جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ بیوی کی وفات کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ میری نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی رشتہ دار۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں اپنے مستقبل پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے گہری دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ آج کل میں مسز فرائر کے گھر میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک خاصا بڑا گھر تھا۔ جس میں لان اور باغیچہ بھی تھا۔ یہ مکان میں نے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے مشورے پر فروخت کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ تنہا آدمی کو اتنے بڑے مکان میں نہیں رہنا چاہیئے۔ اس موقع پر میں آپ کو ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ کبھی کسی کے مشورے پر کان نہ دھریں خصوصاً اس قسم کے معاملات میں۔ ورنہ میری طرح آپ بھی بے گھر ہو جائیں گے۔

میں آج کل جس کمرے میں رہتا ہوں گو وہ خاصا کشادہ ہے لیکن میں وہاں بڑی اداسی اور گھٹن محسوس کرتا ہوں۔ مکان کی فروخت سے مجھے جو رقم حاصل ہوئی تھی وہ پوری کی پوری بینک میں پڑی ہے بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ مجھے پیسہ خرچ کرنے کا شوق نہیں۔

ان حالات میں جب رچی نے مجھے زمین خریدنے کا مشورہ دیا تو میں نے انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ آپ خود سوچیں مجھ جیسے تنہا آدمی کو زمین کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ ویسے میں ایک بات کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ رچی، قصبے کا سب سے اچھا آدمی ہے۔ دوسروں کے جذبات میں ڈوب کر سوچتا ہے اور سچے ہمدرد کی طرح بات کرتا ہے۔

"دیکھو دوست۔" اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح دوسروں کے گھر میں کب تک رہو گے۔ زمین خرید لو اور اس پر اچھا سا مکان تعمیر کراؤ۔"

"مکان کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اکیلا آدمی ہوں کسی بھی کونے میں زندگی گزر جائے گی۔"

"یہ زندگی اتنی بھی مختصر نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔" اس نے کہا۔ "ابھی تم پچاس سال کے نہیں ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ پچاس سال اور زندہ رہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور میں تمہیں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں

تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ؟"

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "مجھ جیسے بوڑھے آدمی کے ساتھ کون شادی کرے گا ؟"

"کرے گا نہیں کرے گی۔" اس نے کہا "میرے دوست تم اتنے بوڑھے بھی نہیں ہوئے۔ تمہاری صحت قابلِ رشک ہے۔ خاصے اسمارٹ نظر آتے ہو اور میں کون سا تمہیں کسی البیلی چھبیلی چھوکری سے شادی کا مشورہ دے رہا ہوں۔ قصبے میں بعض خوب صورت بیوائیں بھی ہیں۔ مثلاً میرینا شفلر ہے۔"

میں نے بھنویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارا اشارہ اس میرینا کی طرف تو نہیں جس کا گیس اسٹیشن کے قریب اسٹور ہے ؟"

"ہاں وہی۔ نہایت سلجھی ہوئی اور خوش اخلاق خاتون ہے عمر چالیس سال سے کم ہی ہوگی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں میرینا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے اسٹور میں گھریلو استعمال کی تقریباً ہر چیز مل جاتی تھی۔ اگر آپ علی الصبح وہاں جائیں تو آپ کو گرم گرم کافی اور مختصر سا ناشتہ بھی مل جائے گا۔ چند سال قبل اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ عام طور پر یہی مشہور تھا کہ دونوں میں باقاعدہ علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر ارنی شفلر بھاری بھرکم جسم کا سخت مزاج شخص تھا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو گفتگو بغیر کسی موضوع کے بات کر سکتے ہیں۔ اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی تھی وہ میرینا پر سخت ظلم کیا کرتا تھا۔ پڑوسیوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اکثر میرینا کی چیخوں کی آوازیں سنی تھیں۔ اور کئی مرتبہ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشانات بھی دیکھے گئے تھے۔ لیکن میرینا نے کبھی کسی کے پاس شکایت نہیں کی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنی چوٹیں چھپانے کے لئے کئی کئی دن تک اسٹور میں نہیں آتی تھی۔ میرینا واقعی ایک مثالی خاتون تھی۔ بعض اوقات جب میں اپنی بیوی سے اس کا موازنہ کرتا تھا تو میرے دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش میرینا میری بیوی ہوتی۔ لیکن آج سے پہلے میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔

"بلاشبہ میرینا ایک اچھی خاتون ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے ؟"

"شوہر نے طلاق دی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس نے اپنے شوہر سے قانونی علیحدگی حاصل کر لی ہے۔"

"لیکن یہ بات تو نہیں جانتے کہ وہ واقعی دوسری شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" رچی نے کہا۔ "تم ایک جہاندیدہ شخص ہو۔ میرینا بھی کوئی ناسمجھ لڑکی نہیں ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے لئے موزوں ساتھی ثابت ہو سکتی ہے تو اس سے جا کر براہ راست بات کر لو۔"

"یعنی جا کر اسے سلام کروں اور کہوں کہ محترمہ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو منظور ہے ؟"

"اتنا بھی تیز نہیں۔" اس نے کہا۔ "شادی کی بات کرنا اور سگریٹ کا پیکٹ خریدنے میں بڑا فرق ہے۔ ایسی بات مناسب ماحول اور مناسب الفاظ میں کی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرینا انکار نہیں کرے گی۔ بالفرض اس نے انکار بھی کر دیا تو برا نہیں منائے گی۔ خاصی معقول عورت ہے۔"

رچی نصف گھنٹے تک اس معاملے میں میری برین واشنگ کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین روز کے بعد میں میرینا کے اسٹور میں پہنچ گیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے اور اسٹور کے اندر کوئی گاہک موجود نہیں تھا جیسا کہ رچی نے مجھے سمجھایا تھا میں نے مناسب تمہید کے بعد کہا۔ "آج شام تمہیں کوئی کام تو نہیں ؟"

"کام تو کوئی نہیں۔ کیوں ؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

اس نے بغیر کسی تامل کے میری دعوت قبول کر لی۔ میں اسے قصبے کے ایک پُرسکون

ریستوران میں لے گیا۔ کھانے کے دوران
ہم باہمی دلچسپی کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں
نے ماریا کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے
مختصر جواب دیتے ہوئے بتایا کہ ماریا اسے
چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس نے اس کے
ساتھ قانونی طور پر علیحدگی اختیار کر لی ہے۔
"میرینا تم جانتی ہو کہ میری بیوی فوت ہو چکی
ہے۔" میں نے کہا "اور میری طرح تم بھی اس دنیا
میں تنہا ہو۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم
ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں؟"
اس کے چہرے پر خوشی اور حیرت
کے آثار نمودار ہوگئے۔ غالباً اسے اپنے
کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری طرح وہ
بھی اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں خاصی
مایوس تھی۔ اس نے قدرے تامل کے بعد
اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے دیکھا جوشِ
مسرت کے باعث وہ خاصی جذباتی ہوگئی تھی۔
اس ملاقات کے بعد میں نے رچی
کی تجویز کردہ زمین خرید لی اور اس پر کام
شروع کرا دیا۔ اس زمین کے بارے میں، میں
نے میرینا کو نہیں بتایا تھا۔ چند روز بعد میرینا
کی سالگرہ تھی اور میں یہ زمین اسے سالگرہ
کے تحفے کے طور پر دینا چاہتا تھا۔ پہلی ملاقات
کے بعد ہم روزانہ ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے
اور بہت قریب آ گئے تھے۔
سالگرہ والے دن میں نے اس
سے کہا۔ "آج میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا
ہوں۔ سالگرہ کا تحفہ۔"
"تمہارے بعد مجھے کسی تحفے کی ضرورت
نہیں۔" اس نے کہا۔ "تمہیں پا کر میں بہت
خوش ہوں۔"
"میں تمہاری خوشیوں میں اضافہ
کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تیار ہو جاؤ۔
ہم تھوڑی سی سیر کریں گے اور ساتھ ہی
تمہیں وہ تحفہ بھی دکھاؤں گا جو میں نے تمہارے
لئے خریدا ہے۔"
وہ کیسا تحفہ ہے جس کو دیکھنے کے
لئے مجھے جانا پڑے گا۔ کیا وہ یہاں نہیں
آ سکتا تھا؟
"نہیں۔ میں نے مضافات میں
ایک ایکڑ زمین خریدی ہے یہاں سے تقریباً
دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس زمین پر
ہم ایک خوبصورت مکان تعمیر کریں
گے۔ جس کے سامنے ایک سرسبز باغیچہ بنائیں
گے جس میں سبزیاں اور پھل کاشت کریں
گے۔" میں کچھ جذباتی ہو گیا۔ "اس باغیچے
کی روشوں پر ہمارے بچے دوڑتے پھریں
گے اور یوں ہماری زندگی ایک حسین خواب
میں تبدیل ہو جائے گی۔"
چند لمحوں بعد ہم اپنی کار میں زمین
دیکھنے جا رہے تھے۔ میں کار ڈرائیو کر رہا تھا
اور میرینا میرے کندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی
راستے میں ہم مستقبل کے بارے میں باتیں
کرتے رہے۔ چند منٹ بعد ہم منزل پر
پہنچ گئے۔ ایک بلڈوزر ہماری زمین ہموار
کر رہا تھا۔ میرینا نے میرے کندھے سے سر
ہٹا لیا اور حیرت سے بلڈوزر کی طرف دیکھنے لگی
"کون سی زمین ہے؟" اس نے پوچھا۔
مجھے اس کا لہجہ کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔
میں کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اور اس
کی سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے باہر
آنے کے بعد دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔
"یہ بلڈوزر ہماری ہی زمین ہموار کر رہا ہے"
میں نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ تھامتے
ہوئے کہا۔ "آؤ قریب جا کر دیکھتے ہیں۔"
لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ میں نے محسوس
کیا کہ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔
"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں
نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا
رنگ سفید پڑ گیا تھا۔
"چلو واپس چلیں۔" اس نے مدھم آواز
میں کہا۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے افسوس
ہے کہ میری وجہ سے سارا پروگرام خراب ہو گیا۔"
اس کی طبیعت خاصی خراب ہو رہی تھی
میں نے اسے سہارا دے کر کار میں بٹھایا اور
ہم واپس آ گئے۔ راستے میں اس کی طبیعت
کچھ سنبھل گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے
کوئی اچانک صدمہ پہنچا ہے۔ میں اس کے
پاس کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا مگر اس نے
مجھے دروازے سے ہی رخصت کر دیا۔ اور
کہا کہ وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔
اگلے روز ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں
اس کی خیریت پوچھنے پہنچ گیا۔ خلافِ
معمول اس کا فلیٹ بند تھا۔ مجھے تشویش

ہوئی ۔ غالباً اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی ۔ میں جلدی سے اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچا جو اسٹور کے اوپر تھا بیرونی دروازہ کھلا تھا ۔ مگر اندر کوئی نہیں تھا ۔ میز پر ایک رقعہ رکھا تھا ۔ میں نے اُسے اُٹھایا ۔ اور کھول کر پڑھنے لگا ۔

"ڈیئر فلپ ! تم وہ شخص ہو جس نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے سچی خوشی عطا کی تھی ۔ لیکن قدرت کو میری خوشی پسند نہیں آئی ۔ اس لئے میں اس قصبے کو چھوڑ کر جا رہی ہوں ۔ اس قصبے کی گلیاں اور بازار مجھے بے حد عزیز تھے ان میں میرا بچپن اور جوانی گزری تھی ۔ میں اپنا اسٹور اور جائیداد تمہارے نام کر رہی ہوں ۔ چند دنوں کے اندر تمہیں اپنے وکیل کے ذریعے قانونی کاغذات بھجوا دوں گی ۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرنا ۔ تمہاری محبت ہمیشہ میرے دل میں رہے گی ۔

تمہاری اپنی میرینا

خط پڑھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرینا کو اچانک کیا ہو گیا تھا اور وہ قصبہ چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی ۔ خط کے آخری جملے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا تھا ۔ بہرحال میں نے خط کو تہہ کر کے جیب میں رکھا اور اپنا زمین دیکھنے چلا گیا ۔ وہاں ایک حیرت انگیز چیز میری منتظر تھی ۔ بلڈوزر کا ڈرائیور اور رچی ہڈیوں کے ایک ڈھیر کے سامنے کھڑے تھے ۔ ڈرائیور نے بتایا کہ وہ ہڈیاں زمین کے اندر سے برآمد ہوئی تھیں ۔

ان پر نظر پڑتے ہی میں ساری بات سمجھ گیا ۔ یقیناً آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے وہ میرینا کے شوہر ارنی کی ہڈیاں تھیں ۔ زمین کو دیکھ کر میرینا کی حالت خراب ہونا اور پھر اچانک روپوش ہو جانا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ ارنی کی ہڈیاں تھیں اور اسے میرینا نے قتل کر کے وہاں دفن کر دیا تھا ۔

اب میرے سامنے جو مسئلہ ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔ میرینا کو تلاش کر کے اسے قانون کے حوالے کر دوں یا اس سے شادی کر لوں ؟ مشورہ ذرا جلدی دیجیے ۔ مبادا میں کوئی ایسا فیصلہ کر ڈالوں جو آپ کو ناپسند ہو ۔

★

ابو الفرح ہمایوں

(افسانہ)

تقدیر

۵۸ - ویسٹ اسٹریٹ

ٹورنٹو (کینیڈا)

مائی ڈیئر آنٹی الیزا! اپنے بھانجے کا سلام قبول کیجیے:

میں نے آپ کی تازہ ترین فلم "قلوپطرہ اور جولیس سیزر" دیکھی۔ ٹکٹ اور متفرقات پر دس پونڈ ضرور صرف ہو گئے لیکن آپ کی اداکاری، رقص اور فنی مہارت پر میں عش عش کر اٹھا۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب آپ یہاں کالج میں پڑھتی تھیں اور ٹی وی پر رقص کا پروگرام پیش کرتی تھیں اب آپ ہالی وڈ جا کر ایک مشہور و معروف ہیروئین بن گئی ہیں۔ آج سے دس سال قبل کس کو آپ کے ستارۂ اقبال کی خبر تھی، سچ کہا ہے کسی نے کہ بڑے سے بڑا ماہر نجوم بھی فلمی ستاروں کے متعلق پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔

آنٹی! میں اپنی موجودہ ملازمت سے سخت بیزار ہوں۔ دن بھر کمپنی کا نامۂ اعمال لکھنا۔ شکایات کو نمٹانا، منیجنگ ڈائرکٹر کی پسندیدہ بوتلوں کا انتظام کرنا اور روزانہ شام کے وقت جانا۔ خاص طور پر یہ آخری کام تو بالکل ہی بیزار کن ہے۔ میں سخت نالاں ہوں۔ قصہ مختصر میری پیاری آنٹی! اب آپ مجھے ہالی وڈ کی فلمی دنیا میں بلا لیں اور مجھے بھی ایک نامور اداکار بنا دیں۔ میرے چھ تازہ ترین فوٹو پوز منسلک ہیں!

جلد عنایت کا امیدوار

آپ کا دور افتادہ بھانجا

سی۔ سی۔ الفریڈ

ولیج ٹے گرین۔ ہالی وڈ

ڈیئر سر!

میں یہ خط آپ کے خط کے جواب میں مس لارین الیسنا کی جانب سے لکھ رہی ہوں۔ خط پڑھ کر وہ بے حد مسرور ہوئیں۔ لیکن انھیں افسوس ہے کہ وہ فلم لائن میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ ایکٹنگ کے لیے پاٹ دار آواز، رونا ہنسانا یا جوڈو کراٹے ہی کافی نہیں۔ یہاں لومڑی کی عقل، گرگٹ کی رنگا رنگی، مگرمچھ کی کھال اور آنسو، عقاب کی نگاہیں، چیتے کی پھرتی اور پیدائشی کمدڑ بھی

آپ اپنے موجودہ کام پر ہی قناعت کریں۔ آپ اور آپ کی مسز کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ۔

آپ کی مخلص

مس ٹی ٹی شائزلی

پرائیویٹ سکریٹری

۵۸ - ویسٹ اسٹریٹ

ٹورنٹو (کینیڈا)

میری پیاری پیاری خوبصورت آنٹی!

آپ کی پرائیویٹ سکریٹری کا خط ملا۔ آج کل تمام عورتوں کو کمپلکس ہے۔ کسی کو حسن و جمال کا اور کسی کو عقل و کمال کا۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کی پرائیویٹ سکریٹری کو تمام جانوروں کے نام، کام اور شاید دام یاد ہیں۔ کیا وہ پہلے کسی چڑیا گھر میں ملازم تھی۔

آنٹی! میں پرائیویٹ سکریٹریوں کے خطوط کو اہمیت نہیں دیتا۔ کیا آپ اتنی عدیم الفرصت ہیں کہ خود دو چار سطریں نہیں لکھ سکتیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خود لکھتیں تو یہ انگریزی ادب اور مجھ بے ادب پر بڑا احسان ہوتا۔ میں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کیے بیٹھا ہوں۔ اب آپ اتنی کامیاب اور مقبول ہیروئین بن گئی ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ آپ کے پاس لومڑی کی عقل، عقاب کی نگاہیں اور مگرمچھ کے آنسو، سب ہی کچھ موجود ہیں۔ کیا آپ میرے لیے انھیں استعمال نہیں کر سکتیں؟

• پونم حیدرآباد

وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ تمھاری خالہ تم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ تم فوراً ان کے پاس جاؤ۔ وہ تمھیں مایوس نہیں کریں گی۔

آپ کا سعادت مند بھانجا

سی۔ سی۔ الفریڈ

۲۷۔ ولسیٹ گرین۔ ہالی ووڈ

مائی ڈیر الفریڈ!

تمھارا دوسرا خط ملا۔ تم نے اپنی مرحوم ماں یعنی میری بہن کا حوالہ دے کر مجھے مجبور کر دیا ہے۔ بہرحال چانس لے لو اور ولسیٹ گرین آ جاؤ۔ تمھیں فلم لائن میں فٹ کرانے کی کوشش کروں گی۔

تم نے غلط کیا جو میری پرائیویٹ سکریٹری کے بارے میں بدتمیزی کی باتیں لکھ دیں۔ یہ دنیا ہی ایک جانور خانہ ہے خصوصاً فلمی دُنیا۔ وہ ایک مشہور فلم ڈائرکٹر کی تیسری بیوی کی فرسٹ کزن ہے اور ایک فلم پروڈیوسر کی ریٹائرڈ محبوبہ۔ اُس کی سفارش تمھارے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر تم ہالی ووڈ آنا چاہتے ہو تو فوراً ایک خط لکھ کر اُس سے معافی مانگو۔

آنے سے پہلے بذریعہ کیبل یا ٹیلکس مطلع کر دینا۔ میں ایر پورٹ پر نہ آ سکوں گی تم ٹیکسی پر آ جانا۔ میرے بنگلے کا نمبر اوپر لکھا ہوا ہے۔ اور ہاں ایک بات اور یاد دلا دوں۔ فی الحال تنہا ہی آنا۔

اگلے اتوار کو "ایکسکیوزمی ڈارلنگ" کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ "ٹیکسی اینڈ لیڈی" مکمل ہونے ہی والی ہے۔ میں "ایک رات" کا کنٹریکٹ سائن ہو چکا ہے۔ مسٹر ڈی لاسلور کنگ اُس کے پروڈیوسر بھی ہیں اور ڈائرکٹر بھی۔ اُنھیں چند نئے چہروں کی تلاش ہے۔ اگر تم جلدی آ جاؤ تو شاید اسی فلم میں چانس مل جائے

تمھاری خیر خواہ آنٹی

مس لارین الیزا

۸۵۔ ولسیٹ اسٹریٹ

ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیر مس ٹی ٹی شاٹرلی۔

میں اپنے اُس خط کے لیے معذرت خواہ ہوں جس میں آپ کے متعلق چند قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ابھی کمسن ہیں اور بے انتہا خوب صورت۔ اور آپ کا تعلق ہرگز ہرگز چڑیا گھر سے کبھی نہیں رہا۔ کیا آپ مجھے اپنی ایک عدد حسین و دلنواز تصویر سے سرفراز فرمائیں گی؟ میں آپ سے ملاقات کا بے حد متمنی ہوں اور اُس سے زیادہ آپ کی صورت دیکھنے کا۔ آخر میں ایک بار پھر عرض کروں کہ میں آپ کی شان میں گستاخی کے الفاظ لکھنے پر بےحد نادم ہوں۔ اُمید ہے آپ میری معذرت قبول فرمائیں گی۔

آپ کا نیاز مند

سی۔ سی۔ الفریڈ

آپ کا گرامی نامہ وصول ہوا۔ آپ نے جس انداز میں مجھ سے معافی مانگی ہے اور جتنے خوب صورت الفاظ میں میرے حسن کی تعریف کی ہے۔ اُس کے لیے میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میری نظر میں وہ شخص بے حد قابلِ قدر ہے جو اپنی غلطی کو فراخ دلی سے تسلیم کر لے۔ آپ کی آنٹی مس الیزا آپ کی آمد کی منتظر ہیں اور میں بھی سخت مضطرب ہوں۔ میں ذاتی طور پر آپ سے بے حد متاثر ہوں اور آپ کی کامیابی کے سلسلے میں چند قیمتی مشورے آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس کے لیے ملاقات شرط ہے۔

اُمید ہے کہ آپ جلد ملاقات کا موقع فراہم کریں گے

آپ کی مخلص

مس ٹی ٹی شاٹرلی

پرائیویٹ سکریٹری

۵۸۔ ولسیٹ اسٹریٹ

ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیر مس شاٹرلی

آپ کا پیارا پیارا خوبصورت خط دیکھ کر مجھ پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ اوّل تو مجھے کسی صورت یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسی معزز شخصیت جسے ہالی ووڈ کی فلمی دُنیا میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ مجھ ناچیز کو ان الفاظ

ابو الفرح ہمایوں

تقدیر

(افسانہ)

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو (کینیڈا)

مائی ڈیر آنٹی الیزا! اپنے بھانجے
ام قبول کیجیے!

میں نے آپ کی تازہ ترین فلم
لرہ اور جولیس سیزر دیکھی۔ ٹکٹ
فریحات پہ دس پونڈ ضرور صرف ہوگئے
آپ کی اداکاری، رقص اور فنی مہارت
عش عش کر اٹھا۔ مجھے وہ دن یاد
ب آپ یہاں کالج میں پڑھتی تھیں
ادی پر رقص کا پروگرام پیش کرتی تھیں
آپ ہالی ووڈ جاکر ایک مشہور
یف ہیروئین بن گئی ہیں۔ آج سے
سال قبل کس کو آپ کے ستارۂ
کی خبر تھی، سچ کہا ہے کسی نے
سے بڑا ماہر نجوم بھی فلمی ستاروں
تعلق پیشن گوئی نہیں کرسکتا۔

آنٹی! میں اپنی موجودہ ملازمت
سخت بیزار ہوں۔ دن بھر کمپنی
امسال لکھنا۔ شکایات کو نمٹانا،
ے ڈائرکٹر کی پسندیدہ بوتلوں کا
م کرنا اور روزانہ شام کے وقت
ب کو سیر و تفریح کے لیے لے
جانا۔ خاص طور پر آخری کام تو بالکل ہی
بیزار کن ہے۔ میں سخت نالاں ہوں۔
قصہ مختصر میری پیاری آنٹی! اب آپ
مجھے ہالی ووڈ کی فلمی دنیا میں بلا لیں اور
مجھے بھی ایک نامور اداکار بنا دیں۔ میرے
چھ تازہ ترین فوٹو پوز منسلک ہیں!

جلد عنایت کا امیدوار
آپ کا دُور افتادہ بھانجا
سی۔ سی۔ الفریڈ

ولیسٹ گرین۔ ہالی ووڈ

ڈیئر سر!

میں یہ خط آپ کے خط کے جواب
میں مس لارین الیزا کی جانب سے
لکھ رہی ہوں۔ خط پڑھ کر وہ بے حد
مسرور ہوئیں۔ لیکن انھیں افسوس
ہے کہ وہ فلم لائن میں آپ کے لیے
کچھ نہیں کرسکتیں۔ ایکٹنگ کے لیے
پارٹ دار آواز، رونا ہنسنا یا جوڈو
کراٹے ہی کافی نہیں۔ یہاں لومڑی کی
عقل، گرگٹ کی رنگا رنگی، مگرمچھ کی
کھال اور آنسو، عقاب کی نگاہیں،
چیتے کی پھرتی اور پیدائشی کمروڈ پتی
کی قسمت چاہیے۔ ان کا مشورہ ہے
آپ اپنے موجودہ کام پر ہی قناعت کریں۔
آپ اور آپ کی مسز کے لیے نیک
خواہشات کے ساتھ۔

آپ کی مخلص
مس ٹی ٹی شائزلی
پرائیویٹ سیکریٹری

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو (کینیڈا)

میری پیاری پیاری خوبصورت آنٹی!
آپ کی پرائیویٹ سیکریٹری کا خط ملا۔
آج کل تمام عورتوں کو کیبلکس ہے۔ کسی کو
حُسن و جمال کا اور کسی کو عقل و کمال کا۔ مجھے حیرت
ہے کہ آپ کی پرائیویٹ سیکریٹری کو تمام
جانوروں کے نام، کام اور شاید دام یاد ہیں۔
کیا وہ پہلے کسی چڑیا گھر میں ملازم تھی۔

آنٹی! میں پرائیویٹ سیکریٹریوں
کے خطوط کو اہمیت نہیں دیتا۔ کیا آپ اتنی
عدیم الفرصت ہیں کہ خود دو چار سطریں نہیں لکھ سکتیں
مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خود لکھتیں تو یہ
انگریزی ادب اور مجھ بے ادب پر بڑا
احسان ہوتا۔ میں آپ سے بڑی امیدیں
وابستہ کیے بیٹھا ہوں۔ اب آپ اتنی کامیاب
اور مقبول ہیروئین بن گئی ہیں۔ خدا نظرِ بد سے
بچائے۔ آپ کے پاس لومڑی کی عقل، عقاب
کی نگاہیں اور مگرمچھ کے آنسو، سب ہی کچھ
موجود ہیں۔ کیا آپ میرے لیے انھیں استعمال
نہیں کرسکتیں؟

رات میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا

وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ تمھاری خالہ تم
سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ تم فوراً ان
کے پاس جاؤ۔ وہ تمھیں مایوس نہیں کریں گی۔

آپ کا سعادت مند بھانجا
سی۔ سی۔ الفریڈ

۲۷۔ ولیسٹ گرین۔ ہالی ووڈ

مائی ڈیر الفریڈ!

تمھارا دوسرا خط ملا۔ تم نے اپنی مرحوم
ماں یعنی میری بہن کا حوالہ دے کر مجھے مجبور
کر دیا ہے۔ بہرحال چانس لے لو اور ویسٹ
گرین آجاؤ۔ تمھیں فلم لائن میں فٹ کرانے
کی کوشش کروں گی۔

تم نے غلط کیا جو میری پرائیویٹ
سکریٹری کے بارے میں بدتمیزی کی باتیں
لکھ دیں۔ یہ دنیا ہی ایک جانور خانہ ہے
خصوصاً فلمی دنیا۔ وہ ایک مشہور فلم ڈائرکٹر
کی تیسری بیوی کی فرسٹ کزن ہے اور ایک
فلم پروڈیوسر کی ریٹائرڈ محبوبہ۔ اس
کی سفارش تمھارے لیے بے حد فائدہ مند
ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر تم ہالی ووڈ آنا چاہتے
ہو تو فوراً ایک خط لکھ کر اس سے معافی مانگو۔

آنے سے پہلے بذریعہ کیبل یا ٹیلکس
مطلع کر دینا۔ میں ایئر پورٹ پر نہ آسکوں گی
تم ٹیکسی پر آجانا۔ میرے بنگلے کا نمبر اوپر لکھا
ہوا ہے۔ اور ہاں ایک بات اور یاد
دلا دوں۔ فی الحال تنہا ہی آنا۔

اگلے اتوار کو "ایکسکیوزمی ڈارلنگ"
کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ "ٹیکسی اینڈ
لیڈی" مکمل ہونے ہی والی ہے۔ "مریخ
میں ایک رات" کا کنٹریکٹ سائن ہو چکا
ہے۔ مسٹر ڈی لا سلور کنگ اس کے پروڈیوسر
بھی ہیں اور ڈائرکٹر بھی۔ انھیں چند
نئے چہروں کی تلاش ہے۔ اگر تم جلدی
آجاؤ تو شاید اسی فلم میں چانس مل جائے

تمھاری خیر خواہ آنٹی
مس لارین الیزا

۵۸۔ ولیسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیر مس ٹی ٹی شانزلی۔

میں اپنے اس خط کے لیے معذرت
خواہ ہوں جس میں آپ کے متعلق چند قیاس
آرائیاں کی گئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ
آپ ابھی کمسن ہیں اور بے انتہا خوب
صورت۔ اور آپ کا تعلق ہرگز ہرگز
چڑیا گھر سے کبھی نہیں رہا۔ کیا آپ
مجھے اپنی ایک عدد حسین و دلنواز تصویر
سے سرفراز فرمائیں گی؟ میں آپ سے
ملاقات کا بے حد متمنی ہوں اور اس سے
زیادہ آپ کی صورت دیکھنے کا۔ آخر میں
ایک بار پھر عرض کروں کہ میں آپ کی
شان میں گستاخی کے الفاظ لکھنے پر بے حد
نادم ہوں۔ امید ہے آپ میری
معذرت قبول فرمائیں گی۔

آپ کا نیاز مند
سی۔ سی۔ الفریڈ

—

ولیسٹ گرین۔ ہالی ووڈ

ڈیر مسٹر الفریڈ!

آپ کا گرامی نامہ وصول ہوا۔ آپ
نے جس انداز میں مجھ سے معافی مانگی ہے
اور جتنے خوب صورت الفاظ میں میرے
حسن کی تعریف کی ہے۔ اس کے لیے میں
آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میری نظر میں
وہ شخص بے حد قابلِ قدر ہے جو اپنی غلطی کو
فراخ دلی سے تسلیم کرلے۔ آپ کی آنٹی مس
الیزا آپ کی آمد کی منتظر ہیں اور میں بھی
سخت مضطرب ہوں۔ میں ذاتی طور پر آپ
سے بے حد متاثر ہوں اور آپ کی کامیابی
کے سلسلے میں چند قیمتی مشورے آپ کے
گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس کے
لیے ملاقات شرط ہے۔

امید ہے کہ آپ جلد ملاقات کا موقع
فراہم کریں گے

آپ کی مخلص
مس ٹی ٹی شانزلی
پرائیویٹ سکریٹری

۵۸۔ ولیسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیر مس شانزلی

آپ کا پیارا پیارا خوبصورت خ
دیکھ کر مجھ پر "لرزش" سا چھا گیا۔ اوّل تو
کسی صورت یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسی اہم
شخصیت جسے ہالی ووڈ کی فلمی دنیا میں بے
اہمیت حاصل ہے۔ مجھ ناچیز کو ان ا

میں یاد کرے گی اور جب یقین آگیا کہ یہ خط واقعی آپ ہی کا ہے تو میرا اپنی قسمت پر عش عش کر اٹھا۔

آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ اس قدر محبت بھرے الفاظ میرے لیے استعمال نہ کریں تو عین نوازش ہوگی اگرچہ میں دل سے نہیں چاہتا کہ آپ کو اپنے حقیقی جذبات کے اظہار سے روک دوں لیکن میں بے حد مجبور ہوں۔ آپ نے یقیناً میری بیوی کو نہیں دیکھا ہے وہ بے حد زبردست اور خونخوار عورت ہے مجھ پر ہمیشہ کڑی نظر رکھتی ہے۔ میرے تمام خطوط، خواہ وہ باہر سے آئے ہوں یا میں نے کسی کو لکھے ہوں، اس کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں۔ میں نے اس خط کو حوالۂ ڈاک کرنے کے لیے بڑی محنت اور کاوش کی ہے بہرحال آپ کو اپنی مشکلات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ ہاں۔ اگر آپ کوئی دلچسپ بات لکھنا ضروری سمجھتی ہوں تو آئندہ کوئی دوسرا نام استعمال کریں جو کہ مردانہ ہو۔

جہاں تک میری روانگی کا تعلق ہے میں جلد آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ ہوسکتا ہو کہ آپ کے خواب و خیال سے بھی بہت جلد۔

آپ کا نیازمند

سی بی۔ القدیڈ

ولیٹ گرین، ہالی وڈ

ڈیر القریڈ

تمہارا تازہ ترین خط پا کر میں سخت الجھن میں مبتلا ہوگئی ہوں، کبھی سوچتی ہوں اپنی کیفیت سے تمہیں پوری طرح آگاہ کر دوں اور کبھی سوچتی ہوں، ابھی وقت نہیں آیا۔ میں نے بہت غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سب کچھ عیاں کر دوں، تم میرے بارے میں جو چاہو رائے قائم کرو۔

مجھے ایک شخص سے شدید محبت تھی اور وہ بھی مجھے بے پناہ چاہتا تھا۔ ستم ظریفیٔ حالات کہ اچانک وہ ایک حادثے میں چل بسا۔ کچھ عرصے تک میں اس کی یاد میں پاگل رہی لیکن رفتہ رفتہ زندگی کے ہنگاموں میں گھُل مل گئی تمہاری تصویر نے میرے دل کی دُنیا میں ایک بار پھر ہلچل مچادی۔ میں بتا دوں کہ تمہاری شکل و صورت میرے اس محبوب سے ہو بہو ملتی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا محبوب ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے اور مجھے آواز دے رہا ہے۔

میں چاہتی تھی کہ تمہارے آنے کا انتظار کروں اور ہم دونوں مل کر اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ لیکن جس قدر تمہارے آنے میں دیر ہو رہی ہے میرا دل اتنا ہی بے چین ہوتا جا رہا ہے۔ میں اب تم سے ملنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں کر سکتی اور اب کسی کام میں میرا دل نہیں لگتا کیونکہ ہر لمحہ تمہارا ہی تصوّر میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ کئی بار میرا اپنی باس یعنی تمہاری آنٹی سے جھگڑا ہو چکا ہے کل ہم دونوں میں شدید تلخ کلامی ہو گئی اور اس کے نتیجے میں میں ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جس کے لیے قربانی دی ہے اسی کے زیرِ سایہ پناہ لوں۔

بے شک تمہاری موجودہ بیوی کسی بھی حالت میں یہ برداشت نہیں کرے گی۔ لیکن یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے اور میں دیکھنا چاہوں گی کہ تم میں قوتِ فیصلہ، ذہانت اور قوتِ عمل کی خداداد صلاحیتیں کس قدر موجود ہیں؟

میں نے تمہاری ہدایت پر بالکل عمل نہیں کیا ہے (وہ جو تم نے بحیثیت مرد خط لکھنے کو کہا تھا) اور سب کچھ صاف صاف لکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہارا فلم لائن اختیار کرنے کا سوال ہے۔ تو میں اس کی سخت مخالفت کروں گی۔ اگرچہ ہالی وُوڈ میں میری اپنی ایک حیثیت ہے اور میں چاہوں تو بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن حالات بدل جانے کی وجہ سے اب یہ سب کچھ فضول ہے میرے پاس بے شمار دولت ہے اور یہ سب صرف تمہارے لیے ہے۔ ہم دونوں ایک عالیشان مکان خرید لیں گے اور تم کوئی بڑا بزنس شروع کر دینا، مجھے اُمید ہے کہ تم میری ان تجاویز سے اتفاق کرو گے۔

تمہاری مداح

مس للّی شائرلی

ڈسٹرکٹ جیل
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیئر شارلی

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں تمہارے محبت نامے کا جواب اس قدر تاخیر سے دے رہا ہوں، دراصل میں ایک سخت مشکل میں پھنس گیا تھا اور اسی لیے وقت پر تمہیں جواب نہ دے سکا۔ بہرحال اب یہ چند سطور حاضر ہیں۔ گر قبول افتد زہے عزوشرف! اس کے ساتھ ہی اپنی الجھن بھی لکھ رہا ہوں۔

معاملہ یوں تھا کہ تمہارا پیارا

پیارا خط ڈاکیے نے لاکر میری بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ خط پڑھ کے چراغ پا ہو گئی اور سخت غصے کے عالم میں جلی بھنی میرے کمرے میں داخل ہوئی خط کو زور سے میرے قدموں میں پھینک دیا اور چلائی۔

"یہ کس پاگل نے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے؟"

"اب تک تو تمہی مجھے پاگل بیوقوف سب ہی کچھ بناتی رہی ہو۔" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"بکواس بند کرو۔ یہ کس چڑیل کا محبت نامہ ہے؟"

"میں تو فقط ایک ہی چڑیل سے واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس کی تحریر نہیں ہو سکتی۔" میں ابھی تک اصل معاملے سے لاعلم تھا۔

"تم مجھے گالی دے رہے ہو؟" وہ حلق پھاڑ کر اتنی زور سے چلائی کہ میں مارے خوف سے سہم کر رہ گیا۔

"کیا آپ مجھے اس خط کے مندرجات سے آگاہ نہیں فرمائیں گی۔ نہ جانے کیوں میں بھی اُسے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"میں تمہیں اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔ ذلیل انسان! تم نے میری محبت کا یہ صلہ دیا ہے؟ یاد رکھو! میں بھی گری پڑی عورت نہیں ہوں کہ تم جو چاہو سلوک کرو۔ یہ لو، اپنی لاڈلی کا خط سنبھالو۔" اور وہ پیر پٹختی بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں نے خاموشی سے خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک ایک لفظ پڑھا اور میری روح کیف و مسرت سے جھوم جھوم اٹھی! آہ۔ کیا خوبصورت الفاظ تھے اور کیا دل نشین انداز بیان ابھی میں اپنے خوابوں میں ہی گم تھا اور دل ہی دل میں خوش بھی تھا کہ محبت اتنی آسانی سے مل گئی ہے کہ اچانک وہ دوسرے کمرے سے ایک دم پھر نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور میری جانب وہ خطرناک انداز میں بڑھ رہی تھی۔ میں خوف و دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اپنی نئی محبت کا یہ انجام مجھے ہرگز پسند نہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس قدر المناک ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اپنا اور تمہاری محبت کا ماتم کیا اور گڑگڑاتے ہوئے اس سے کہا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ لڑکی خود ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہے خدارا مجھے معاف کر دو۔"

"تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے" وہ بڑبڑائی۔ یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے۔ میں نے تمہارا وہ خط بھی ایک رات تمہارے تکیے کے نیچے سے نکال کر پڑھ لیا تھا جس میں تم نے اس سے اظہارِ عشق کیا تھا اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ آئندہ تمہیں ایک مرد کی حیثیت سے خط لکھے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے شدید نفرت ہے اور تم مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔ لیکن میں بھی تر نوالہ نہیں ہوں، آج میں تمہیں اس دنیا سے ہی چھٹکارا دلا دوں گی۔"

یہ کہہ کر اُس نے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف کیا اور قریب تھا کہ گولی چلا دیتی کہ اچانک نہ جانے مجھے کیسے عقل آ گئی۔ یوں لگا جیسے میرے جسم میں کوئی برقی رَو دوڑ گئی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور میرا ایک پاؤں اُس کے سینے پر پڑا وہ دیوار سے جا ٹکرائی اور پستول اُس کے ہاتھ سے چھٹ کر دور جا گرا

(باقی صـــ پر)

غزل

عبدالمبین نیاز

راہ کا ہر نشان ہے گویا
رہبری ترجمان ہے گویا

چشمِ نم کی عجیب ہے تصویر
پانیوں میں مکان ہے گویا

لفظ جو بھی مرے سخن میں ہے
نشتروں کی زبان ہے گویا

یہ لگا دیکھ کر اجنتا کو
پتھروں کی زبان ہے گویا

اس نے یوں کم توجہی برتی
میری ہستی گمان ہے گویا

میرے لب پر ہے مُہرِ خاموشی
اور سارا جہان ہے گویا

شعر میں لفظیات پیراہن
اور احساس جان ہے گویا

ایسا محسوس ہو رہا ہے نیازؔ
ہر نفس امتحان ہے گویا

ڈاکٹر نرکیش
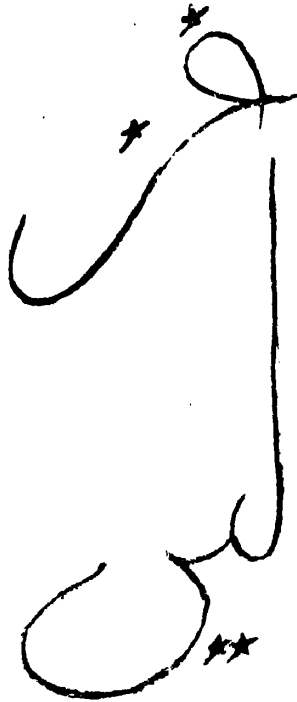
ذکرِ ماضی سے شب و روز ستاتے ہیں مجھے
میرے احباب ہی دیوانہ بناتے ہیں مجھے

میں تو اک جملۂ بامعنی و بامطلب ہوں
اور وہ حرفِ غلط کہہ کے مٹاتے ہیں مجھے

ایک بے ربط تعلق کا سہارا لے کر
لوگ کیا عشق کے انداز سکھاتے ہیں مجھے

جو تھے اپنے ہی خدوخال سے غافل کل تک
آج وہ لوگ بھی آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

کچھ طبیعت ہی بغاوت کی طرف مائل ہے
ورنہ میخانے کے آداب تو آتے ہیں مجھے

کچھ تعلق کوئی نسبت نہیں لیکن پھر بھی
اے نرکیشؔ آج سنا ہے کہ بلاتے ہیں مجھے

نصیر احمد نصیر گلبرگوی

اجنبی سمتوں سے جو چل کر مرے گھر آئے گا
پھول کی مانند پتھر درد کے برسائے گا

آگ لگ جائے گی جب دیوار و در کے درمیاں
پیرہن کا کیا ہے ہر تارِ نفس جل جائے گا

دھند میں کھو جائے گی رخسار و لب کی چاندنی
طائرِ حرص و ہوس جب اپنے پر پھیلائے گا

اور بھی شاداب ہوگا زندگانی کا شجر
وقت شاخوں پہ غموں کی سولیاں لٹکائے گا

بادلوں کی صورتیں سانولا گئیں ہیں اے نصیرؔ
آسماں پیاسی زمینوں کو کہاں لے جائے گا

غبارِ خاطر

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

(ادارہ)

عزیزی محی ناصر۔ سلام

یقین نہیں آتا کہ آپ مجھے بھول
گئے ہوں گے۔ عثمانیہ اور دکن کے دو دو
رشتے جو ہیں۔ غالب لائبریری میں پونم کے
حسب ذیل شمارے موجود ہیں۔

۱۹۶۴ء ۔ مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر
اکتوبر، نومبر، ڈسمبر

۱۹۶۵ء جنوری، فروری، اپریل، جولائی
اگست۔

۱۹۶۶ء مارچ، جولائی، ستمبر

۱۹۶۷ء مئی، جون، ستمبر، نومبر، ڈسمبر

۱۹۶۸ء فروری، اگست، ستمبر

۱۹۷۸ء فروری، مئی، جون

پونم کوئی چودہ پندرہ برس سے نکل
رہا ہے۔ اس مدت میں اگر ناغہ بھی ہوا ہے تو
کم از کم ۱۵۰ شمارے تو ضرور ہی نکلے ہونگے
بڑی خدمت کی ہے۔ اللہ آپ کو مزید استقامت
عطا کرے۔ آپ سے شاید زبانی عرض کیا تھا
کہ غالب لائبریری میں رسائل کا بہت بڑا اور قیمتی
خزینہ ہے۔ تیس ہزار شماروں میں بعض تو سو
سال پرانے بھی ہیں۔ ان رسائل کے مضامین
کے انڈیکس کارڈ بنوائے جارہے ہیں تاکہ
محققین کو سہولت ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ
پونم کے زیادہ سے زیادہ شمارے لائبریری میں
محفوظ کروں۔ میں اردو رسائل کے حالات
سے واقف ہوں اور ادبی رسائل چاہے ہندوستان
کے ہوں یا پاکستان کے ہمیشہ خستہ حال رہے
ہیں اور شاید آئندہ بھی رہیں۔ اس لیے
لائبریری کے مالی وسائل محدود ہونے کے
باوجود میں پونم کے شمارے تھوڑی بہت
قیمت یا ہدیہ پیش کرکے حاصل کروں گا۔

براہ کرم اپنے دفتر کا جائزہ لے کر محفوظ بالا
شماروں کو چھوڑ کر جتنے پرچے آپ کے پاس
ہوں ان کی تعداد اور قیمت سے مطلع فرمائیں۔
"وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے" میں آج
کل اپنا سفرنامہ دکن لکھ رہا ہوں۔ تین باب
مکمل کر لیے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے اوائل تک
پوری کتاب (بشرطیکہ حالات اجازت دیں)
تیار ہو جائے گی۔

مئی ۷۸ء کے پونم میں فیض کا ایک انٹرویو
چھپا ہے یہ کب حاصل کیا تھا اور انٹرویو لینے
والے صاحب کا پتہ کیا ہے۔ کیا یہ شمارہ آپ نے
فیض کو دیا تھا؟ میں اس کی فوٹو نقل فیض
کو لندن بھیج رہا ہوں۔ حیدرآباد میں میں نے
جو کتابیں جمع کی تھیں ان ہی میں یہ شمارہ بھی
تھا۔ کتابیں پچھلے مہینے دہلی سے موصول
ہوئیں ان میں یہ شمارہ ملا تو انٹرویو پڑھنے کو
ملا۔ مختصر ہونے کے باوجود اچھا انٹرویو ہے۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا

مخلص

ظفر الحسن

کراچی (پاکستان)

جناب محترم مدیر "پونم" تسلیمات

نوازش نامہ ملا۔ زر سالانہ خریداری
چیک اسی کے ساتھ ۲۸ اگست ۷۹ء کو روانہ کر رہا ہوں
"پونم" میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے۔ البتہ ضخامت
اور زیادہ ہو تو سبحان اللہ۔ شعری اور نثری سب
ہی تخلیقات بیش بہا ہیں۔ خدا آپ کو اور "پونم" کو
سلامت رکھے۔

میں اپنی نئی کتاب "سات دوست" کے
سلسلے میں بے حد مصروف رہا۔ یہ بچوں کا ادب ہے
جسے آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے مالی تعاون بھی
دیا ہے۔ سو ترتیب اشاعت کے مرحلے طے ہو جائیں
گے۔ آپ کی خدمت میں روانہ کروں گی۔ میرا تازہ مجموعہ
کلام اُردو بھی سالانہ چندے کے ساتھ آپ کے
پاس آجائے گا۔ ابھی کئی کتابیں زیر ترتیب
ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے ارادہ ہے کہ کتابی
صورت میں منتقل کر دوں ورنہ تلف ہو جائے گا
اگرچہ میری نگارشات "عظیم" نہیں کہلائی جاسکتی
ہیں پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ اُردو زبان کے شیدائی
کی پر خلوص کاوشیں اور محسوسات ہیں۔ ایک طرح
اردو ادب کی خدمت ہی شمار ہوگی! یقین مانئے
مجھے اردو سے دیوانہ وار محبت ہے اسے اپنے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

محمد اکرام اللہ خان

فلمنامہ

کل ہی کے اخبار میں ایک خبر نظر سے گذری تھی کہ لاہور میں پاکستانی پروڈیوسروں اور ڈسٹری بیوٹروں نے طے کیا ہے کہ وہ حکومت پاکستان کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کریں گے جس میں ایسی ہندوستانی فلموں کی نمائش پر سے پابندی اٹھالی گئی ہے جو گذشتہ دس پندرہ سال سے کسٹم میں رکی ہوئی تھیں۔ اِن فلموں میں بعض تو ایسی ہیں جن کو بنے ہوئے بیس ۲۰، بائیس ۲۲ سال ہوچکے ہیں اور وہ اتنی پرانی ہوچکی ہیں کہ ہندوستانی انھیں مارننگ شو میں بھی شاید ہی دیکھنا پسند کریں گے۔ ایسی فلموں کی نمائش کی اجازت کے تعلق سے پاکستانی ڈسٹری بیوٹرس کا احتجاج کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پاکستانی فلمی دنیا کو حکومت کے اس مستحسن اقدام کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس فیصلے سے دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد ملے گی۔ دونوں ممالک کی فلموں کے تبادلے نہ صرف ہماری تجارت کو فروغ دیں گے بلکہ باہمی تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو مضبوط اور استوار کرنے میں بھی ان سے کافی مدد مل سکتی ہے سچ تو یہ ہے کہ حکومت کے اس فیصلے سے پاکستانی فلم انڈسٹری کو اپنے معیار کو بلند کرنے کے مواقع حاصل ہوسکتے ہیں یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہندوستانی فلموں کا معیار پاکستانی فلموں کے مقابلے میں بہت بلند ہے۔ ہندوستانی فلموں کے معیار اور ٹکنک کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستانی فلم انڈسٹری ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے ہندوستانی فلموں سے جو آمدنی ہوگی اس سے پاکستانی فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے سینکڑوں افراد کا بھلا ہوسکتا ہے۔ سینماؤں کی حالت بہتر ہوسکتی ہے اور خود حکومت پاکستان کو بھی ٹیکسوں کی شکل میں کافی فائدہ ہوسکتا ہے نیز فلموں کے تقابلی جائزہ کے ذریعے موضوعات میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے۔ موجودہ ایٹمی اور راکٹ کے دور میں بھی پاکستانی فلم انڈسٹری عشق و محبت کی فرسودہ داستانوں کو فلمانے کے چکر سے نجات حاصل نہیں کرسکی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ڈسٹری بیوٹروں کے اس احتجاج کو حکومت پاکستان نظر انداز کردے گی تاکہ دونوں ممالک کی تہذیبی بنیادیں مستحکم ہوسکیں اور مستقبل میں باہمی تعاون کے ذریعے پاکستانی اداکار محمد علی اور زیبا کو ہندوستان کے امیتابھ بچن اور ہیما مالنی کے ساتھ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوسکیں۔ پاکستان کے کسی فلمی رائٹر کی کہانی راج کپور، باسو چٹرجی، یش چوپڑہ اور کمال امروہی جیسے ماہر فن کی ہدایت کاری میں شہرتِ دوام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ساحر لدھیانوی، آنند بخشی اور راجندر کرشن کے گیت غلام علی، فریدہ خانم اور مہدی حسن کی آوازوں میں گونجنے لگیں۔ ساز ہندوستان کے ہوں اور آواز پاکستان کی۔ لتا، رفیع اور آشا کی آواز پر جان چھڑکنے والے پاکستانی شیدائی ان سحر انگیز آوازوں کو اپنی فلموں میں بھی سن سکیں۔ کیا دونوں ممالک میں بسنے والے لاکھوں عوام کی خواہشوں کا خواب محض چند مفاد پرستوں کے احتجاج کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ مجھے امید ہے کہ پاکستانی پروڈیوسر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے اور حکومت ایسے مستحسن اقدام کا بغیر کسی ذہنی تحفظ کے خیر مقدم کریں گے

لکشمی کانت پیارے لال آج کے کامیاب موسیقار مانے جاتے ہیں لیکن آج سے تقریباً دہ، پندرہ سال پہلے دونوں اس قدر غیر معروف تھے کہ کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ان میں لکشمی کانت کون ہے اور پیارے لال کون ہے۔ ایک آرکسٹرا میں منڈولن بجاتا تھا اور دوسرا

وائنگ دھار مک فلموں کے بابو بھائی مستری نے اپنی فلم "پارس منی" کے لیے ان دونوں کا انتخاب کیا۔ اس فلم کے ایک ہی گانے نے جس کے بول ہیں "ہنستا ہوا نورانی چہرہ" نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہونچا دیا۔ اس کے بعد تاراچند برجاتیا کی فلم "دوستی" کے تمام گانوں کی دھنوں نے انھیں نامور موسیقاروں کی صف میں لاکھڑا کیا اس فلم کے گیت مجروح نے لکھے تھے جو سوپر ہٹ ثابت ہوئے۔ جب راج کپور نے شنکر جے کرشن کو نظرانداز کرکے "بوبی" اور "ستیم شیوم سندرم" میں ان کا انتخاب کیا تو ان کی مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

شمی کپور کا بھی ایک زمانہ تھا لوگ اسے باغی اداکار کہنے لگے تھے شمی کپور کو یہ خطاب بہت پسند تھا۔ اس کی زندہ دلی اور مہمان نوازی کی ساری فلم انڈسٹری میں شہرت تھی کئی حسین چہرے اور خوب صورت لڑکیاں اس کی دوستی کی طلبگار رہتی تھیں۔ لیکن شمی کپور کی محبت گیتابالی کے حصے میں آئی جو خود بھی ایک حسین اور باصلاحیت اداکارہ تھی گیتابالی کی بے وقت موت نے شمی کپور کو وقت سے پہلے بوڑھا کردیا۔ دو فلمیں بنانے میں نقصان اٹھایا لیکن اب بھی اس کی یہ تمنا ہے کہ ایک ایسی فلم بناؤں جسے دنیا یاد رکھ سکے۔ شمی کپور کی زندہ دلی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے جارہا تھا۔ ہوائی جہاز کی ایر ہوسٹس بے حد حسین تھی۔ شمی کپور نے جہاز میں سفر کرنے والوں کو مخاطب کرکے کہا: "خدا کرے ہوائی جہاز کسی پہاڑ سے ٹکرا جائے اور میں اس حسین ایر ہوسٹس کے ساتھ جان دینے میں کامیاب ہوجاؤں"۔

پیچیدہ اور شدید تاثر رکھنے والے افسانوں کے خالق مظہر الزماں خاں ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو سیلاب کے دھارے کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی تہہ میں بہتے ہیں تو سطح پر تلاطم نظر آتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

ہارا ہوا پرندہ

زیر طبع

صفحات ۱۲۰

قیمت ۱۰ روپے

تماشائی

فلمی ڈائری

پچھلے لوک سبھا کے انتخابات کے
وقت جن فلم والوں نے ایمرجنسی کی مذمت
کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی کی مخالفت کی
تھا ان میں پران کا نام سرفہرست آتا ہے
پران نے نہ صرف پہل کی تھی بلکہ اندرا
حکومت کے خلاف دوسرے فلمی ستاروں
کی رائے کو ہموار کرنے میں بہت بڑا رول
ادا کیا تھا۔ اس بار بھی جنتا پارٹی کے
انتشار کے بعد فلمی دنیا کی سیاسی
سرگرمیوں کے سلسلے میں پران پیش پیش
نظر آرہا ہے۔ پچھلے دنوں اس نے ایک
فلمی ہفتہ وار "اسکرین" کو ایک خط تحریر
کیا تھا کہ اگر جنتا پارٹی اپنے وعدوں کو
عملی جامہ پہنانے میں ناکام ہو جائے
تو فلمی صنعت اس کے خلاف آواز اٹھائے
گی۔ پران نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا
کہ جب وہ سنگاپور میں ایک بار میں بیٹھا
تھا تو ایک شخص نے طنزیہ انداز میں اس
سے کہا۔ "بھائی کیوں وسکی پر اپنے پیسے
ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں تو اپنے وزیر اعظم
کے مشورے پر عمل کرنا چاہیئے۔"

پران کا سر شرم سے جھک گیا۔ وہ
سوچنے لگا کہ کبھی غیر ممالک میں پنڈت
جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری
یا اندرا گاندھی کا تذکرہ آتا تو لوگ ان
کی سیاسی دانشمندی کا حوالہ دیتے
آج مرارجی دیسائی کی بات نکلتی ہے تو
ذہن "پیشاب آلود" ہو جاتا ہے۔
ایک فلمی تجارتی ہفتہ وار کو انٹرویو دیتے
ہوئے پران نے کہا کہ جنتا پارٹی
نے قومی تعمیری کاموں پر کم توجہ
دی اور مسز اندرا گاندھی کی مذمت میں
زیادہ وقت ضائع کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ
آج کے سیاسی عدم استحکام میں مسز گاندھی
کی شخصیت کافی طاقتور ہو گئی ہے۔
پران نے اعتراف کیا کہ مسز اندرا گاندھی
ہندوستان کی طاقتور ترین وزیر اعظم
تھیں۔ ان کی کمزوری صرف ان کی ماں
کی شخصیت میں پوشیدہ ہے۔
پران نے کہا کہ اگر وہ مرکزی حکومت
کا وزیر صنعت ہوتا تو وہ ٹاٹا اور برلا
جیسے صنعت کاروں پر غیر ضروری پابندی
عائد کرنے کی بجائے انہیں زیادہ سے
زیادہ دولت مند ہونے کا موقع دیتا۔
کیونکہ اس طرح ملک میں زیادہ سے
زیادہ کارخانے قائم ہوتے اور بے روز
گاری کم ہوتی۔ اگر اسے وزارت اطلاعات
و نشریات کی ذمہ داری دی جائے تو
وہ فلموں کی پیداوار کو دوگنا کر دے گا۔
کیونکہ اس طرح ملک کو نہ صرف زیادہ
زر مبادلہ وصول ہوگا بلکہ مختلف ٹیکسوں کے
ذریعے اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا اگر
قسمت سے وہ وزیر اعظم بن جائے تو
سارے ملک میں مفت تعلیم اور مفت طبی
امداد کا انتظام کرے گا۔ اس کے ساتھ
ساتھ وہ بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں کو وظیفہ
مقرر کرے گا۔ اس کا خیال ہے کہ حکومت
چونکہ یہ سب کچھ نہیں کر رہی ہے اس لیے
اسے انکم ٹیکس وصول کرنے کا کوئی حق
نہیں ہے۔ ویسے بھی انکم ٹیکس ہی کی وجہ سے
کالے دھن میں اضافہ ہو رہا ہے اور متوازی
معیشت قائم ہو گئی ہے گاؤ کشی پر امتناع
اور نشہ بندی جیسی پالیسیوں میں اسے بالکل
یقین نہیں۔ اس لئے وہ ان پر اپنا وقت
ضائع کرنے کی بجائے عوام کی صحت، ان
کی تعلیم اور ان کے روزگار پر توجہ دے
کر ملک کی صحیح ترقی کی راہ ہموار کرے گا۔
ہمارے ہاں صرف فلمی اداکار حقیقت
پسند باتیں کرتے ہیں۔ سیاسی قائدین تو
اقتدار ملتے ہی اداکاری شروع کر دیتے ہیں۔

▲

قادر خان اب تک صرف اسکرین پلے
اور مکالمے لکھتے رہے ہیں۔ اب پہلی
مرتبہ وہ فلم قسمت کے لیے کہانی اسکرین
پلے اور مکالمے لکھ رہے ہیں۔ اس فلم
کی شوٹنگ جس کی ہیروئن ہیما مالنی ہے بمبئی
کے نئے تعمیر شدہ اسٹوڈیو پوسٹیہ اسٹوڈیو

بنا ہو رہا ہے۔ یہ اسٹوڈیو بہت خوب صورت انداز میں سجایا گیا ہے اور مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔

▲

گلزار کی فلم دیوداس کا مہورت ہوئے ڈیڑھ سال گزر گیا لیکن فلم کی باقاعدہ شوٹنگ شروع نہیں ہوسکی۔ وجہ یہ ہے کہ دلیپ کمار کی دیوداس میں جو رول موتی لال نے کیا تھا اس کردار کے لیے گلزار کو کوئی موزوں اداکار نہیں مل رہا ہے۔

▲

فلم کلب کی فلم "باگی" کی موسیقی سلیل چودھری دے رہے ہیں۔ اس فلم میں وہ تمام نئے گلوکاروں کو موقع دے رہے ہیں۔ فلم کا کوئی بھی گانا کسی مشہور پلے بیک سنگر سے نہیں گوایا جائے گا۔ سلیل چودھری کی طرح دوسرے موسیقار بھی ہمت کریں تو نئے گلوکاروں کی نہ صرف ہمت افزائی ہوسکتی ہے بلکہ آوازوں کی دُنیا میں صرف چند آوازوں کی اجارہ داری بھی ختم ہوسکتی ہے۔

▲

پاکستان کی ایک اطلاع کے مطابق سندھ کے گورنر جنرل ایس۔ ایم۔ عباس نے شیخ مختار کی فلم "نورجہاں" دیکھی۔ شیخ مختار کچھ عرصہ قبل پاکستان منتقل ہوگئے ہیں۔ جنرل ضیاءالحق سے ایک ملاقات میں شیخ مختار نے "نورجہاں" کی پاکستان میں نمائش کی اجازت چاہی۔ جنرل ضیاءالحق نے وعدہ کیا کہ وہ فلم دیکھنے کے بعد اس سلسلے میں فیصلہ کریں گے۔ ویسے پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش کے خلاف پاکستانی فلمی صنعت میں پرزور احتجاج کیا جارہا ہے۔

▲

راجشری کی فلم "دولہن وہی جو پیا من بھائے" کو نیویارک الیشین ایم لائنس کلب کی طرف سے ۱۹۷۹ء کی بہترین فلم کا اعزاز دیا گیا۔ پہلی مرتبہ کسی ہندی فلم کو نیویارک میں اتنا بڑا اعزاز دیا گیا ہے۔

▲

پچھلے ہفتے بمبئی کی منروا سینما میں "شعلے" کا پانچواں سال شروع ہوا ہے ۲۰۸ ہفتوں کی نمائش میں ۱۵۹ ہفتے رات کے شوز کے ہیں۔ اور ۴۹ ہفتے مارننگ شوز کے۔ اس عرصے میں تماشائیوں کی تعداد ۲۴ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جن کے ٹکٹوں سے ۳ کروڑ سے زیادہ رقم وصول ہوئی ہے۔ تفریحی ٹیکس کے ذریعے ایک کروڑ سے زیادہ رقم حکومت مہاراشٹرا کے خزانے میں گئی ہے فلم کے تقسیم کار کے حصے میں ۲۷ لاکھ سے زیادہ رقم آئی ہے اور منروا کے مالکان کے حصے میں ۳۴ لاکھ سے زیادہ۔ فلم کے پروڈیوسر جی۔ پی۔ سپی کا کہنا ہے کہ یہ فلم ابھی ایک دو سال چلے گی۔ اس طرح اس فلم نے طویل نمائش کا ساری دُنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

▲

• "ڈاگدر بابو" فلم کی ۱۴ ریلیں مکمل ہوچکے ہیں۔ اس کے بعد ایک اہم کردار کے لئے موسمی چٹرجی کو اس فلم میں لیا گیا ہے۔ فلم کا ہیرو دھرمیندر ہے اور ہیروئن جیہ بہادری۔ یہ جیہ بہادری کی آخری فلم ہوگی۔ کیونکہ شادی کے بعد اس نے فلموں میں کام کرنا ترک کردیا ہے۔ جیہ کی پہلی فلم "گڈی" کا ہیرو بھی دھرمیندر تھا اور آخری فلم کا ہیرو بھی دھرمیندر ہے۔

▲

ہالی ووڈ کے ہیرو رچرڈ ایٹن برو ایک عرصے سے مہاتما گاندھی کی زندگی پر فلم بنانا چاہ رہے تھے۔ اب وہ آئندہ سال اپنے اس خواب کی تکمیل کے لئے ہندوستان آرہے ہیں۔ ہندوستانی فلم سازوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ کیونکہ انہیں اپنی مار دھاڑ کی فارمولہ فلموں ہی سے فرصت نہیں۔ اب ایک اطلاع آئی ہے کہ ہریجنوں کے رہنما، جنگ آزادی کے مجاہد اور ہمارے دستور کے مرتب کرنے والوں میں سے ایک ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی پر ایک فلم بننے والی ہے۔ فلم ویسے مراٹھی میں بن رہی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ اسے بعد میں ہندی میں منتقل کیا جائے۔

پچھلے مہینے دو فلمیں "استری پرش" اور "شاید" نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ دونوں فلمیں انگریزی حرف "S" سے شروع ہوتی ہیں۔ دونوں کے فلم ساز سندھی ہیں۔ جن کے نام جگ وانی اور جیٹھ وانی ہیں۔

ان دونوں فلموں میں ہیرو کا کردار اڈ اکٹر کا ہے "استری پرش" کی نمائش بمبئی کی "ڈرائیو ان" تھیٹر میں ہو رہی ہے۔ لیکن بمبئی کے پولیس کمشنر نے اس فلم کی "ڈرائیو ان" تھیٹر میں نمائش پر اعتراض کیا ہے۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ فلم کو "اے" سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے اس سے پہلے "A" سرٹیفکیٹ والی بعض فلموں کی نمائش "ڈرائیو ان" تھیٹر میں ہو چکی ہے۔ "استری پرش" کی نمائش پر اس لئے اعتراض کیا جا رہا ہے کہ فلم کے بعض سین ایسے ہیں جو آواز کے بغیر بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ آواز تو آس پاس کے گھروں تک نہیں پہنچ سکتی مگر آس پاس کے گھروں میں رہنے والے نابالغ بچے وہ سین دیکھ کر سمجھ جا سکتے ہیں کہ پردہ پر جو کچھ بتایا جا رہا ہے اسے انہیں سینما گھر میں دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

▲

"ENTER THE DRAGON"

انگریزی کی مشہور فلم ہے جو باکس آفس پر سوپر ہٹ ثابت ہوئی ہے۔ اب اس فلم کو ہندی میں منتقل کیا جا رہا ہے یا یوں کہئے اس کا ہندوستانی چربہ پیش کیا جا رہا ہے فلم کا نام ہے "دہشا ہوتا ہے جو" اس فلم میں ایک پندرہ سالہ نئے لڑکے جلال شاہ کو لیا جا رہا ہے جس نے مارشل آرٹس میں یعنی جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ (سب سے بڑا درجہ) حاصل کیا ہے۔

▲

فلم "کرودھی" کے پروڈیوسر رنجیت ورمک کو مبارکباد دیجئے کہ اس نے فلم میں حقیقت کو پیش کرنے کی خاطر چار نئے اور قیمتی ٹیلیوژن سٹس کی قربانی دی۔ فلم میں دھرمیندر ٹی وی پر ششی کپور کو دیکھتا ہے اور غصہ سے پاگل ہو کر اس پر گولیوں کی بوچھار کر دیتا ہے۔ اس کے لیے معمولی ٹی۔ وی سٹس استعمال کئے جا سکتے تھے لیکن فلمساز نے ہدایت کار سبھاش گھئی سے کہا کہ وہ اصلی ٹی۔ وی۔ سٹس استعمال کرے ▲

بقیہ: "تقدیر"

جسے میں نے جھپٹ کر اٹھا لیا۔ اپنی پوری شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اُس کے بالمقابل ایک بہتر پوزیشن میں تھا۔ میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ "اگر تم نے اس سے فائدہ اُٹھایا تو ساری زندگی یونہی تڑپتے رہو گے"! اور میں نے اس لمحے کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ صرف دو گولیوں میں وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

قصہ مختصر، میں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں آج کل جیل میں ہوں مقدمہ چل رہا ہے۔ لیکن ناکافی ثبوت کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد رہا کر دیا جاؤں گا۔ رہائی پاتے ہی میں تمہیں اطلاع دوں گا۔ میرا انتظار کرنا۔

تمہارا اور صرف تمہارا

سی۔ سی۔ الفریڈ

▲

تماشائی

بے لاگ فلمی تبصرہ

نٹورلال

فلم ساز ٹونی کی فلم مسٹر نٹور لال" امیتابھ بچن کی کامیاب فلموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ کامیاب صرف ان معنوں میں کہ باکس آفس پر بہت اچھی جا رہی ہے ورنہ کہانی، ہدایت اور موسیقی کے اعتبار سے انتہائی بکواس اور بے جان ہے جو کسی سنجیدہ تماشائی کو کسی صورت میں متاثر نہیں کرسکتی۔ مار دھاڑ کی فلموں میں بپھرے ہوئے نوجوان کے کردار کو امیتابھ نے مستقل امیج بنا لیا ہے لیکن ہر بار اسے ایک ہی کردار میں دیکھ کر تماشائی بور بھی تو ہو سکتے ہیں۔ امیتابھ کا کہنا ہے کہ جب تماشائیوں نے اسے ایک کردار میں دیکھنا پسند کیا ہے اور پسند کر رہے ہیں تو وہ اس کردار کو چھوڑ کر فلم سازوں کے لاکھوں روپیہ کا نقصان نہیں کرنا چاہتے۔ اب عالم یہ ہے کہ ہر فلم ساز امیتابھ کو اسی کردار کے لئے منتخب کر رہا ہے بلکہ اس کردار کو سامنے رکھ کر کہانیاں لکھوائی جا رہی ہیں۔ ایسی صورت میں بھی ٹھیک ٹھاک کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں جن کا کوئی سر پیر ہو۔ لیکن جب فلم ساز کے سر میں شئے لطیف کی جگہ صرف پیسے کمانے کا سودا ہو تو مسٹر "نٹور لال" جیسی فلمیں وجود میں آتی ہیں۔

نٹور لال (امیتابھ) پولیس آفیسر گردھاری لال (اجیت) کا چھوٹا بھائی ہے جسے گردھاری لال اپنے بچے کی طرح پالتا ہے۔ گردھاری لال کا سابقہ ایک خطرناک مجرم وکرم (امجد خاں) سے پڑتا ہے جو کسی بھی قیمت اس بہادر اور فرض شناس پولیس آفیسر کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ گردھاری لال پر حملہ بھی کیا جاتا ہے اور اسے جھوٹے رشوت لینے کے کیس میں ملوث کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔

نٹور لال کا نابالغ ذہن ان واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں وکرم کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن اس آگ کو بجھانے کے لئے وہ قانون کا سہارا لینے کی بجائے خود جرم کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ نٹور لال کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے کوئی ماحول نہیں پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ جھوٹے اینٹی کرپشن کیس کو جیسے فضا میں تحلیل کر دیا گیا۔ گردھاری لال کے لئے مصیبت کا پہاڑ بنا کر اچھا پس منظر پیش کیا جا سکتا تھا۔

نٹور لال مجرم ہوتے ہوئے بھی قانون کے محافظ یعنی اپنے بھائی کے گھر میں بے فکری کے ساتھ رہتا ہے۔ بھابھی ماں کی محبت ہر ہر قدم پر اسے پناہ دیتی ہے۔ مجرم کی حیثیت سے نٹور لال کو چند بے تکی اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد وکرم کا ایک ساتھی جو اب اس کا دشمن ہو گیا ہے وکرم سے بدلہ لینے کے لئے نٹور لال کو دھکا دے کر چندن پور روانہ کرتا ہے۔ چندن پور سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے بارڈر سیکورٹی فورس کی چوکی سے قریب ہونے کے باوجود نظم و ضبط کے سائے سے محروم ہے۔ یہاں وکرم ہیروں کی کان کی کھدائی میں مصروف ہے اور ایک آدم خور شیر کی دہشت پھیلا کر رات کی تاریکی میں چندن پور اور دوسرے آس پاس کے گاؤں والوں کو پکڑتا ہے اور انہیں قیدی بنا کر کان میں ان سے مزدوروں کا کام لیتا ہے۔ گاؤں والے آدم خور شیر کو مارنے کے لئے پولیس کی مدد لینے کی بجائے شکاری کی تلاش میں کیوں رہتے ہیں؟ بارڈر سیکورٹی فورس کی چوکی کے قریب وکرم نے اتنا بڑا ڈائنامائٹ پلانٹ کیسے قائم کیا ہے۔ بارڈر سیکورٹی فورس اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھو

میں کیسے کامیاب ہوا؟ وکرم کے پورے گاؤں کو قیدی بنا لینے کے باوجود اس کی اطلاع قریبی شہری آبادی تک یا پولیس تک کیسے نہیں پہونچی؟ یہ اور اسی قسم کے سوالات کا ہدایت کار راکیش کمار اور کہانی کار اگنی ہوتری کے پاس ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کی تفریح اور ہماری چاندی۔ بہرکیف نٹورلال کو حالات شکاری بنا دیتے ہیں اور وہ تنہا شیر سے مقابلہ کرکے اُسے پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ گاؤں کے ایک مسلم بزرگ (قادر خاں) کی لڑکی شنو (ریکھا) بھی اس کا شکار بن جاتی ہے۔ اُسے نٹورلال اپنے دل میں بند کر لیتا ہے۔ اب نٹورلال کے لئے بس ایک کام باقی ہے وہ ہے وکرم سے بدلہ لینے کا۔ نٹورلال اسے بھی بخوبی انجام دے کر آپ کی چھٹی کرتا ہے۔

فلم کی ہدایت برائے نام ہے تقریباً آدھی فلم کی ہدایت تو فائٹ ماسٹر کی ہے۔ امیتابھ کی اداکاری میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ کچھ مزاح کا پہلو پیدا کیا گیا ہے۔ ریکھا کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اس کا ایک رقص "شعلے" کے رقص کی ناکام کاپی ہے۔ اجیت اور قادر خان کی اداکاری اچھی ہے۔

راجیش روشن کی موسیقی اور آنند بخشی کے گیت دونوں بھرتی کے ہیں۔ نلی مستری کی عکاسی ٹھیک ہے۔ خصوصیت سے ڈائنامائٹ کی سرنگ کے مناظر اچھے فلمائے گئے ہیں۔ اس حصے کی پیشکش بھی اچھی ہے۔ امجد خاں نے اپنے رول کو متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ نٹورلال کسی بھی سنجیدہ تماشائی کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں آسکتی۔ اب اسے کیا کہئے کہ ایسی ہی بکواس فلمیں باکس آفس پر کامیاب جا رہی ہیں۔ ▲▼

Registered with the Registrar of Newspaper-Registered No. 8285/64

E: 6 Phone: 52957

POONAM URDU MONTHLY

ice: Azampura, Hyderabad-500 024 *Editor*; Nasir Kurnooli, M A.

COMPELIMENTS

اکٹوبر 1979
قیمت 1-25

اشاعت کا پندرہواں سال | جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت | علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد (۱۵)

شمارہ (۱۰)

اکتوبر ۱۹۶۸ء

ایڈیٹر
ناصر کرنولی

منیجر ماہنامہ "پونم"
16-7. 506/1
اعظم پورہ، حیدرآباد 24

پونم

زرسالانہ ۱۵ روپے } بیرونی ممالک سے ۲۵ شلنگ
لائبریریز کے لیے ۲۰ ״

ترتیب

مطبوعہ :- دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

گرہست خواتین اور مالکین ہوٹل متوجہ ہوں

سنگارینی کالریز کمپنی لمیٹڈ
اب پیش کر رہی ہے

کفایت بخش، قابل اعتماد، بغیر دھوئیں کا ایندھن
مسلسل پانچ گھنٹے تک سلگتا رہے گا، برتن صاف رہیں گے۔

۴۰ کیلوگرام تھیلے کی قیمت
صرف ۲۲ روپے

تفصیلات کے لئے ربط پیدا کیجیے

مسز یونین کول ڈپو ۔ ملے پلی، حیدرآباد

اسی وقت فون کیجیے، ہم موجود ہیں۔ فون :- 220056 : 36481
(سربراہی فوری آپکے مکان پر)۔

ممتاز مفتی

(خاکہ) — جلتا بجھتا دیا

ابنِ انشا کی شخصیت جلتے بجھتے مٹی کے دیے کی مصداق تھی۔ بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ جلتا تو مسحور سماں بندھ جاتا۔

بنیادی طور پر وہ گھپ اندھیرا تھا۔ چہرا ڈھلک جاتا حسیات ساکت ہو جاتیں۔ بے تعلقی اور اکتاہٹ کے ڈھیر لگ جاتے۔ ایک بے نام دھند کا چھا جاتا۔ اور اس دھند کے میں ایک فرد کھویا کھویا۔ دکھی۔ اکیلا۔ گونگا۔

جلتا تو چہرا مسکراہٹ سے منور ہو جاتا اس مسکراہٹ میں مسرت کم خلوص زیادہ چھپا خلوص بے بسی بھرا لُٹو۔ ناہموار ہرنم۔

شہرت پانے سے پہلے وہ اکثر و بیشتر بجھا رہتا تھا۔ شہرت پانے کے بعد بجھے رہنے کے دوران کم ہوتے گئے۔ مسکراہٹ میں چمک بڑھ گئی۔ گونگا بولنے لگا۔

لگتا تھا جیسے اس کی یادوں کے طاقچے میں کوئی چھپنر سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے ڈر کے مارے اس نے یادوں کا طاقچہ بند کر رکھا تھا۔ یادوں کی روشنی سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے ان جانے میں یا شاید جان بوجھ کر اس نے خود پر گھپ اندھیرا طاری کر رکھا تھا۔

پیدا شاعر بننے کے لیے قدرت کیا کیا جتن کرتی ہے۔

شیر محمد خان ۱۹۲۷ء میں پھلور کے قریب ایک گاؤں تھلہ میں نرگوڑ راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ باپ منشی خان ایک معمولی کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ اس دلخراش حقیقت کو بھول لینے کے لیے پنجابی میں شعر کہنے کا شغل اپنا رکھا تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا۔ خوش گلو تھا۔ یوں گزر بسر ہو رہی تھی۔

شیر محمد کو بچپن میں بکریاں چرانا پڑیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بہت کم تھے۔ شوق باپ سے ورثہ میں پایا تھا شوق کا یہ عالم تھا کہ آٹھویں جماعت میں ایک ادبی ہفتہ وار ادبی جریدہ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ جریدہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا شیر محمد خود ہی کاتب تھا خود ہی مدیر۔ سرکولیشن تو بہت تھی لیکن تعداد اشاعت صرف ایک تھی۔ ہاتھ سے لکھا جاتا۔ ہاتھوں ہاتھوں پڑھا جاتا۔

ابنِ انشا کا پہلا نام شیر محمد خان تھا پھر اس کے ساتھ چودھری کا اضافہ ہو گیا۔ جب وہ جریدے کا مدیر بنا تو لازم تھا کہ اپنے نام کے ساتھ تخلص کا اضافہ کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا نام چودھری شیر محمد خان مایوس صحرائی عدم آبادی رکھ لیا۔ دیر تک یہی نام چلتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ نام بہت لمبا ہے اسے بدل کر قیصر صحرائی لکھنا شروع کر دیا۔

جوانی میں وہ پھر سے اپنے نام سے بیزار ہو گیا۔ اب کی بار اپنے والد منشی خان کے حوالے سے ابنِ انشا کا نام اپنا لیا۔

دسویں جماعت لودھیانہ سے جیسے تیسے پاس کی۔ لودھیانے میں اپنے مدرسے کی وجہ سے ادیبوں ادب پسندوں سے راہ و رسم ہو گئی۔ مسافر لودھیانوی اور حمید اختر اس کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ترقی پسندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا لہٰذا ان جانے میں ابنِ انشا ترقی پسندانہ راہ پہ چل نکلا۔ ابتدا میں اس نے طویل نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں بڑی جان تھی لیکن یہ دور ہنگامی ثابت ہوا۔ ابنِ انشا کی شاعری اس وقت جوبن پر آئی جب اس کے کلام میں ذات کا جوگ ابھرا [illegible] کے بعد کالج میں تعلیم حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ نوائے وقت نے حمید نظامی کے بلانے پر شوق ایڈ لگا کر اسے لاہور لے آیا لاہور میں وہ بری طرح سے دربدر ہوا بھوکا پیٹ پر سو گئیں۔ اخبار رسالوں میں کام کیا ٹھوکریں کھائیں بڑی مشکل سے بی اے کیا۔ پھر دلی میں پوسٹ

نسٹیٹوٹ کے ایک رسالے میں، نوکری مل
گئی۔ وہاں دیوبندر ستیارتھی سے میل ہوا۔
تقسیم کے وقت وہ دلی میں ریڈیو
ند میں مترجم تھا۔ اس زمانے میں دلی ریڈیو
یشن پر بڑے بڑے ادیبوں کا جمگھٹا لگا
ا۔ کرشن، منٹو، راشد، بیدی، ہندیوں
یبوں سے میل جول بڑھا۔ برصغیر کی تقسیم
دلی سے لاہور اور لاہور سے کراچی پہنچا۔
پی ریڈیو نیوز میں چار سال حسرت کے
اتھ کام کرتا رہا۔ وہاں اسامی تخفیف میں
ئی تو احمد بشیر نے ورلڈ ایڈ میں پاک سرزمین
یڈیٹر بنا دیا۔

ابن انشا کی پہلی شادی بچپن ہی میں ہو گئی
ی۔ دلہن بڑی تھی، دولہا چھوٹا۔ اتنا چھوٹا
بب اسے سہرے لگا کر جھوٹا کاٹ پر بٹھایا
تو ضد کرنے لگا کہ میں سیٹ پر نہیں
اس بانس پر بیٹھوں گا جس کے ساتھ گھوڑا
چلتا ہے اور بانس پر ہی بیٹھ کر سسرال گیا۔
پتہ نہیں کیوں یہ شادی اس کے ذہن
ایک بوجھ سے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی سے
اتذکرہ نہ کرتا تھا۔ کوئی کرتا تو ذہن کا فیوز
اتا۔ اس شادی سے دو بچے ہوئے ان کی
ت مزدور بنی لیکن انھیں دور رکھا کبھی اپنایا
، کسی سے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ پھر بیوی
پنڈی ہو گئی۔ تو انشا نے یادوں کا طاقچہ
ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا اور خود پر کھوٹا پہن
کر لیا۔

۱۹۵۷ء میں پہلی بار ابن انشا سے
ورلڈ ایڈ کے دفتر میں ملا۔ احمد بشیر نے چکر
چلایا اور ڈی ایف پی سے میری خدمات
مستعار لے لیں۔ یوں میں بھی ورلڈ ایڈ
کے دفتر میں منتقل ہو گیا۔

یہ دفتر صدر میں کیفیٹیریا کے قریب
ایک چھوٹی سی کوٹھی میں واقع تھا۔ دفتر میں
صرف چار افسر تھے۔ حفیظ جالندھری
ڈائرکٹر تھے احمد بشیر ان کا نائب تھا۔
ابن انشا پاک سرزمین کا ایڈیٹر تھا اور
میں فلم سکرپٹ افسر تھا جسے حفیظ صاحب
نے اپنا پی۔ اے بنا رکھا تھا۔

پانچ دن میں حفیظ صاحب مجھ سے
ایک ڈی او لکھوایا کرتے پھر دس روز اسے
پالش کرنے میں گزارتے۔ اس پہ دن میں
مسلسل سات آٹھ گھنٹے شدت سے
محنت کرتے۔

یہ دفتر ہمارے لیے صرف دفتر ہی
نہ تھا۔ ہمارا کلب تھا تفریح گاہ تھا کافی
ہاؤس تھا۔ گھر تھا۔ اکھاڑہ تھا۔

اس دفتر میں ڈھائی سال مجھے انشا
کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہاں میں نے
پہلی مرتبہ اس جلتے بجھتے دیے کو دیکھا
کچھ دیر تک میں سوچتا رہا کہ یہ بجھتا کیوں
ہے پھر مجھے پتہ چلا کہ یہ توازلی طور پر بجھا
ہوا ہے۔ پھر یہ حیرت دامن گیر ہوئی
کہ اتنی گھمبیر گھٹن کے باوجود یہ جلتا کیسے ہے۔
کبھی سوچتا کہ یہ تو ایک کھلاڑی سی عورت
کے مصداق جو ایک ساعت آپ کی طرف
یوں بیگانہ دیکھتی ہے جیسے آشنا نہ ہو۔
دوسری ساعت مسکرا کر آپ کی گود میں آ بیٹھتی
ہے کبھی محسوس کرتا کہ بکار خویش ہشیار دیوانہ
ہے کبھی یوں لگتا جیسے قلندر سے بڑھ کر لا اور
الا اللہ کی منزل طے کر رہا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ دفتر کے باہر سڑک
کی دوسری طرف سے انشا نے مجھے آواز دی
ادھر آنا ضروری بات ہے۔ سڑک پار کر کے
ادھر گیا تو انشا کا نام و نشان نہ تھا۔ اگلے
روز دفتر میں پوچھا انشا تم نے مجھے بلایا تھا
پھر کیوں چلے گئے۔ بولا "اچھا میں چلا گیا
تھا"۔

ایسی باتیں روز ہوتی تھیں۔ پوچھتا
تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا۔ اچھا میں
نے ایسا کیا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی معصومیت
ہوتی کہ مزید بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ابن انشا نے
کام کرتے کرتے کوئی دور رس بات کہہ دی میں
نے کہا "انشا واہ کیا خوب بات کی" تو اس نے
چونک کر بولا۔ "کون سی؟" میں نے بات
دہرائی حیرت سے میری طرف دیکھا پھر ہنسا
"ہائیں میں نے یہ بات کی تھی۔ مفتی جی کہیں آپ
اپنی بات میرے منہ میں تو نہیں ڈال رہے ہیں"

بڑی سے بڑی بات بھی انشا کو جذب
نہیں کر سکتی تھی۔ آپ اسے قتل کی لرزہ خیز
داستان سنائیں۔ ابتدا میں وہ شوق سے سنتا
تھا۔ پھر سوئچ آف کر کے بیٹھ جاتا۔ بظاہر ہاں ہاں
کرتا رہتا۔ اس لحاظ سے وہ ایک کچھوے کی

معاملات تھے۔ ہر چہار ساعت کے بعد وہ اپنے
غزل میں دیکھ جانے پر مجبور تھا۔
رابطے کے اولین دور میں ایسی کچھ
دہائی اس کے گھونٹے اور اکیلے پن کو عشق سے
تعلق تھا۔ اس کے عشق کے کوائف جان کر
یہ معز مندوم تھوڑا کر رہ گیا۔
انشا کی شخصیت کی طرح اس کا عشق
بھی منفرد تھا۔ عام طور سے بڑے عاشق واپسی
کی کشتیاں جلا دیتے ہیں تاکہ میدان میں پیٹھ
دکھانے کا خطرہ نہ رہے۔ انشا نے آگے بڑھنے
کی کشتیوں کو بھی آگ لگا دی تھی تاکہ کہیں
کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو جائے، کہیں
بیراگ کو چھوڑ کر محبوب کی طرف مائل نہ ہو
جائے۔ کہیں وصال کی قیامت نہ ٹوٹ پڑے
احمد بشیر کا کہنا ہے کہ انشا نے بڑا سوچ بچار
سے عشق لگایا تھا۔
ایسی محبوبہ کا چناؤ کیا تھا جو پہلے
سے ہی کسی اور کی ہو چکی تھی۔ شادی شدہ
تھی بچوں والی تھی جس کے دل میں انشا کے لئے
جذبۂ ہمدردی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ
تھا۔ جس سے ملنے کے تمام راستے مسدود
تھے۔ اپنے عشق کو پورے طور پر محفوظ کر لینے
کے بعد اس نے عشق کے ساز پر بیراگ کا نغمہ
چھیڑ دیا۔
مواقع تو ملے لیکن انشا نے کبھی محبوبہ
سے بات نہ کی۔ ہمت نہ پڑی۔ اکثر اپنے دوستوں
سے کہا کرتا۔ "یار اسے کہو کہ مجھ سے بات کرے"
پھر عاشق کا جلال جاگتا۔ کہتا۔ "دیکھ اس
سے اپنی بات نہ چھیڑنا۔ باتوں باتوں میں
پھرا نہ لینا۔"
محبوبہ تیز طرار تھی۔ دنیادار تھی۔ پہلے
تو تمسخر اڑاتی رہی پھر انشا کی دیوانگی کو کام
میں لانے کا منصوبہ باندھا۔ اس دلچسپ
مشغلے میں میاں بھی شریک تھا۔ انشا کو
فرمائشیں موصول ہونے لگیں۔ اس پر انشا
پھولے نہ سماتے۔ دوستوں نے اسے بارہا
سمجھایا کہ انشا وہ تجھے بنا رہی ہے۔ انشا جواب
میں کہتا کتنی خوشی کی بات ہے کہ بنا تو رہی ہے۔
یہ بھی تو ایک تعلق ہے۔ تم مجھے اس تعلق سے
محروم کیوں کر رہے ہو۔
ایک روز جب وہ فرمائش پوری
کرنے کے لیے شاپنگ کرنے گیا تو اتفاق
سے میں بھی ساتھ تھا۔ میں نے انشا کی منتیں
کیں انشا جی اتنی قیمتی چیز نہ خریدو تمہاری
ساری تنخواہ لگ جائے گی۔
انشا بولا مفتی جی۔ تمہیں پتہ نہیں
اس نے مجھے کیا کیا دیا ہے۔ اس نے مجھے
شاعر بنا دیا۔ شہرت دی۔ زندگی دی۔ انشا
کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔
ایک روز میں نے احمد بشیر سے پوچھا
یار یہ انشا جو اپنے اندر ایک تابوت اٹھائے
پھرتا ہے یہ عشق سے متعلق نہیں تو کیا پہلی
شادی سے متعلق ہے۔ احمد بشیر بولا مجھے
علم نہیں۔ شاید پہلی شادی سے متعلق ہو۔
وہ لاہور کی بات نہیں کرتا۔ لاہور کی بات کرو تو
اٹھ کر چلا جائے گا۔
کیوں لاہور کو کیا ہے۔ میں نے پوچھا
شاید اس لیے کہ اس کی [illegible] بیوی لاہور
میں رہتی ہے۔
میں نے کہا یار اسے لاہور بھیجو۔ سرکاری
حکم دو تاکہ ٹال نہ سکے۔
اگلے روز وزارت کی طرف سے حکم
موصول ہو گیا کہ انشا فلاں کام کے لئے لاہور جائے۔
انشا اس حکم کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ سارا
دن حکم نامے کو سامنے رکھ کر بیٹھا رہا۔
شام کو کہنے لگا۔ تو لاہور جانا ہے نا۔
تو ہو آؤں گا۔ لاہور ہے اس میں کیا بات
ہے بھلا۔
اگلے روز احمد بشیر اور میں اسے اسٹیشن
پر چھوڑنے گئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو میں نے
احمد بشیر سے کہا تو تو کہتا تھا یہ لاہور نہیں جائے
گا۔
حیرت کی بات ہے احمد بشیر نے جواب
دیا۔
اگلے روز جب ہم دفتر میں بیٹھے تھے
دفعتاً ابن انشا داخل ہوا۔ ہم نے کہا یار تو تو
لاہور گیا تھا۔
بولا میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں
بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں سے گاڑی چلی تو
میں پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاڑی رکی
کر میں نے چائے پی سگریٹ

گاڑی کراچی کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ مجھے تو خود
سمجھ نہیں آ رہا کہ گاڑی کراچی سے چل کر پھر سے
کراچی کیسے پہنچ گئی۔

ان دنوں ابن انشا میں خودکشی کا رجحان
بڑی شدت سے تھا۔ یہ رجحان موروثی تھا۔
درحقیقت اسے زندگی سے محبت تھی موت
کا [illegible] شدت سے غالب تھا کہ وہ کبھی کبھی
[illegible] اضطراب پر سوار ہو جاتا جس سے گلو
خلاصی کے لیے وہ جذبہ خودکشی کا سہارا لیتا تھا
ہر چھ ماہ یا سال کے بعد اسے شدت کا دورہ پڑتا
تھا۔

احمد بشیر کو پتہ چلا تو اس نے بڑا
ہمدردانہ انداز اختیار کیا۔ کہنے لگا یہ تو معمولی
سی بات ہے فنکاروں اور ادیبوں کو ایسے
دورے پڑا کرتے ہیں۔ اگر تم اپنی زندگی کو
ختم کرنا چاہتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، ہاں
ایک بات ضروری ہے خودکشی ایسے انداز
سے کرنی چاہیے کہ ایک تو خود کو تکلیف نہ ہو
دوسرے پولیس والے گھر والوں کو تنگ نہ
کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدنامی نہ
ہو جگ ہنسائی نہ ہو۔

انشا کو آخری دلیل بہت پسند آئی
چونکہ وہ بدنامی اور جگ ہنسائی سے بہت
خائف تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بشیر نے انشا
سے وعدہ لے لیا کہ جب بھی دورہ پڑا وہ
احمد بشیر سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں کرے
گا۔

اس کے بعد ناچار ایک بار آدھی رات
کے وقت احمد بشیر کے گھر کا دروازہ بجا۔
باہر انشا کھڑا تھا۔ اوسان چھوڑے ہوئے
از خود رفتہ۔

احمد بشیر اس کے ساتھ باہر نکل
جاتا اور وہ دونوں رات بھر کراچی کی سڑکوں
پر گھومتے ہوئے منصوبہ تیار کرتے۔
احمد بشیر کہتا۔ سلیپنگ پلز اونہوں
یہ سخت تکلیف دہ چیز ہے پھر سوچنا یہ
ہے کہ پولیس کے نام کیسا خط لکھا جائے کہ
گھر والے ملوث نہ ہوں۔

یوں احمد بشیر بولے جاتا بولے
بولے جاتا حتیٰ کہ پو پھوٹ جاتی اور
دورے کی شدت ختم ہو جاتی۔

انہی دنوں ابن انشا قدرت اللہ
شہاب سے متعارف ہوا۔ قدرت اللہ
کی شخصیت سے وہ بہت متاثر ہوا۔
یہ تعلق اتنا بڑھا کہ آخری دور میں دوسرے
تعلقات مدھم پڑ گئے۔

انہی دنوں اس کی مصروفیات میں
اضافہ ہو گیا حلقہ احباب میں عالی اور گلڈ
شامل ہو گئے۔ پھر مرکزی حکومت راولپنڈی
میں منتقل ہو گئی تو اس نے قدرت اللہ کو
خط لکھنے شروع کر دیئے یہ خط رنگینی روانی
اور مزاح سے بھرپور ہوتے تھے۔

ایک دن شہاب نے کہا انشا آپ
مزاح کیوں نہیں لکھتے۔ اس پہ بہت ہنسا
بولا شہاب صاحب اب آپ مجھ سے مزاح
لکھوائیں گے۔ دیر تک وہ شہاب کے مشورے
کو مذاق سمجھتا رہا پھر پتہ نہیں کیسے اس نے
اپنا پہلا کالم لکھا۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔
انشا اچنبھے میں رہ گیا۔

وہ منفرد سادھو شاعر جس نے کبھی
اپنا کلام دوسروں کو نہ سنایا تھا۔ جس کے پاس
گھنٹوں بیٹھ کر بھی آپ کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ
وہ شاعر ہے۔ دوستوں سے پوچھتا پھرتا
آج آپ نے اخبار نہیں پڑھا کیا۔ جیب سے
اخبار خرید کر احباب میں بانٹتا پھرتا۔ دفتر
میں ملاقاتیوں کے سامنے اپنے کالموں کے تراشوں
کی فائل رکھ کر معذرت کرتا۔ آپ اجازت دیں تو
میں ایک ضروری نوٹ لکھ لوں۔ وہ ابن انشا
جو جواہرات کو اپنے چیتھڑوں میں چھپائے
رہتا تھا ٹیڈی پیسوں کو کھنکھنانے لگا۔

اگرچہ شہرت نے ابن انشا پہ شدت
سے اثر کیا لیکن بنیادی طور پر انشا وہی انشا
رہا۔ ہاں ضمنی طور پہ اس میں بڑی تبدیلیاں عمل
میں آئیں۔

شہرت نے اسے بیساکھیاں عطا کر دیں۔
لنگڑا چلنے لگا۔ اس کی بے بسی بھری مسکراہٹ
میں دم خم پیدا ہو گیا۔ خود اعتمادی نے گرتے کو
سنبھال لیا۔ لیکن مکلف قمیص اور یونیکو
سوٹ تلے وہی جٹا دھاری براجمان رہا۔ اس
کے [illegible] کے تواتر میں تخفیف تو ہو گئی لیکن
[illegible] کی نوعیت قائم رہی۔ البتہ وہ عشق کی گتھی
سے آزاد ہو گیا اور محبوبہ کی ذات سے بے نیاز
انہی دنوں انشا نے لاہور بھر کو پیار کر لیا۔

جب ورلڈ بینک ایڈ کا محکمہ تخفیف میں آنے
لگا تو انشا قدرت اللہ سے کہنے لگا۔ شہاب صاحب
زندگی میں میری صرف ایک آرزو ہے اگر آپ
نے پوری کر دی تو [illegible] شہاب
نے پوچھا۔

انشا نے جیب سے کچھ کاغذات
نکالے کہنے لگا یہ دیکھیے یونیسکو کے پلان کے
مطابق پاکستان میں ایک نیشنل بک سنٹر بننے
والا ہے۔ مجھے اس کا ڈائرکٹر بنا دیجئے۔

شہاب نے کہا یہ نوکری تو بالکل
معمولی ہوگی۔

مجھے معمولی ہی چاہیے۔

اس میں ترقی کی گنجائش نہ ہوگی شہاب
نے کہا۔

مجھے ترقی نہیں چاہیے قیام چاہیے
انشا نے جواب دیا۔

یہ بھی پتہ نہیں شاید یہ محکمہ پانچ سال
کے بعد قائم ہو۔ چاہے دس سال بعد قائم
ہو میں انتظار کروں گا۔

نیشنل بک سنٹر کے قیام کے بعد
انشا کو ملک ملک گھومنا پڑا۔ کتابوں کے متعلق
عالمی کانفرنسوں میں شمولیت کرنی پڑی۔ اس
کی کارکردگی دیکھ کر یونیسکو نے انشا کو ایک
بہت اچھی نوکری دی جس کی تنخواہ اس کی تنخواہ سے
بیس گنا زیادہ تھی۔ انشا نے یونیسکو کی آسامی
کو ٹھکرا دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ انکار کی وجہ
کیا ہے تو انشا نے کہا میں پاکستان کی نوکری
چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔
اسے پاکستان سے عشق تھا۔

انشا کو شاپنگ کا بہت شوق تھا
گھنٹوں دکانوں میں گھومتا پھرتا۔ کوئی پوچھتا
انشا جی کیا خریدنے کے ارادے ہیں تو
کہتا ابھی میں سوچ رہا ہوں۔ انشا کی محبوب
ترین دکانیں کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ گھنٹوں
کھلونے دیکھنے کے بہانے ان سے کھیلتا رہتا
اور آخر میں ایک گڑیا خرید کر گھر لے آتا۔
بیرونی ممالک میں جہاں بھی گیا وہاں سے کبھی
کوئی کام کی چیز نہ خریدی لیکن ہر ملک سے ایک
گڑیا ضرور خریدی۔

گھر میں ایک بڑی الماری ان گڑیوں کے
لیے مخصوص تھی۔ یہ الماری ملک ملک کی رنگا
رنگ گڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ پتہ نہیں
یہ گڑیاں وہ کس کے لئے خرید کر لاتا تھا گھر
میں دو بچے ضرور تھے لیکن انھیں گڑیوں سے
کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا مفتی جی کوئی
مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مجھے
بہت ضروری شاپنگ کرنی ہے۔

آج کل یہ رواج عام ہے کہ لوگ کسی
نہ کسی کو شاپنگ کے لئے ساتھ لے جاتے
ہیں تاکہ چیز خریدنے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے
میں سمجھا شاید اسی وجہ سے انشا مجھے ساتھ
لے جا رہا ہے۔ دکان میں داخل ہونے سے
پہلے وہ مسکرا کر کہنے لگا مفتی جی شاپنگ میں
میری مدد کرنا۔ شاپنگ سے میں نہیں بلکہ تم خریدو
گے۔ میں یہ سن کر بہت حیران ہوا۔ بہر حال دو
گھنٹے ہم دکانوں میں گھومتے پھرے۔ انشا
چیزیں پسند کرتا رہا اور میں ان میں عیب نکالتا
رہا۔

آخری دکان میں انشا کو ایک نکٹائی پسند
آگئی میں نے حسب معاہدہ نکٹائی میں نقص نکالنے
شروع کر دیئے جب دکاندار کاؤنٹر کی طرف گیا تو انشا
نے منت سے کہا مفتی جی ایک نکٹائی تو خرید لینے
دو۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ایک روز انشا بہت پریشان تھا
میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ بولا۔ بس حسب
عادت پریشان ہوں۔ تحقیق کے بعد مشکل سے
پتہ چلا کہ کسی دوست سے ملنے گیا تھا۔ دوست
سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ دروازے پر
مالک مکان کرایہ کے لیے تقاضہ کر رہا تھا
انشا نے دو ماہ کا کرایہ ادا کر دیا اور دوست
سے ملے بغیر لوٹ آیا اب اسے یہ فکر دامن گیر تھی
کہیں مالک مکان دوبارہ کرایہ وصول نہ کرے۔
اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ دوست کو یہ علم
ہو کہ اس نے کرایہ ادا کر دیا ہے۔

بات نہ کہنے میں انشا کو کمال حاصل
تھا۔ اس کے قریبی دوست بھی اس کی ذاتی
زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقف نہ تھے۔
روزنامہ امروز کا بیان ہے کہ دروغ برگردن
کہ انشا نے ایم اے کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی
سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی لیکن اس
نے اس تفصیل کے متعلق کبھی تذکرہ نہ کیا۔
نہ خود کو ڈاکٹر لکھا۔

ابن انشا کی باتیں دانشورانہ باتیں

منکشف ہوتی تھیں۔ ان میں عقلی دلیل یا ذہانت کی چمک نہ ہوتی تھی۔ وہ ذہن سے نہیں بلکہ دل سے پھوٹتی تھیں وہ چینی کی رکابی میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتی تھیں۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے سے انشا محروم تھا بلکہ بات کو بھی مٹی میں رول دیتا۔ اس کے منہ سے تو بات بھی ایسی سنائی دیتی جیسے دقیانوسی ہو۔ منہ زبانی مفلس تھا۔ تحریر میں چمکتا تھا۔

کہتے ہیں ابن انشا بہت بڑا کالمسٹ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تحریریں کالم میں چھپتی تھیں لیکن وہ کالمسٹ نہیں تھا بلکہ مزاح نگار تھا۔ کالم نویس کے لئے لازم ہے کہ اسے سیاسی شعور حاصل ہو اور اس کی طنز میں کاٹ ہو۔ انشا میں نہ تو سیاسی شعور تھا نہ اس کے طنز میں کاٹ تھی بڑی سے بڑی طنز ایسے لطیف انداز میں لکھتا کہ لطافت ہی لطافت محسوس ہوتی۔ کاٹ نہیں۔ انشا کے مزاج میں سادگی تھی روانی تھی۔ فکر نہ تھا، مٹی کے تیل کی بو نہ آتی تھی۔

انشا کو سمجھنا، دلیل دینا، بحث کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اسے بدلنا ممکن نہ تھا۔ اس پر اثر انداز ہونا ناممکن۔ اس کے برتاؤ کے خلاف احتجاج کرنا یا اس سے روٹھنا بے معنی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ لاحاصل تھا۔

آپ ایک حد تک اس کے قریب جا سکتے تھے۔ اس کے بعد دھند کی دیوار حائل ہو جاتی۔ اس دیوار میں کوئی دروازہ نہ تھا جس سے آپ داخل ہو سکتے۔ خود انشا کو علم نہ تھا کہ اس دھند کی دیوار کے پیچھے کیا ہے۔

ایک حد تک آپ انشا کی توجہ جذب کر سکتے تھے چونکہ وہ زیادہ دیر اپنے خول سے باہر نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اندر سے اکیلا تھا گونگا اور دکھی۔ آخری ایام میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ ہاجکن کی بیماری میں مبتلا ہے تو ایک دم اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا اس حد تک کہ اس نے خطوں میں، غزلوں میں اور کہیں کہیں کالم میں "حافظ خدا ہمارا" قسم کے مضمون باندھنے شروع کر دیئے۔ اس پر اس کے قریبی دوست آگے بڑھے تاکہ انشا میں زندگی کے متعلق بھروسہ پیدا کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے انشا کے دل سے موت کی ——— "Preoccupation" ——— دور کی۔ شہاب اس عمل میں پیش پیش تھا۔

پھر ڈاکٹر اجمل اور قدرت اللہ شہاب نے کوشش کر کے انشا کا تبادلہ لندن کرا دیا جہاں ہاجکن ڈسیز کا واحد ہسپتال ہے۔ ہسپتال میں انشا نے علاج کی پہلی قسط پوری کر لی۔ اس کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی کہ پھر سے جینے کے پروگرام مرتب ہونے لگے۔

پھر انکوائری کمیٹی نے اس کی آسامی تخفیف میں لا کر اسے وطن واپس آنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ایسے بھونڈے انداز سے دیا گیا کہ انشا کو شدید جھٹکا لگا۔

اگرچہ شہاب نے مل ملا کر اسے علاج مکمل کرنے کی مہلت لے دی۔ لیکن اس کی صحت پھر سے بحال نہ ہو سکی ذہن پر اس قدر شدید چوٹ لگی کہ مفلوج ہو گیا۔ نو روز ہسپتال میں گھڑی بے ہوش رہا۔ دسویں روز انتقال کر گیا۔

آج سے کچھ ایک سال پہلے میرے ایک قلمکار نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ مشہور لوگوں کی خود نوشت آپ بیتیاں پیش کی جائیں۔ اس سلسلے میں، میں نے انشا کو لکھا کہ اپنی آپ بیتی لکھے۔ ابن انشا نے اپنی شخصیت کے متعلق جو مضمون لکھا وہ حرف بحرف درج ذیل ہے۔

"تم نے جو کچھ مانگا ہے اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی اگر بقر ڈ پرسن میں چاہیے تو میں کیوں لکھوں۔ تم خود کیوں نہ لکھو۔ لیکن نہیں میاں تمہارا کیا اعتبار کہ کیا لکھ دو لہذا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ احتیاط سے سنبھالو۔"

مشرقی پنجاب کے دوابے کا دہقانی کہیں بھی پہنچ جائے لاہور، کراچی، لندن، کیلیفورنیا اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استادوں کے بقول موہنگی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشا کو موتی چنداں نہیں سہاتے۔ اپنی موہنگی کی رسی میں وہ کانچ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ دلی، لکھنؤ ہر جگہ کی ٹکسال بندی سے آزاد ہے اور سچ پوچھو تو یہی ایک سلیقے کی بات اس نے کی ہے ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو۔ اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔

ابن انشا کو بارہا اللہ کا شکر ادا کرتے

مجید بیدار حیدرآبادی

آپ بیتی

فنی و ادبی اہمیت

طویل مراحل سے گذر کر مسائل سے الجھنا وسائل سے سنبھلنا اور خوشی و غم سے دوچار ہونے کا نام "زندگی" ہے یعنی زندگی سے مراد کچھ کارنامے چند حادثات، کچھ لغزشیں اور چند کارناموں کے لیے انسان کی جدوجہد ہے جس میں مسرت و غموں سے دوچار ہو کر بگڑنا اور سنورنا بھی شامل ہے اس اعتبار سے "زندگی" حرکت سے مربوط ہے اور جب اسی زندگی کو کوئی انسان قرطاس پر بکھیرتا اور اپنے قلم سے حسیات و کارناموں کا ذکر کرتا ہے تو ایسی تحریر "آپ بیتی" کہلائے گی۔

"آپ بیتی" سے مراد ایسی طرز تحریر ہے جس میں شخصیت خود اپنی ذاتی زندگی کو قلم بند کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں انسان اپنے حالات و تجربات کو اپنے قلم سے لکھ کر اپنی ہستی کا وجود پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے "آپ بیتی" زندگی کا وہ تیقنی اظہار ہے جو خود کارناموں کو خود کی زبانی سناتی ہے۔

حالات، تجربات اور معاملات کی پیش کشی میں "آپ بیتی" سوانح عمری پر کار بند ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں انسان کے حالات جذبات اور کارناموں کو دخل ہوتا ہے یعنی آپ بیتی کارناموں کے سہارے رینگتی رہتی ہے اور جس پر شخصیت کا عکس پوری رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ اس پس منظر میں آپ بیتی شخصیت اور کارناموں کا خود ساختہ اظہار ہے۔ جس میں زندگی کی گرمی اور حالات و تجربات کی عمل آوری بھی شامل ہے۔

فنی اعتبار سے آپ بیتی "ایسی تحریر" کی خصوصیت قرار پائے گی جس میں ایک انسان اپنے کارنامے از خود بیان کر کے اپنی شخصیت کو ٹٹولتا ہے۔ اپنی زندگی کے کارناموں، حادثات اور تجربوں کا از خود بیان "آپ بیتی" ہے اور لازمی ہے کہ یہ بیان تحریر میں ہو اور اس میں ادبی چاشنی بھی ہے۔

"آپ بیتی" صرف زندگی کی ہی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ زندگی میں پیش آنے والے تمام معاملات کو شخصیت، عہد اور ماحول کے پس منظر میں پیش کرتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ بیتی کے تحریر کرنے [illegible] عمل کرتے ہیں بغیر شخصیت کے وجود کے آپ بیتی تحریر کرنا ناممکن ہے یعنی آپ بیتی تحریر کرنے کے لیے انسان کی شخصیت ضروری اس شخصیت کا اہل علم ہونا ضروری ہے۔ اگر شخصیت اہل علم نہ ہوگی تو از خود تحریر کرنے کا عمل ساقط ہو جائے گا اور اگر آپ بیتی سے "از خود تحریر" کی خصوصیت کو علیحدہ کر دیا جائے تو یہ فن مردہ ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ بیتی کے لیے سب سے اولین ضرورت شخصیت کا وجود اور اس کا اہل علم ہونا لازمی ہے۔

شخصیت کا عمل دخل کسی خاص عہد یا دور کی عکاسی کرے گا۔ آپ بیتی میں دوسری ضرورت عہد یا دور کی ہوتی ہے۔ زمانے کے بغیر شخصیت کا عمل دخل بے اثر قرار پائے گا۔ جو بھی انسان ہوگا وہ ایک خاص عہد یا مخصوص دور کا پروردہ و نمائندہ ہوگا۔ شخصیت کا اسی عہد میں ذکر کرنا اور اپنے آپ سے نگاہ پھیرتے ہوئے اس دور کی خصوصیات قلم بند کرنا ہی آپ بیتی ہے۔

"آپ بیتی" ایک شخصی تاریخ کہی جا سکتی ہے جس میں فرد خود اپنے کارنامے گنواتا اور اپنے تجربات کی روشنی میں زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔

"آپ بیتی" کی تیسری اہم ضرورت ماحول قرار پاتا ہے۔ انسان جس ماحول کا پروردہ ہوگا اسی کی نمائندگی آپ بیتی میں کرے گا۔

آپ بیتی انسان کی از خود تحریر کردہ ایسی تاریخ ہے جس میں مصنف مورخ کی حیثیت سے عمل کرتا ہے شخصیت ضرورت کے [illegible]

ی شکل اختیار کرتے گی۔ اسی لیے آپ بیتی کے
فن میں از خود تحریر کو بہت بڑا دخل ہے۔

اپنے حالات تحریر کرنے کا عمل اور شخصی
تسکین "آپ بیتی" کا خاصہ ہے۔ ایک شخص کی
زندگی کے اہم نقوش جب اس کی تحریر سے کاغذ پر
منتقل ہوتے ہیں تو اس کا یہ عمل نہ صرف اس
کی شخصی تسکین کا باعث بنتا ہے بلکہ ادب میں
یہ اضافہ "آپ بیتی" کے نام سے یاد کیا جاتا
ہے۔ آپ بیتی انسان کی ذات کی تسکین کا ایک
ذریعہ بھی ہے۔ فطری طور پر انسان اپنے کارناموں
کو دوسروں کے گوش گزار کر کے مسرت و شادمانی
محسوس کرتا ہے۔ لیکن آپ بیتی کے قاری مسرت
و شادمانی محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے مطالعہ
سے زندگی کی صحت مند قدروں سے روشناس
ہوتے ہیں اور اس طرح زندگی کے تاریک گوشوں
کو روشن کرنے میں آپ بیتیاں بڑی اہمیت
رکھتی ہیں۔

آپ بیتیوں میں ایک دور کی تاریخ
اور شخصیت کا عکس پیش کیا جاتا ہے تاکہ
مستقبل کے محققین کو زندگیوں کو سمجھنے، تحقیق
کے نوادرات کو پرکھنے اور شخصیت کی
خصوصیت کو جانچنے کا موقع ملے۔ آپ بیتی کی
تحریر میں ارادہ کا دخل ہوتا ہے۔ انسان اپنی
زندگی کی تحریر کسی ارادے یا مقصد سے کرتا
ہے لیکن بعض ناقدین نے ادبی اعتبار سے مقصد،
ارادہ کے پس منظر میں لکھی گئی آپ بیتی کو
ناکام تصنیف قرار دیا ہے۔ جیسے [illegible]
پتا نقیف آٹو بیوگرافی میں لکھا ہے۔

"[illegible] نہ دے سکے ہوتا آپ بیتی
[illegible] ناکام [illegible] ہے۔ [illegible]
حتیٰ زیادہ [illegible] کے
[illegible]
اور لوگوں کو [illegible] کہ
[illegible] کو
اور راست باز ہوں۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے جبر کی اس تحریر
سے نقوش کے آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء
میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ
آپ بیتی کا ادبی مرتبہ اسی وقت بلند ہوگا جبکہ
اس میں تصنع نہ ہو۔ انسان اپنی شخصیت کے
بیان میں مبالغہ اور کارناموں کی ترتیب میں
بسا اوقات بے انتہا بڑائی سے کام لیتا ہے
انسان کا یہ عمل آپ بیتی کے خلاف موت کا
درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسی
کو ارادے کا نام دے کر آپ بیتی لکھتے
وقت صاحب شخصیت کے صاف گو اور راست
باز ثابت کرنے کی کوشش کو علیحدگی سے
تعبیر کیا ہے۔ اگر آپ بیتی میں یہ خامیاں
نہ ہوں تو ادبی اعتبار سے وہ بے ارادہ اور
بلا مقصد تحریر کہلائے گی۔

آپ بیتی کا ادبی درجہ متعین کرنے
میں اس کا ارادتاً اور غیر ارادی طور پر لکھنا
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح شاعری میں
آمد اور آورد، نثر میں قلم برداشتہ اور
مقصدی تحریر کا معاملہ ہے ٹھیک اسی
حیثیت سے آپ بیتی کے اصل [illegible] ہیں۔

خود اپنی [illegible] آپ بیتی تحریر
کرنے کے ارادے سے [illegible] قلم
اٹھائیں تو اس کی تحریر میں تصنع کی آمیزش
کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف کوئی فرد
زندگی کے منتشر حالات اور کارناموں کو یکجا
کرنے کے خیال سے آپ بیتی تحریر کرے تو
اگرچہ دونوں انداز میں شخصیت کا دکھاوا
اور کارناموں کی تشہیر مقصود ہے لیکن دوسری
قسم کی آپ بیتی میں بناوٹ شامل نہ ہونے پائے
گی۔

اس اعتبار سے ایسی "آپ بیتیاں"
جو بناوٹ، تشہیر اور پروپیگنڈہ کے لیے
لکھی جاتی ہیں وہ ادبی مرتبہ نہیں پا سکتیں۔ اس
لحاظ سے "آپ بیتی" شخصیت کی دستاویز ہے
جس میں عہد کا ماحول اور شخصیت پوری طرح
واضح ہوتے ہیں۔

اردو ادب میں "آپ بیتی" کا فن
۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ غدر کے حالات
اور افسانوں پر گزرنے والی [illegible] نے
اردو میں اس فن کو فروغ دیا۔ جس کی وجہ سے
اردو نثر میں مخصوص ادبی حیثیت سے "آپ بیتی"
کا آغاز ہوا۔ آپ بیتی کا فن اردو ادب میں
پر اپنی [illegible] اور فنی اعتبار سے پوری طرح
واضح بھی نہیں لیکن اس فن کی جھلکیاں دنیا
کے دیگر ادبیات کے مقابل اردو میں نظر آتی
ہیں۔ اردو میں ابتداءً آپ بیتیاں لکھی گئیں
جن میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے۔
اردو زبان کی سب سے پہلی آپ بیتی

بقیہ: آپ بیتی: فن اور ادبی اہمیت
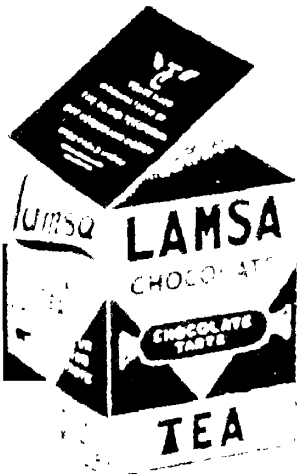
مولانا محمد جعفر تھانیسری کی "کالا پانی" ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں کالے پانی کی سزا کی نمائندہ ہے۔ ظہیر دہلوی کا "داستان غدر" خان بہادر منشی محمد عنایت حسین کی "ایام غدر" مولانا حسرت موہانی کی "قید فرنگ" اس کے علاوہ چودھری افضل حق کی آپ بیتیاں "میرا افسانہ" اور "دوزخ" "سر سید علی رضا" کی "اعمال نامہ" اور حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی "خوں بہا" بڑی اہمیت کی حامل ہے ان کے علاوہ دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی "ناقابل فراموش"، مولانا حسین احمد مدنی کی "نقش حیات" رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری"، عبدالمجید سالک کی "سرگذشت" ہمایوں مرزا کی "میری کہانی میری زبانی" مولانا عبدالرزاق کانپوری کی "یاد ایام" ماشاء عظیم آبادی کی "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی "یاد ایام عشرت فانی" خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔

بیسویں صدی میں جوش ملیح آبادی فیض احمد فیض اور خواجہ احمد عباس نے اس فن پر توجہ دی۔ اس طرح اردو ادب میں آپ بیتی کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا

کون مجھے دکھ دے سکتا ہے

کون مجھے دکھ دے سکتا ہے !
دکھ تو میرے اندر کی کشتِ ویراں کا
اک تنہا بے برگ شجر ہے
رُت کی نازک لانبی پوریں۔
کرنیں، خوشبو اور ہوائیں
جسموں پر جب رینگتے پھرنے لگتی ہیں
میرے اندر دکھ کا ننگا پیڑ بھی جاگ اُٹھتا ہے !
تنگ مساموں کے رخنوں سے
لمبی، نازک شاخیں باہر آ کر
تن کی اندھی شریانوں میں قدم قدم چلنے لگتی ہے !
شریانوں سے رگوں، رگوں سے نسوں کے اندر تک
جانے لگتی ہیں !

صدیق کلیم

اجنبی رہگذر

اجنبی راہ گذر سوچتی ہے
کوئی دروازہ کھلے
ہر طرف درد کے لمبے سائے
راستے پھیل گئے دور تلک
دھڑکنیں تیز ہوئیں اور بھی تیز

اجنبی راہ گذر سوچتی ہے
کوئی مجذوب نظارہ اُبھرے
اور مجبور فقیروں کی طرح
ہر قدم چلتی ہے دستک دستک
ہر نفس، ہاک ہو، ہر اک سمت میں بھاگی لیکن
جس طرح وصل کا ہر لمحہ جدائی کا سفر

اجنبی راہ گذر سوچتی ہے !
شاید اب ایسا مقام آ جائے
ہر قدم آپ ہر اک راہ گذر ہو منزل
خود بخود درد کا ہر لمحہ ہو لطف

اجنبی راہ گذر سوچتی ہے !
دربدر خاک بسر سوچتی ہے !!

مشفق خواجہ

جو مثلِ بادِ صبا پاس سے گزر جائے
گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
یہ کیا طلسم ہے میں اسکو دیکھ بھی نہ سکوں
تو میرے دل میں مثالِ چمن مہکتا ہے
میں آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو
ہے اک خواب مری خود فریب آنکھوں میں

کبھی ہمیں بھی وہ پہچان کے ٹھہ[ر جائے]
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جا[ئے]
کہ جس کے جلووں سے داماں چشم بھر جا[ئے]
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جا[ئے]
وہ روشنی ہے جو دامن کشاں گزر جا[ئے]
اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے

محشر بدایونی

اسی رشتے سے آفاق آشنا ہوں ؛ میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں
یہی منصب بڑا منصب ہے میرا ؛ زمانے میں زمانے سے جدا ہوں
سمیٹے درد اور پھر درد مانگے ؛ کہیں دل ہوں کہیں دل کی صدا ہوں
جواب حوصلہ بھی ہے کوئی سنگ! ؛ ذرا اور آگے چل کر دیکھتا ہوں
مرے شجرے میں ہے طوفاں پناہی ؛ دیِ دریا دلاں ہوں کھل رہا ہوں
کیا گلپوش ہر موسم کو اور پھر ؛ وہی صورت کہ خود شعلہ قبا ہوں
مجھے دیکھو کہ میں خاطر شکستہ ؛ ہزار آئینوں کا ایک آئینہ ہوں
تمھیں کتنی خبر تازہ فرد زو ؛ تم اب جاگے ہو؟ میں شب بھر جلا ہوں
نہیں تن، زخم پیراہن تو پھر میں ؛ کفن بردار ہوں، فن کار کیا ہوں

حزیں لدھیانوی

سب خلقتِ شہر اب کے سوئے دار چلے گی ؛ کس کس کے گلے پر تری تلوار چلے گی
اب میرے بھی ہمراہ تو اگر کوئی ہوں گے ؛ کیا ہے، جو جلو میں ترے دیوار چلے گی
ٹھٹھرے ہوئے ذہنوں کی تہوں سے بھگڈر نا ؛ بجلی کی طرح گر کوئی افکار چلے گی
جائیں گے جہاں تک بھی یہ ظلمت کے بگولے ؛ ساتھ ان کے مری مشعل انوار چلے گی
حالات کا میں صید، تو ہموں کا ہے قیدی ؛ یہ دوستی کب تک مرے غمخوار چلے گی
مٹی کے کھلونے بھی اڑائیں گے ہنسی آج ؛ ہمرہ مرے، بچی مری، بازار چلے گی
بکتے ہی نہیں آج تو پتوار بھوں کے ؛ کس طرح حزیں کشتی اظہار چلے گی

غزلیں

[illegible]

حسرت سہروردی

بھولی بسری یادوں کو تم آنکھ اُٹھا کر دیکھو نہ
ماضی سامنے آئے بھی تو ماضی سے کچھ پوچھو نہ
تم جس کو منزل سمجھے ہو وہ منزل کا زینہ ہے
منزل کے دھوکے میں زینے پر پاؤں کو روکو نہ
دھرتی کے سینے میں یارو دفن ہیں لاکھوں راز ابھی
اس دھرتی کو چھوڑ کے یارو تم آکاش کی جانب دوڑو نہ
ہر پیراہن خوں سے تر ہے ہر رہزن ہے راہ نما
اس اندھیر نگر میں لوگو اپنی زبانیں کھولو نہ
گلشن گلشن خاک اُڑی ہے صحرا صحرا بستی ہے
اک اک یگ اک پل لگتا ہے ایسے میں تم سوؤ نہ
یوں بھی سب کے ساتھ ہے ہم کوئی ہمارے ساتھ نہیں
ہم دُنیا کو سمجھ چکے ہیں کوئی ہمیں سمجھاؤ نہ
حسرت شعر کہو گے کب تک جب کوئی سنتا ہی نہیں
نااہلوں کی محفل میں تم اپنا راگ الاپو نہ

ناصر شہزاد

حسرت عہدِ وفا باقی ہے — تیری آنکھوں میں حیا باقی ہے
بات میں کہنہ روایات کا لطف — ہاتھ پر رنگِ حنا باقی ہے
ابھی حاصل نہیں ظالم کو دوام — ابھی دُنیا میں خدا باقی ہے
بجھ گیا گر کے خنک آب میں چاند — سطحِ دریا پہ صدا باقی ہے
گوپیاں ہی کسی گوکل میں نہیں — بنسیوں میں تو نوا باقی ہے
پاؤں کے پیچھے سرکتی ہوئی خاک — سر میں سندھ کی ہوا باقی ہے
دیکھ یہ چاند، ندی، پھول، نہ جا — رُت میں رس، شب میں نشہ باقی ہے
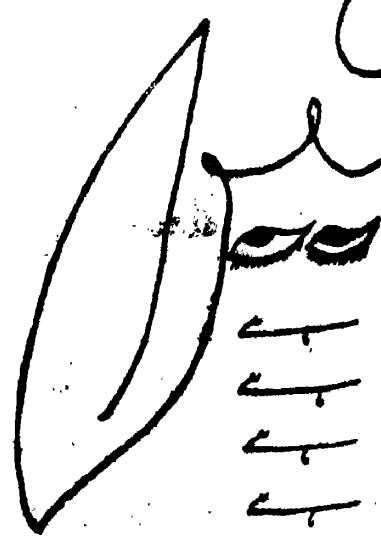
اسلم شیخ

کیا حرج ہے گر کوئی شناسا بھی نہیں ہے
دنیا کو مری ذات گوارا بھی نہیں ہے

کچھ داغ ہیں خود دستِ مسیحا کی عنایت
کچھ درد ہیں وہ جن کا مداوا بھی نہیں ہے

کیا فصلِ گل و لالہ سے ہو اس کا تعلق
جس دشت کی تقدیر میں برکھا بھی نہیں ہے

ارزاں تو نہیں اتنا مصائب کا طمانچہ
تہذیب کے رخسار پہ ہلکا بھی نہیں ہے

کیوں تیری نگاہوں کو ہے احساسِ ندامت
کچھ تجھ سے تو میں نے ابھی پوچھا بھی نہیں ہے

ہے حسن پرستی کی ہنسی آنکھ پہ تہمت
جو آنکھ گنہگار تماشہ بھی نہیں ہے

عیسیٰ نفسی تجھ کو تو کیا ہو گی میسر
تحویل میں تیرے ید بیضا بھی نہیں ہے

بانو طاہرہ سعید

خنک خنک سی ہوا آئی اور شام ڈھلی
تمام دن کی مشقت بھی اب لگے ہے بھلی

میرا وجود کبھی بھی بہار بن نہ سکا
قدم قدم پہ خزاں میرے ساتھ ساتھ چلی

ہے کم نصیبی شفیق و رفیق دیرینہ
یہ زندگی تو اسی کے ہی گود میں ہے پلی

ہماری شاعری ہر حال میں رہی زندہ
مگر دکن کی فضاؤں میں اور پھولی پھلی

چمن میں ہو نہ ہو کچھ حادثہ ہوا ہوگا
کہیں نہ طاہرہ آئی نظر شگفتہ کلی

للیتا دیوی شکلا

آتش تر ہے آبگینوں میں
داغ جلتے ہیں دل کے سینوں میں

دوست داری کی بات کرتے ہیں
اور خنجر ہیں آستینوں میں

زندگی کے بدل گئے تیور!
پڑ گئی جب شکن جبینوں میں

تبصرہ پستیوں پہ کرتے ہیں
بیٹھ کر لوگ شہ نشینوں میں

خوف تیرہ شبی للیتا کیا
شمعیں روشن ہیں اب جبینوں میں

(افسانہ)

کھل جائے اگر زخم

محسن علی

یہ تین ہی دیواروں کا ایک کمرہ ہے جہاں نظریں چوتھی دیوار کی تلاش ہی کرتی رہتی ہیں اور چوتھی دیوار کی کمی کا احساس بار بار ستاتا رہتا ہے۔ لیکن اس تکون کی تزئین و آرائش کا حسن کبھی کبھی اس کمی کو پورا کر دیتا ہے چوتھی دیوار بن جاتا ہے۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اس خوب صورت اور بڑی ہی موڈرن قسم کی عمارت کی تعمیر ہی کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ مجبوراً اس کمرے کو ایک تکون بن جانا پڑا۔ اگر یہ کمرہ ایسا نہ ہوتا تو شاید اس ساری عمارت کی تعمیر اتنی پرکشش اور اتنی موڈرن نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کمرے کا ماحول بڑا ہی خواب آور ہے ممکن یہ خواب گاہ نہیں، نشست گاہ ہے فرنیچر اور سامانِ آرائش میں جو نوادرات شامل ہیں ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے یہاں کچھ دن رہنا بسنا ہوگا۔ ان سے پوری طرح واقف ہونا پڑے گا۔ یہ نوادرات قدیم نہیں، بلکہ بالکل جدید ہیں جو دیکھنے والے کے ذہن کو عیش و آرام اور نئی نئی لذتوں سے بھرپور زندگی کے راستے دکھاتی ہیں۔

اس وقت کمرے کے تکونے روشن دانوں اور تکونی کھڑکیوں کے مہین سے پردوں سے چھنتی ہوئی شام کی سرخیوں میں اشیائے آرائش اور بھی پرکشش ہو گئی ہیں۔ بہت ہی قیمتی اور آرام دہ فرنیچر، فرش پر دبیز قالین، شو پیسیز اپنی اپنی موزونیت سے اپنے اپنے مقام پر ناگزیر، کچھ نہاں، نہاں، کچھ عیاں عیاں — اور ان سب میں گھرا ہوا، ہر شے سے مناسب دوری اور مناسب قربت پر ایک خوبصورت تکونہ ٹیبل، اس کے قریب لگے ہوئے آرام دہ صوفے، تکونے ٹیبل پر ایک تکونی بوتل، دو تکونے گلاس ایک آدھا خالی اور ایک آدھا بھرا ہوا —

آدھے خالی گلاس پر ایک بھرے بھرے صحت مند ہاتھ کی سخت گرفت — یہ صحت مند ہاتھ والا بڑا ہی رعب دار اور خوبرو آدمی ہے اس کا اصلی نام تو کچھ اور ہے لیکن سب اسے نوبی کہتے ہیں۔ اس کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے گلاس سے ذرا پرے جو آدھا بھرا ہوا گلاس رکھا ہے، وہ اپنی جگہ بالکل تنہا ہے۔ لیکن اس گلاس کے رُخ پر جو چہرہ ہے دبلے بدن کا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی ہی چمکیلی ہیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اتنی تیز ہے کہ دیکھنے والا اس کے چہرے کے نقوش کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پاتا۔ اس کا اصلی نام زاہد ہے۔ زاہد کی چمکیلی نظریں اس کے گلاس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ چپ ہے۔

اپنے گلاس کو قدرے ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے، نوبی نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دوست کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا گلاس آدھا خالی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے نارنجی رنگ کے گاؤن کا کالر ٹھیک کیا اور زاہد کی طرف دیکھنے لگا۔ زاہد نے اپنے گلاس سے نظریں اٹھائیں اور دوست کی طرف بغور دیکھا اور کچھ نہ کہنے کے انداز میں کہہ دیا۔

"میرا گلاس ابھی آدھا بھرا ہوا ہے۔" اس گھسے پٹے خیال کے اظہار پر وہ اپنے آپ سے کچھ ناخوش سا ہو گیا اور دیوار پر لگی اڑتی چڑیوں کے غول پر اپنی نظریں جما دیں۔ پرندے پر کھولے ہوئے ایک جگہ اڑ رہے تھے۔

"لیکن زاہد" — بس اتنا کہہ کر نوبی رک گیا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ جو بات وہ کہنے جا رہا تھا۔ اس کے کہہ دینے سے کچھ بدمزگی کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پی اور گلاس ٹیبل پر واپس رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی آستین سے اپنے ہونٹ خشک کیے۔ وہ ہونٹ جو کچھ دیر پہلے کچھ کہنے کے لیے بے چین تھے اب بند تھے۔ لیکن نوبی اس طرح چپ تھا کہ اس کے چہرے کے نقوش نے کچھ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس

کے ذہن میں اُبھرنے والے خیالات اس کے چہرے کے خطوط پر واضح الفاظ کی شکل میں پڑھے جاسکتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک کہانی بیان ہو رہی تھی۔ جس سے دونوں دوست اچھی طرح واقف تھے۔

زاہد نے ایک نظر اپنے دوست کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکالیں اور تیزی سے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا کر یکبارگی گلاس خالی کر دیا۔ اس کی اس حرکت پر نوبی نے اپنے آپ کو اپنے ذہن سے بے تعلق کرنے کی کوشش میں ٹیبل سے ایک موٹا سا سگار اٹھا کر اپنے ہونٹوں میں رکھ لیا اور اپنے گون کی جیب سے ایک ننگی جوان عورت کے پیکر میں ڈھلا ہوا، صندلیں رنگ کا لائیٹر نکالا۔ اور اپنا سگار جلانے لگا۔ لائیٹر کی روشنی میں اس کا چہرہ سنگ اٹھا۔ سگار کے اچھی طرح سلگ جانے کے بعد اس نے لائیٹر بجھایا نہیں، اس کے بھڑکنے شعلے کو بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جانتے ہو میں نے اور شکیلہ نے ہماری شادی کا پہلا سال کچھ عجیب عشق و جنون میں گذارا تھا۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر شکیلہ نے مجھے یہ لائیٹر تحفہ دیا تھا۔ ان دنوں میرے لیے اس کے دل میں اس شعلہ کی طرح پاک اور روشن پیار تھا۔" اس نے لائیٹر بجھا دیا۔ اور اس ننگی عورت کے صندلیں پیکر کو اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں پکڑ کر اپنے دوست کی نظروں کے سامنے تھوڑا ابھرا دیا۔ زاہد نے نظر اٹھائی۔ لیکن یونہی بے معنی انداز سے۔ تب نوبی خود بھی لائیٹر کی طرف تھوڑا ابھر آیا اور زاہد کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ اور اپنی آواز اور لہجے کو پوری طرح موزوں بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ان دنوں شکیلہ کا بدن بھی اس صندلیں پیکر کی طرح سانچے میں ڈھلا لگتا تھا۔"

اس بات پر اُس کے دوست زاہد کی پھیکی نظروں بجلی کی طرح اس پیکر پر کوندتی پل بھر کے لیے جیسے وہ صندلی پیکر یکبارگی دمک کر مدھم پڑ گیا۔ زاہد کا ہاتھ خود بخود شراب کی بوتل کی طرف بڑھ گیا۔ بوتل اٹھا کر اس نے اپنے گلاس میں شراب انڈیلی اور نظریں جھکالیں۔ ویسے اس کے سینے میں ہلکا سا ایک شعلہ لپکا، اس نے چاہا ایک بار پھر ذرا چور نگاہوں سے اس لائیٹر کو تھوڑی دیر تک دیکھ لے لیکن اُسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ نوبی خود اپنی شراب میں اور کتنا زہر ملانے والا ہے اس نے کچھ اس طرح اپنا گلاس اٹھا لیا جیسے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ نوبی کے لائیٹر سے زیادہ دلچسپی اُسے اپنے گلاس سے ہے اور پھر نوبی کی بات سے مزید بے تعلقی کا اظہار کرنے کے لیے ایک بار اس نے ایک ہاتھ سے بوتل اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا کہ اس میں ابھی کتنی شراب باقی ہے۔

"ابھی بہت ہے۔" نوبی نے اپنے لائیٹر کو اپنی مٹھی میں بند کرتے ہوئے کہا اور مسکرا پڑا۔ لیکن نوبی کی مسکراہٹ ایک بد وضع کیڑے کی طرح زاہد کے ذہن پر رینگنے لگی۔ وہ صرف یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر آج نوبی نے ایسی حرکت کیوں کی۔۔۔ اس طرح اپنی بیوی کا ننگا بدن اس کی نظروں کے سامنے کیوں پیش کر دیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ دوسرے کی بیوی کے ننگے بدن کا تصور کیسی آنچ بھڑکا دیتا ہے۔ اس نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور اوپر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

نوبی بھی چپ تھا اور اس کی طرف بڑی ہی جلتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ گھر بھر کے لیے اپنے دوست کی توجہ کا محتاج تھا "یہ دوست بھی کتنا بے حس ہے۔ میری بات کو میرے غم کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔" زاہد کی شکل میں اسے ایک دنیا نظر آئی جو بڑی ہی سفاک ہوتی ہے ۔۔۔ اس نے بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کی بے توجہی کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ اپنے صوفے پر ذرا آرام سے بیٹھتے ہوئے سگار کا ایک لمبا کش لیا۔ اپنا گلاس ہاتھ میں اٹھایا اور اپنا ہونٹوں سے لگا کے ٹیبل پر رکھ دیا پھر یہ سوچ کر کیوں نہ اپنی بیوی کے ذکر کی بجائے وہ ان مغربی ممالک کا ذکر چھیڑے جن کی چار سال تک سیر کر کے زاہد ابھی ایک مہینہ پہلے لوٹا تھا وہ وہاں کی تفصیلات بڑی ہی دلچسپی سے سنا یا کرتا تھا۔ اپنی بیٹھک کا انداز بدلتے ہوئے نوبی کچھ اس یقین کے ساتھ مسکرایا جیسے وہ ماحول کو یکلخت دلچسپ بنا دے گا زاہد کی طرف بڑی ہی پُر خلوص نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"یار زاہد کچھ دن پہلے تم نے ایک

...سیات کہی تھی کہ مغرب کی زندگی اب ...رتی کی طرف تیزی سے لوٹ رہی ہے۔ یہ تم ...ں بنا پہ کہا تھا؟" اور پھر ایک چٹخارہ ...ہ ہوئے بولا۔ "شاید وہاں کی تہذیب ...جو تم نے جنسی تجربے کیے ہیں اُن کی یاد تم ...س قسم کے خیال سے نوازتی ہے — ہے نا؟"

اپنی اس بات پر نوبی اس طرح ہنسی ...جیسے گزرتے لمحات میں اُس نے ایک ...گدگدی سی پیدا کر دی ہو۔ زاہد اس بات ...ہنس تو پڑا لیکن اس طرح جیسے اسے کم از کم ...س بات پر تو ہنسنا چاہیئے اور ذرا ہمدردانہ ...راز سے اپنے دوست کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دیکھو یار، شراب جب خون میں تر ...تی ہے اور عورت جب آغوش میں آجاتی ...تو ہر ملک اور ہر قوم کی عورت اور شراب ...برتاؤ بالکل یکساں ہوتا ہے۔ بس ذرا ...ذائقے میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے اور ...ہ نہیں۔"

پھر ڈبیا سے سگریٹ نکال کر بولا۔

"ذرا تمہارا لائٹر دینا۔"

نوبی کچھ جھجکا، پھر کچھ سوچ کر لائٹر ...س کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اُس کے چہرے ...ہلکا۔ الجھن پھوٹ پڑا۔ زاہد نے لائٹر ...پنے ہاتھ میں لے کر ایک چبھتی نظر نوبی پر ڈالی ...س نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ ...ھر زاہد نے ایک نظر لائٹر کو غور سے دیکھا ...ر سوچا — یہ نوبی کی بیوی کا ننگا بدن ہے ...ہو سکتا ہے بڑا ہی نشیلا خون بہتا ہو اس

بدن میں جو اس لائٹر کی طرح چمکتا ہوا وہ جیتا جاگتا بدن جب دوسرے مردوں کی باہوں میں جلا جلتا ہوگا تو نوبی کا بدن کتنے ٹکڑوں میں کٹ جاتا ہوگا — واقعی یہ کتنا مہذب غم ہے — لیکن ہو سکتا ہے ان سالوں میں اگر میں بجائے ولایت جانے کے یہیں ہوتا تو — تو یہی شعلہ جیسا بدن میری باہوں میں بھی....." اُس نے فوراً لائٹر جلا لیا — ایک ننھا سا شعلہ روشن ہو گیا اور وہ اپنا سگریٹ جلاتے ہوئے لائٹر کو گھورتا رہا — "ہر عورت کا برتاؤ یکساں ہوتا ہے" سوچ کر اُس نے شعلہ بجھا دیا اور لائٹر نوبی کی طرف بڑھا دیا — پھر اپنے دوست پر مسکراتی نظر ڈال کر زاہد نے بڑے ہی رندانہ انداز میں کہا۔

"شراب کے بعد مجھے عورت چاہیئے۔"

اس بات پر نوبی کے جکڑے ہوئے اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ اپنائیت آمیز نظروں کے لمس سے دوست کو قربت کا احساس دلاتے ہوئے بولا —

"ابھی ہم یہاں سے اپنی کار میں مسز کرزن کے پاس چلتے ہیں۔ وہ خوبصورت دُختران شب کا سودا کرتی ہیں اور... پھر اس شب تیرہ و تار کو شبِ نار میں بدل دیتے ہیں۔"

دونوں نے بڑی ہی تیزی سے اپنا گلاس اُٹھا لیا۔ اور دونوں چپ چاپ سے ہو گئے۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی —

دونوں شاید مسز کرزن کے یہاں پہنچ چکے تھے اس بار زاہد نے ذرا کھلے لہجے میں کہا۔

"یار نوبی! تم مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہو۔"

"نہیں!" کہہ کر نوبی نے ایک بڑا ہی کھوکھلا قہقہہ لگایا اور اپنے دوست کو اس طرح کھلا ہوا دیکھ کر بولا۔

"تم جب مغرب میں تھے۔ میں یہی سوچا کرتا تھا کہ تم کو قسمت نے کس قدر لوٹ کر چاہا ہے کہ تمہارے سارے ارمانوں کو زندگی کی لذت بخش دی — اور اِدھر مجھے میری قسمت نے مجبور کر دیا کہ میں اپنی جھوٹی عزت و شرافت کی شکل میں شکیلہ کی بے وفائی کو پالتا پوستا رہوں۔" یہ بات اس نے کہہ تو دی لیکن اُسے اندیشہ سا ہو گیا کہ اُس کی بات سے زاہد کی دلچسپی پھر یکلخت کہیں ختم نہ ہو جائے۔ لیکن جب زاہد کو اُس نے اپنی طرف متوجہ پایا تو اور کھل کر بولا۔

"مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں طلاق تو بڑی عام چیز ہے — بے وفائی خواہ بیوی کی ہو یا شوہر کی، اُن کی زندگی میں کوئی الجھن پیدا نہیں کرتی۔ بڑی ہی آسانی سے دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اِدھر ہم ہیں کہ اس بات کو خواہ مخواہ ایک غم بنا لیتے ہیں — یہ دقیانوسی پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں۔ شرم آنا چاہیئے ہم کو۔"

"شرم غیر مہذب لوگوں کو ہی آتی ہے جو فطرت سے قریب ہوتے ہیں۔ سمجھے؟" زاہد

نے یہ بات کچھ اس قطعیت کے ساتھ کہی جیسے فیصلہ سُنا رہا ہو۔

نوبی اس کی بات سُن کر کچھ اس طرح چونک پڑا جیسے اچانک اپنے آپ سے باخبر ہو گیا ہو۔ پھر وہ ذرا مسکرایا اس لیے نہیں کہ زاہد کی بات اُسے پسند آئی بلکہ اس لیے کہ اس کے دوست نے اس کی بات میں دلچسپی تو لی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہنا شروع کرتا زاہد نے اپنی چمکدار آنکھوں سے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا اور بڑے ہی دھیمے، گہرے اور ٹھنڈے لہجے میں گویا ہوا۔

"دیکھو نوبی — دراصل تم اپنے ہی قصوروں کی سزا بھگت رہے ہو۔ تمہاری بیوی کی بے وفائی سے زیادہ غم دراصل تمہیں اپنی تذلیل کا ہے۔ ساری دنیا کو تم نے اپنا رازدار بنا دیا۔ اس امید میں کہ دنیا تم سے ہمدردی کرے گی۔ لیکن دنیا کی وہی ہمدردی تمہاری تذلیل بن گئی — کاش تم اپنی زبان نہ کھولتے۔ ..... اور تم بھی میری طرح چُپ رہتے ..... اور ..... اور اپنا راز اسی طرح پی لیتے جیسے میں نے اپنا پی لیا ہے ....." اس نے اپنا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔

نوبی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی

"یعنی ..... یعنی ..... تمہاری ... بیوی"

زاہد نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

تھوڑی دیر کمرے کی کھلی کھڑکیوں اور کھلے دروازوں کے پردے ہوا سے ہلنے لگے۔ شام کی ٹھنڈی ہواؤں کے کچھ جھونکے آئے۔ کمرے میں ہلکی سی ٹھنڈک پھیل گئی۔ دونوں دوستوں نے محسوس کیا جیسے اُن کے چہروں پر ایک تناؤ سا تھا جو اچانک کم ہو گیا ہے — نوبی نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی اور دونوں گلاسوں میں شراب انڈیل کر بوتل خالی کر دی۔ اب دونوں گلاسوں میں شراب برابر تھی۔

بقیہ :- "مانس گندھ"

"آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے"۔

بچوں میں ایک بیٹی اُس کی چہیتی تھی اُس نے اُسے گلے لگا کر کہا۔

"بیٹی صبر کرو"۔

"بابا" جس بات کے لیے آپ صبر نہیں کرتے۔ میں کیسے کروں"۔ بیٹی نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں! تمہاری ماں کے اس گھر میں ایک پِلّے کو بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ اب میں سچ مچ گلے میں پھندہ لگا کر جاننا چاہتا ہوں کہ آدمی پھانسی سے کس طرح مرتا ہے"۔ یہ کہہ کر اُس نے کھونٹی سے لٹکی رسی اٹھائی اور بیوی بچوں کو دھکے دیتا ہوا گھر سے نکل پڑا۔

"ہائے یہ کیا ہو گیا — کل سے انھیں کیا ہو گیا ہے۔ بھیّا بھاگو اپنے باپ کے پیچھے۔ یہ سچ مچ کہیں پھانسی نہ لے لیں"۔

بیوی کی واویلا سُن کر وہ رسی مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔

"دوڑو اور بھاگو" کا شور مچا تو دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر اژدہام ہو گیا۔ ہجوم بڑھ گیا تو آدمی کا آدمی کا لگانا مشکل ہو گیا۔ جب ہجوم قابو میں آیا اور سب کو صحیح بات کا علم ہوا تو چاروں طرف لوگوں کو دوڑایا گیا۔ لیکن یہ سب سب جس راستے گئے تھے اُسی راہ واپس لوٹ آئے اور اپنے اپنے ہاتھ جوڑ بیٹھے رہے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

صبح، صبح کسی نے خبر دی کہ وہ جو گھر سے رسی لے کر بھاگا تھا ریل کے پل پر لٹکا ہوا ہے جس کے نیچے ندی بہتی ہے۔ آن کی آن میں شہر سارے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ بڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر کسی نے کہا۔ "دیکھو! ہمارے شہر میں یہ کیسی پھیل گئی ہے"۔

پھندہ لگا کر وہ آدمی ہمیشہ کے لیے وہیں لٹکا رہا اور اُس بُو کو سمیٹ میں بسائے گھروں کو لوٹتے ہوئے ہر شخص نے محسوس کیا کہ اُن کے قدموں کی چاپ سے "مانس گندھ" "مانس گندھ" کی آواز سنائی دے رہی ہے اور اُن کے قدم ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔

ساری رات وہ جاگتا یا کچی نیند سوتا رہا تھا۔ کل ہی اُس نے یہ خبر سُنی تھی ـــــ اُس آدمی کو پھانسی دے دی گئی اس لیے کہ وہ ظالم و جابر ہی نہیں بلکہ قاتل بھی تھا۔" یہی خبر اُسے بے چین کیے ہوئے تھی۔" ظالم و قاتل تو سب ہی تھے پھر اُس اکیلے آدمی کو پھانسی کیوں دی گئی ؟! سب کو پھانسی کون دے ؟ کیسے دے ؟ اکیلے آدمی کے لیے تو پھندہ مل سکتا ہے! سب کے لیے پھندے کون لائے، کہاں سے لائے !!" وہ یہی سوچتا رہا۔

ایک تجویز اُسے اور بجا اپے بیچین کیے ہوئے تھی۔ کسی نے کہا تھا۔" بچارے نے وصیت کی ہوتی ؟"

"کیسی وصیت ؟"

"یہی کہ اس کی نعش کا پوسٹ مارٹم نہ ہو۔"

"پھانسی دی ہوئی نعش کا پوسٹ مارٹم کون کرتا ہے ؟ باقی سب کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے کیسی عجیب بات ہے ـــ نہیں، نہیں نصیحت ایسی ہونی چاہیئے تھی۔

"میری نعش کو میرے چہرے کو میرے عزیزوں اور دوستوں سے چھپائے رکھو۔"

"وہ کیوں ؟"

" اس لیے کہ پھانسی دیئے ہوئے کی آنکھیں اور زبان باہر نکل پڑتے ہیں بڑا ہی بھیانک منظر ہوتا ہے۔"

" عزیزوں اور دوستوں سے کیوں چھپائے رکھو۔ اجنبی لوگ تو جانتے بھی نہیں کہ پھندہ دینے سے پہلے مرنے والے کا چہرہ کیسا تھا۔ شاید وہی اُس کا اصلی چہرہ تھا۔ کیا تم نے جیتے، جاگتے، چلتے پھرتے ایسے چہرے نہیں دیکھے جن کی زبانیں نکلی ہوتی ہیں اور آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی۔"

اس نے تجویز پیش کرنے والے سے یہی کہا تھا اور اس کے بعد سے اُس نے جس شخص کو بھی دیکھا اُس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور زبان لٹکی ہوئی۔

وہ دن بھر تھک تھکا کر گھر لوٹا تھا اور گھر پہنچ کر اس نے یہ خبر سنی تھی۔ زمین کھود کر اینٹیں بناتے ہوئے یا اینٹوں کو دیوار میں جوڑتے ہوئے یہ خبر وہ کیسے سن سکتا تھا۔ خبر سننے کے بعد اسے اپنے گھر میں جتنے لوگ نظر آئے اور اڑوس پڑوس سے جتنے لوگ ملنے کے لیے آئے اُن سب کی زبانیں اُسے لٹکی ہوئی محسوس ہوئیں یہاں تک کہ خود اُسے اپنی زبان بھی لٹکی ہوئی لگی۔ ایک جھٹکے سے اُس کی ساری رگیں تن گئی تھیں۔ کان، آنکھ اور بھیجے تک پہنچنے والی رگیں تن کر کس گئی تھیں۔ دل کی آخری دھڑکن کے ساتھ ہی خون سارے جسم میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اُس کا جسم اکڑ کر ڈھیلا پڑ گیا تھا، پھر اکڑ گیا تھا۔ لیکن کہاں ـــ ؟ اُس کے دل کی آخری دھڑکن تو ابھی باقی تھی۔

وہ کچی نیند سو کر اٹھا تھا یا وہ ساری رات جاگتا رہا تھا اُسے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں تھا ـــ

آج بھی اُسے کام پر جانا تھا۔ کام پر جانے سے پہلے بازار سے سودا بھی لانا تھا۔ واپسی میں ایک کتے کا پلّا اُس کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے گلے میں چھوٹی سی رسی بندھی ہوئی تھی کسی بچے نے شاید یہ حرکت کی تھی۔ رسی اتنی چھوٹی تھی کہ بچے کے ہاتھ میں سما نہ سکی۔ رسی بڑی ہوتی تو شاید یہ پلّا بچے کے ہاتھ سے کبھی آزاد نہ ہو سکتا۔ پھر بھی پلّے کا گلا تنگ ہو رہا تھا۔ اُس نے پلّے کو پھندے سے آزاد کیا تو پلّا اُس کے ساتھ ساتھ ہو گیا۔

بازار سے گذرتے ہوئے کسی نے کہا تھا "بچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے شاید یہ پلّا آپ کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے۔"

"ہوں!.... کون کس کا سہارا ہوتا ہے ہم تو خود اپنا سہارا بھی نہیں بن پاتے۔ دیکھئے نا ـــ میں آج کام پر نہ جاؤں تو اپنے بال بچوں کے لیے

روٹی کا انتظام کیسے کروں؛ لیکن میرے کام
کرنے کی سکت کیا میرا اور ان سب کا سہارا
بن سکتی ہے؟ ..... خیر! اس پلے سے اگر
آپ کو ہمدردی ہے تو اسے آپ لے جاسکتے ہیں؟
یہ سن کر راستے سے گذرنے والے
نے اپنے قدم تیز کر لیے اور پھر اُن دونوں کی طرف
پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔
گھر پہنچ کر اُس نے بیوی بچوں سے کہا
"میں کام پر جا رہا ہوں۔ ذرا اس
پلے کی خبر گیری کرنا۔ چند بچے اس کی بے بسی
سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ
دیوار میں اینٹیں لگانے کے لیے چل پڑا۔
راستہ بھر وہ اپنے قدموں کی چاپ سنتا رہا
آواز جیسے کہہ رہی ہو "مانس گند" "مانس گند"
اُسے یاد آیا "مانس گند" تو جن
دیو کہاں اُس وقت کہا کرتے جب اُنھیں کسی
انسان کی بو آتی تھی۔ یہ بو آواز کیسے بن
گئی؟ کہیں کوئی راکشش اُس کے جسم میں
گھس تو نہیں آیا؟ اس نے چاروں طرف
نظر دوڑائی۔ "نہیں یہاں تو کوئی راکشش نظر
نہیں آتا۔ صرف میں ہی میں ہوں۔"
کام پر پہنچنے میں اُسے ذرا دیر
ہو چکی تھی۔ مالک نے کہا۔
"تم آج چھٹی لے لو۔ یوں بھی کئی
دن سے کام کرتے ہوئے تم نے خوب کما لیا ہے
اور ہاں تمہارا دوست ۔۔۔ وہی جو تمہارے
ساتھ اینٹیں بنایا کرتا تھا اُس کی ٹکر ہو گئی
ہے اور وہ اب دواخانے میں ہے۔"

اتنا سن کر اُس نے دواخانے کی راہ
لی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُس کے
دوست کے جسم پر بہت سی چوٹیں آئی
ہیں۔ شدید چوٹ تو چہرے پر لگی تھی۔
دایاں جبڑا سرک کر نیچے آگیا تھا۔ اُس
نے اپنے دائیں جبڑے پر ہاتھ پھیرا تو
اُسے اپنا جبڑا بھی سرکا ہوا محسوس ہوا۔
اُس نے اپنے دوست سے پوچھا۔
"تمھیں ٹکر لگی تھی تو کیا تم نے اپنے
گلے میں کوئی پھندہ سا محسوس کیا تھا؟"
"تم یہ کیسا سوال کر رہے ہو؟"
اُس کے دوست نے اچنبھا ہو کر کہا تھا۔
"تم بُرا نہ مانو۔ میں تمھارا یہ جبڑا
دیکھ رہا ہوں۔ یہ اپنی جگہ سے سرک گیا
ہے لیکن پھر بھی تم بات کرنے کے لائق ہو
تمھاری زبان تو تمھارے منہ میں برابر ہے
ہے نا؟"
قبل اس کے کہ اُس کا دوست جواب
دیتا اس نے پھر سے کہا۔
"اچھا اب میں جا رہا ہوں۔ گھر میں
ایک پلے کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ پتہ نہیں
بچے ٹھیک سے اُس کی خبر گیری کر رہے ہیں کہ
نہیں۔ گھبراؤ نہیں تم بہت جلد ٹھیک ہو
جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھر
کی راہ لی۔ وہ کل شام سے کچھ کھایا نہیں
تھا لیکن اس کی بھوک بھی اُڑ گئی تھی۔
ایسے ہی جیسے روح جسم سے اُڑ جاتی ہے
"وہ پانی تو پی سکتا ہے۔" یہ سوچ کر

اُس نے راستے کے ایک ہوٹل کے اندر
رکھا۔ میز پر رکھی ایک گلاس اُٹھا کر پا
پینے کی کوشش کی۔ پانی اُس کے حلق میں
اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ تیز کانٹے چبھنے
رسی کے پھندہ کا احساس گردن میں ہو
حلق سے کوئی چیز بھلا کیسے گذر
اُس نے گلاس کو میز پر ٹیک دیا۔
وقت سے پہلے گھر پہنچنے پر
والوں نے تشویش کا اظہار کیا۔ پہلے
پلے کے بارے میں دریافت کیا۔ پلا
موجود نہیں تھا۔
"تم لوگوں سے اتنا بھی نہ ہو
ایک کتے کے بچے کی حفاظت کر سکو۔
تم لوگوں میں سے کسی سے بات نہیں ک
کوئی میرے قریب نہ آنا۔" یہ کہہ کر
کے ایک کونے میں دری بچھا کر سو گیا
دوپہر سے شام ہو گئی۔ وہ خود
میں مصروف رہا۔ گھر والے اُس کے قر
سے گھبرانے لگے۔ شام ہو چکی تو اُس نے
سے اپنی بیوی اور بچوں کو پاس بلا کر
"میں اس زندگی سے عاجز آ چکا
تم لوگ جانتے ہو کہ میں نے کل شام
کھانا نہیں کھایا ہے۔ اب میری بھوک اور
ہمیشہ کے لیے مر چکے ہیں۔ بھوک اور
کے بغیر زندگی بے مزہ ہو چکی ہے۔
مرنا چاہتا ہوں۔"
بیوی اور بچوں نے ایک
کر کہا۔

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

طٰہٰ آفندی

(افسانہ)

سکنڈ ہینڈ

شادی کے دعوت نامے کو اعظم صاحب نے حیرت سے دیکھا۔ دعوت نامہ شاندار تھا۔ شادی کی تقریب کے علاوہ ولیمہ کا کارڈ بھی اس سے منسلک تھا۔ قدیر میاں کی دونوں لڑکیاں انیسہ اور نخت کی شادی ایک ہی دن ہو رہی تھی۔

اعظم صاحب کو حیرت اس بات پر تھی کہ قدیر میاں ایک چوکیدار ہونے کے باوجود اتنے شاندار پیمانے پر اپنی لڑکیوں کی شادی کیسے کر سکتے ہیں، ان کے گھریلو حالات اعظم صاحب سے پوشیدہ نہیں تھے جس مڈل اسکول میں ان کی لڑکیوں نے تعلیم حاصل کی تھی اعظم صاحب اُسی میں ٹیچر تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے قدیر میاں کی ایک لڑکی کی فیس معاف ہوئی تھی۔ ایک ہمدرد استاد ہونے کے ناطے شاید اسی لیے ان کے نام دعوت نامہ آیا تھا۔

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اعظم صاحب سوچ سوچ کر حیران تھے قدیر میاں کو الٰہ دین کا چراغ مل گیا ہے یا انہیں کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا آخر اکتا کر کندھے اُچکاتے ہوئے بڑبڑا کر خاموش ہو گئے۔ "کسی کی ظاہری حالت سے اس کی حقیقت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے"۔

اعظم صاحب کی لڑکی تیزی سے جوانی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہ خود ریٹائرمنٹ کی طرف جھکتے جا رہے تھے۔ انھیں یہی فکر دامن گیر تھی، جب لڑکی شادی کے قابل ہو جائے گی تو جانے بات کیسے بنے؟ بڑا لڑکا گریجویشن کرنے کے بعد دو سال سے نوکری کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، رہ رہ کر انھیں قدیر میاں کے مقدر پر رشک آنے لگا۔ شادی کے دعوت نامے سے معلوم ہوا اُن کے دونوں داماد سرکاری ملازم ہیں۔

اعظم صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا سرکاری ملازم تو منہ کھولے رہتے ہیں۔ گھوڑے جوڑے کی رقم ہزاروں میں مانگتے ہیں اور جہیز کی ایک طویل فہرست بھی ساتھ میں چپکا دیتے ہیں۔ لڑکی کو کوئی گھر میں بٹھا کر رکھنے سے تو رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا، سود پر قرض لے کر یا اگر کوئی گھر یا جائیداد بچ رہی ہو تو فروخت کر کے ماں باپ لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دیتے۔ جن کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا ان کے گھروں میں کنواری لڑکیاں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔

شادی کی تقریب کمیونٹی ہال میں منعقد کی گئی تھی۔ کمیونٹی ہال رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پہ فلمی گانے بج رہے تھے۔ ہال کے باہر کھلی زمین پر دو اسٹیج بنائے گئے تھے، جن پر وہ دو دلہے براجمان تھے۔ کمیونٹی ہال کے عقبی حصہ سے باسمتی چاول کی خوشبو فضا میں بکھر رہی تھی۔

اعظم صاحب محو حیرت بنے آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئے۔ قدیر میاں نے جیسے ہی اعظم صاحب کو دیکھا لپکتے ہوئے پہنچے۔ باچھیں پھاڑ کر مسکراتے ہوئے انھوں نے اعظم صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "آئیے۔۔۔۔ آئیے۔۔ تشریف لائیے۔ ہماری خوش نصیبی کہ ہم آپ کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کر سکے"

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔۔" وہ قدیر میاں کا ہاتھ دباتے ہوئے بولے۔ "دونوں دامادوں کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے" جس پر قدیر میاں کی گردن تن گئی۔ انکساری سے بولے۔ "بس آپ لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے"۔

قریب کی ایک کرسی پہ بٹھا کر قدیر میاں داخل ہوتے ہوئے دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اعظم صاحب نے آس پاس نظر دوڑائی، کئی چہرے جانے پہچانے نظر آئے۔ نکاح خوانی میں ابھی دیر تھی۔ پاس والی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے انھیں دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔

"میں نے کہا ماسٹر صاحب۔۔۔۔ آداب عرض ہے" انھوں نے چونک کر دیکھا اور پہچان کر بے ساختہ بولے

"ارے اختر میاں آپ؟ بھئی معاف

کرنا میں نے دیکھا نہیں۔" اُن کے گھر کے قریب ہی اختر میاں کا جنرل اسٹور تھا۔

دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ آخر اعظم صاحب اپنا تجسّس نہ چھپا سکے۔ اور دبی آواز میں بول ہی دیئے۔

"بھئی کچھ بھی کہو۔ قدیر میاں کے مقدر پہ تو رشک آتا ہے۔ اس پُر آشوب دَور میں اپنی لڑکیوں کی خوب دھوم دھام سے شادی کر رہے ہیں۔"

"ہاں! صاحب۔ دُنیا والوں کی نظر میں خوب دھوم دھام نظر آ رہی ہے۔" کہتے ہوئے اختر میاں کے چہرے پہ معنیٰ خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"... اور وہ بھی ایک محدود آمدنی والا شخص ایسا کرے تو بڑی حیرت ہوتی ہے"

اعظم صاحب کی حیرت بدستور برقرار رہی۔

"بس۔ اب آپ سے کیا بتائیں"؟ اختر میاں مذبذب ہو کر بولے۔ وہ پس و پیش میں تھے، جیسے کوئی بات بتا دیں یا نہیں؟ انھیں ہچکچاتے دیکھ کر اعظم صاحب اُن کی طرف جھک آئے اور رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ایسا لگتا ہے۔ جیسے کوئی خاص بات ہے۔ آپ شاید بتانا نہیں چاہتے۔"

"نہیں صاحب..." اختر میاں پس و پیش سے بولے..." مگر خاص ہی کہنا چاہیئے۔" انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ پھر اعظم صاحب کا شانہ دباتے ہوئے بولے "بات ابھی حد تک ہی رکھیئے گا۔"

"ضرور ۔۔۔ ضرور .... یقین رکھیئے۔" اعظم صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"جی۔ حقیقت دراصل یہ ہے.." اختر میاں پھر رُک گئے..." لازمی بات ہے ہر کسی کو حیرت ہوگی کہ اتنا ڈھیر سارا روپیہ کہاں سے آگیا جو قدیر میاں نے ایک ساتھ اپنی دونوں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دیئے" اور اعظم صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے، چند ہفتوں کے لیے ان کی دونوں لڑکیاں اپنی خالہ کے پاس گاؤں گئی تھیں؟"

اعظم صاحب انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے "میں دوسروں کے گھریلو معاملوں سے دُور ہی رہتا ہوں۔ لیکن آپ کہیئے بات کیا ہوئی؟"

"خالہ کے پاس جانے والی بات ایک بہانہ تھی تاکہ یہ بات راز ہی رہے۔" اختر میاں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔

اعظم صاحب ذوقِ تجسّس سے کسی قدر اور نزدیک آ گئے۔ ماحول کے ہنگاموں سے بے پرواہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔

"آپ کو معلوم ہی ہے۔ آج کل خلیجی ریاستوں سے عرب آ رہے ہیں"....... اختر میاں کی سرگوشیاں جاری رہیں ... اور یہاں آکر شادیاں کر رہے ہیں۔ جن میں زیادہ تر نیم دری عرب عمر رسیدہ ہیں...." اختر میاں سانس لینے کے لئے رُکے۔ اعظم صاحب فوراً بول اُٹھے۔

"ہاں بھئی۔ شادی کے نام پر تو یہ لوگ کھلی عیاشی کر رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی غربت اور افلاس سے فائدہ اٹھا کر ایسی ایسی شرمناک حرکتیں کر رہے ہیں کہ خدا بچائے"... خیر۔ آپ کیا کہہ رہے تھے؟

اختر میاں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ "ایسے ہی دو عربوں سے قدیر میاں کی دونوں لڑکیاں بیاہ دی گئی تھیں۔"

اعظم صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے کانوں کے نزدیک دھماکہ سا ہوا۔ انھیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولے۔

"لیکن .... لک .. کیا آپ کو یقین ہے یہ بات سچ ہے؟" جس پہ اختر میاں ہلکی مسکراہٹ سے بولے۔ "یقین نہ ہو تو آپ قدیر میاں سے تصدیق کر سکتے ہیں..." پھر خود ہی بولے .. یہی نہیں۔ اُن عربوں کے ساتھ شادیاں میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ اس دوران ان کی لڑکیاں اُن کی اولادوں کی ماں نہیں بنیں گی۔"

اعظم صاحب حیرت سے مُنہ کھولے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ اختر میاں اُسی سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگے۔ "قدیر میاں کی لڑکیاں ایک مہینے سے کچھ اوپر اُن عربوں

ساتھ رہیں۔ بعد میں اپنے ملک واپس جاتے ہوئے وہ صاحب طلاق دے کر چلے گئے۔" قدرے رُک کر بولے۔ "شادی کی ایک شرط طلاق اور آزادی بھی تھی۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر فلمی گانے بدستور بج رہے تھے اختر میاں نے پھر بولنا شروع کیا۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ ہمارے غیر شادی شدہ نوجوان ہمیشہ منہ کھولے رہتے ہیں۔ جہیز میں ہزاروں کی رقم مانگتے ہیں۔ اُن عربوں سے ملنے والی رقم سے قدیر میاں اپنی لڑکیوں کی شادی اتنی دھوم سے کر سکے۔"

اختر میاں کے خاموش ہونے کے کچھ دیر بعد قدیر میاں لپکتے ہوئے اُن کی طرف آئے۔ "آئیے چلیئے۔ قاضی صاحب آگئے ہیں نکاح شروع ہونے والا ہے۔"

اختر میاں اور اعظم صاحب اُن کے پیچھے چل پڑے۔ اعظم صاحب گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ وہ قدیر میاں پر نظریں جمائے اپنے آپ بڑبڑائے۔ "بے چارہ۔ مجبوری بھی کیسے کیسے کام کرواتی ہے۔" اور مترنم نگاہوں سے دولوں دولہا کو دیکھنے لگے۔ جن کے چہروں پر خوشی جگمگا رہی تھی ــــ ■

جن خریداروں کی سالانہ مدتِ خریداری ختم ہو چکی براہ کرم وہ خریداری کی تجدید فرمائیں۔ بصورت دیگر رسالہ کی اجرائی مسدود کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

محمد اکرام اللہ خان

فلمنامہ

ابھی گذشتہ مہینہ حیدرآباد میں ایک فلم ریلیز ہوئی تھی۔ "دنیا میری جیب میں" فلم تو کچھ ایسی خاص نہیں تھی لیکن فلم کے ساتھ ایک نیا ہدایت کار ابھر کر سامنے آیا ہے جس کا نام ہے۔ ٹینو آنند۔ ٹینو سے بہت دن پہلے مئی کے مہینہ میں ملاقات ہوئی تھی جبکہ وہ خواجہ احمد عباس کی فلم نکسلائیٹ میں کام کرنے کے لیے حیدرآباد آیا تھا دبلا پتلا، لمبا قد اور معمولی شکل و صورت کا یہ نوجوان جس نے فلمی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ ماں باپ کو اس کا فلموں میں آنا پسند تھا اسی لئے انھوں نے اسے ہوٹل بزنس کی ٹریننگ کروائی تھی لیکن طبیعت کو کیا کریں جب دیکھا کہ ٹینو سوائے فلم کے کسی اور موضوع میں دلچسپی ہی نہیں لے رہا ہے تو اسے کلکتہ ستیہ جیت رے کے پاس بھیج دیا گیا جہاں اس نے فلموں کے نشیب و فراز سے اچھی طرح ... واقفیت حاصل کرلی جس کے نتیجے میں بھی لوٹ کر اس نے فلم "دنیا میں میری جیب میں" بنا ڈالی۔ جو اس کی صلاحیتوں کو فلمی دنیا

منوانے میں بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ہاں تو ٹینو آنند سے ملاقات ہوئی تو عباس صاحب نے یہ کہہ کر ملوایا تھا کہ یہ ہے ٹینو آنند کمرشل فلموں کے ہونہار ڈائرکٹر ڈھیشوں، ڈھیشوں کی دو تین فلمیں بنا رہے ہیں، دیکھنا بہت نام کمائے گا۔ میں نے پوچھا یہاں کیوں آئے ہیں تو معلوم ہوا کہ نکسلائیٹ میں رکشہ والے کا رول انھیں بہت پسند آیا اور وہی رول ادا کرنے یہاں آئے ہیں۔ کیمرہ کے سامنے ٹینو کو دیکھا جس اعتماد سے وہ آتا اور اپنے مکالمے ادا کرتا اور کبھی کبھی کیمرہ مین سے پوچھ لیتا کہ یہ شاٹ کیسا آیا اور کبھی کبھی اسے بتا دیتا کہ کیمرہ یوں گھما کر اس مقام پہ یوں ختم کرو۔ اس کا کام ختم ہوگیا تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اس نے بتلایا کہ" دو بڑی فلمیں شروع کر رہا ہوں، امیتابھ بچن کو لے کر۔ شادی کرلی ہے۔ عباس صاحب کی وہ فلم جو سات ہندوستانی کے نام سے آئی تھی اور وہ لڑکی آپ کو یاد ہے نا۔ ہاں ہاں وہی جو جلال آغا کی بہن ہے۔ بالکل ٹھیک وہی میری شریک حیات ہے۔ بمبئی آئیے گا تو ضرور ملیئے گا۔ یوں تو کئی نئے نئے ہدایت کار ہماری فلموں میں آچکے ہیں لیکن ٹینو کی آمد کو غیر معمولی ہی سمجھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ ایک تو اسے اپنے والد اندراج آنند سے کہانی

اور سینریو کو سمجھنے کا موقع ملا ہے اور پھر اپنے ماموں جان (عباس صاحب) سے فلم کو بنانے کا تجربہ اور سب سے بڑھ کر ستیہ جیت کی ترتیب نے وہ ساری کمی پوری کردی ہے جو اسے بمبئی میں محسوس ہوئی تھی۔

★

محمد رفیع کو فلموں میں گاتے ہوئے تقریباً چالیس سال ہونے کو آئے ہیں انھوں نے اس عرصہ میں لگ بھگ ۲۶ ہزار گانے ریکارڈ کروائے ہیں ہر دور کے لوگوں نے انھیں آواز کا دیوتا مانا ہے۔ واقعی انکی آواز میں جو جادو اور کشش ہے وہ شاید ہی کبھی اور گانے والے کو نصیب ہو۔ شہرت کی اس بلندی پہ پہونچ کر بھی وہ نہیں جانتے کہ غرور اور تکبر کیا چیز ہے۔ ملنے میں وہی سادگی اور بات چیت ہی وہی دل لبھانے والا انداز۔ انکی شرافت کا ہر کوئی قائل ہے لوگ انھیں آسانی سے دھوکہ دیتے ہیں لیکن یہ کسی سے گلہ شکایت نہیں کرتے۔ وہ فن کار ہیں اور کوئی بھی فن کار بزنس مین نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے ان کے تمام کاروبار ان کے سالے ظہیر دیکھتے ہیں۔ بہت دن پہلے حیدرآباد میں انھوں نے اپنا فلم ڈسٹری بیوشن آفس کھولا تھا۔ گنگا جمنا، صاحب بی بی اور غلام اور کئی بڑی بڑی فلمیں خریدیں تھیں لیکن جن کیلئے اتنا بڑا آفس کھولا تھا وہ اسے چلا نہ سکے۔ غرض رفیع صاحب کو نہ نفع

کی خوشی ہوتی ہے اور نہ نقصان کا غم! وہ ایک پُرسکون سمندر کی طرح اپنی آواز کی لہروں سے ہلچل پیدا کرتے رہتے ہیں۔

گانے کے ذکر کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ گانے لکھنے والوں کے متعلق یاد آیا۔ نام نہیں بتلاؤں گا صرف واقعہ سنائے دیتا ہوں۔ ایک بہت مشہور گیت کار جن کا آج بھی بہت بڑا نام ہے ایک مشہور پروڈیوسر کے لیے گانے لکھ رہے تھے۔ پیسے پورے مل چکے تھے لیکن گیت پورے لکھے نہیں گئے تھے چنانچہ پروڈیوسر صاحب نے انھیں اطلاع دی کہ کل گانے کی ریکارڈنگ طے ہو چکی ہے اسٹوڈیو بک ہو چکا ہے لتا اور رفیع سے وقت لیا جا چکا ہے لہذا گانا فوری بھجوا دیا جائے۔ حسب معمول انھوں نے کہا کہ گانا وقت پر آپ کو مل جائے گا۔ دوسرے دن صبح صبح پروڈیوسر نے گیت کار کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ موصوف کل شام کو مدراس چلے گئے ہیں۔ پروڈیوسر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مدراس میں ہر ہوٹل سے معلوم کیا گیا اور آخرکار پروڈیوسر ایک جگہ ربط پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن انھوں نے بڑی ہی معصومیت سے اپنے مدراس فوری آنے کا ذکر کیا لیکن گانا وقت پر نہ لکھنے کے تعلق سے کوئی افسوس کا اظہار بھی نہیں کیا۔ پروڈیوسر نے کہا کہ میرا تو ہارٹ فیل ہو جائے گا اگر آج گانا ریکارڈ نہ ہوا"

اس پر انھوں نے اطمینان سے کہا کہ اگر فون پر آدھے گھنٹے کے بعد وہ گانا لکھوا دیں گے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آدھے گھنٹے تک بے چارہ پروڈیوسر سگریٹ کے دھوئیں میں گھٹتا ہوا فون سے لگا بیٹھا رہا خدا خدا کر کے فون کی گھنٹی بجی اور گیت لکھوایا گیا آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ یہ گیت ۔۷۷ کا بہترین گیت مانا گیا اور اس کو نہ صرف غیر معمولی قبولیت نصیب ہوئی بلکہ کئی اوارڈ بھی ملے ■

٭ بھاگ دوڑ کے بعد گاؤں کے باہر اسے جا لیتا ہے۔ یہاں مارپیٹ کے دوران ہیرو کو عین دل کے مقام پر گولی لگتی ہے خطرناک طور پر زخمی ہونے کے باوجود ہیرو وہی طول طویل فاصلہ اپنے آپ کو گھسیٹتے گھسیٹتے منٹوں میں طے کر لیتا ہے اور واپس نوری کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ چونکہ فلم میں دلچسپیاں اس کی کمزوریوں سے زیادہ ہیں۔ اس لئے کمزوریوں کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے

بقیہ: فلمی تبصرہ

مذہب معاشی اونچ نیچ وغیرہ دیوار نہیں بنتے۔ منجھے ہوئے کیریکٹر ایکٹر افتخار اور مدن پوری نے اپنے کرداروں [illegible] بھی ہیں مظہر [illegible] نے معصوم حسن اور اداکارانہ صلاحیتوں سے ہندوستانی فلموں میں مستقل مقام بنا لیا ہے۔ فاروق شیخ کی یہ دوسری فلم ہے اور وہ اپنی پہلی فلم "گمن" ہی سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکا ہے۔ بہترین کردار نگاری، اداکاری، مکالموں، موسیقی اور دلنواز منظر نگاری نے اس فلم کو مقبول ترین فلم بنا دیا ہے۔ اس سے ہٹ کر فلم میں کئی کمزوریاں بھی ہیں جن پر توجہ نہیں کی گئی جیسے نوری کا باپ، اپنے ہی چھوٹے سے گاؤں میں بچپن سے رہنے والے نوجوان یوسف کو نہیں جانتا جو اسی گاؤں کے ایک کارخانے میں کام بھی کرتا ہے اور نوری سے بچپن ہی سے ملتا جلتا ہے اور پیار کرتا ہے۔ پیار کی اس کہانی کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے جہاں نوری اپنی آبروریزی کے صدمے سے خودکشی کر لیتی ہے اس طرح ایک رومانٹک کہانی کا تاثر بھی برقرار رہتا۔ انتقام کی آگ میں جلنا، مارا ماری کرنا اور دشمن کی جان لینا کسی ایکشن فلم کے ہیرو کا وطیرہ تو ہو سکتا ہے۔ کسی سچے عاشق کا نہیں۔ فلم کے آخر میں جب ہیرو کو پتہ چلتا ہے کہ نوری کی موت کا ذمہ دار بشیر خان ہے تو وہ جیپ میں فرار ہوتے ہوئے بشیر خان کا پیچھا کرتا ہے اور کافی دیر

بشیر انور

(فلمی تبصرہ)

ہندوستانی فلموں کے بدلتے ہوئے رجحان کے اس دور میں جبکہ مار دھاڑ، ایکشن، سسپنس، بھرے بھرے جسموں کی نمائش ریپ سین، ملٹی اسٹار کاسٹ وغیرہ کو کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے، معمولی کاسٹ اور کم بجٹ والی فلم "نوری" کی بے پناہ کامیابی ایک حیرت انگیز بات ہے۔ گو مار دھاڑ اور ریپ سین نوری میں بھی موجود ہیں لیکن ان سے بڑھ کر بھی اس فلم کی بہت سی دوسری خصوصیات ہیں جو اس کی کامیابی کا موجب ہیں ورنہ آج کے حالات میں لیلیٰ مجنوں قسم کے کلاسیکل عشق پر مبنی کوئی فلم بنانا جس میں ہیرو ہیروئین دونوں کی موت واقع ہوتی ہو بڑے جوکھم والی بات ہوتی ہے۔ وہ تو دلیپ کمار کا دور تھا جس میں محض دلیپ کمار کی خاطر تماشائی ٹریجڈی فلمیں دیکھنا گوارا کرتے تھے۔ حالیہ دور میں "مقدر کا سکندر" ہی ایک ایسی فلم ہے جس میں ہیرو کے مر جانے کے باوجود فلم کامیابی سے ہم کنار ہوئی ہے۔

نوری نہ کوئی آرٹ فلم ہے نہ جاسوسی اور نہ سیکس فلم۔ اس میں بھیانک مسالہ بھی زیادہ نہیں بھرا گیا ہے اور نہ ناچ گانوں کی بھرمار کی گئی ہے۔ فلم نوری دو معصوم دھڑکتے دلوں کی چاہت کی رومانی کہانی پر مبنی ہے۔

نوری (پونم ڈھلون) حسین کشمیر کے کسی حسین گاؤں کے ایک غریب لکڑہارے (افتخار) کی حسین بیٹی ہے۔ جس کے حسین گالوں پر گلاب کھلتے ہیں۔ جس کی مستانہ چال پر زمین و آسمان بھی چلنے لگتے ہیں۔ جب وہ مسکراتی ہے تو بہاریں جھومنے لگتی ہیں۔ جب وہ بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں اور کانوں میں گھنگروؤں کی نقرئی جھنجھناہٹ محسوس ہونے لگتی ہے اس معصوم اور الھڑ دوشیزہ کا پورے گاؤں میں اس کے غریب باپ اور وفادار کتے خیرو کے علاوہ اور کوئی نہیں البتہ اس پر لگی بھوکی اور للچائی نظریں بے شمار ہیں۔ ہاں ایک خوبرو نوجوان یوسف (فاروق شیخ) بھی ہے جس سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتی ہے اور جس سے اس کی شادی بھی طے ہو جاتی ہے۔ نوری پر لگی بھوکی نظروں میں گاؤں کے ایک کارخانے دار بشیر خاں کی نظریں بھی شامل ہیں جو کسی مست سانڈ کی طرح گاؤں کی ہر نوخیز کلی پر منہ مارنا ضروری سمجھتا ہے جب نوری سیدھے طریقے سے بشیر خاں کے ہاتھ نہیں لگتی تو وہ سازش کر کے نوری کے باپ کو مروا ڈالتا ہے۔ یوسف کو رقم وصول کر کے لانے کیلئے گاؤں سے باہر جانے کے لئے مجبور کرتا ہے اور پھر بے سہارا نوری کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ غیور اور معصوم نوری اس صدمے کی تاب نہ لا کر دریا میں کود کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ یوسف کو گاؤں لوٹنے پر جب اس سانحے کا علم ہوتا ہے تو وہ انتقام کی آگ میں جلنے لگتا ہے اور خیرو کتے کی مدد سے بشیر خاں کی جان لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس مارا ماری میں وہ خود بھی بشیر خاں کے پستول کی گولی سے زخمی ہو جاتا ہے۔ اور مجنوں کے انداز میں گھسیٹ گھسیٹ کر نوری کی لاش تک پہنچتا ہے اور اس سے لپٹ کر دم توڑ دیتا ہے۔

یش چوپڑہ کی اس فلم کی ہدایت کاری کے لئے مشہور کیریکٹر ایکٹر من موہن کرشن کا نام دیا گیا ہے۔ کہانی، اسکرین پلے اور مکالموں کی ذمہ داری ساگر سرحدی نے لی ہے اور فلم کی کامیابی کے لئے وہ بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ خیام کی موسیقی گوارا ہے اور ان کے صرف ایک ہی گانے نے جو ٹائیٹل گیت بھی ہے فلم کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ گیت مجروح اور نقش لائلپوری نے لکھے ہیں۔ نوری اور یوسف کے مرکزی کرداروں کے علاوہ فلم میں دو اور متاثر کن کردار بھی ہیں۔ جو انتخابہ اور مدن پوری نے ادا کئے ہیں۔ یہ کردار اگلے وقتوں کی مثالی دوستی، خود داری اور شرافت کے آئینہ دار ہیں۔ جن کے درمیان

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

کی فلم "لوک پرلوک" میں وہ "یمراج"

یعنی موت کے فرشتہ کا رول ادا کر رہا

ہے۔ فلم "ودیشی" میں پریم ناتھ اپنے

لڑکے پریم کشن کے ساتھ آ رہا ہے

عام طور پر تماشائی یہ سمجھتے ہیں کہ

باپ بیٹے پہلی بار اس فلم میں آ رہے ہیں

لیکن پریم کشن کو پہلی بار فلمی کیمرے کے

سامنے اس وقت آنا پڑا جب اس کی عمر

صرف (۵) گھنٹے کی تھی۔ فلم تھی "گولکنڈہ

کا قیدی" جس کا ہیرو پریم ناتھ تھا۔

اس کے بعد "جان حاضر ہے" میں بھی

پریم کشن نے پریم ناتھ کے ساتھ کام

کیا ہے

★

بمبئی کے منصف جسٹس ایم۔ ایل

پانڈے نے بمبئی کے ایک تھیٹر "اپسرا"

کے مالکین کو بلیک ٹکٹوں کی فروخت کے

الزام میں چالیس ہزار روپے کا جرمانہ کیا

لیکن عدالت نے جرمانے کے ساتھ ساتھ

یہ حکم بھی صادر کیا کہ جرمانے کی یہ رقم

"موروی کے ریلیف فنڈ" میں دی جائے۔

★

شریمتی اندرا گاندھی نے پچھلے

دنوں بمبئی میں ایک دلچسپ انکشاف کیا

کہ دلی میں جس دن "شاہ کمیشن" میں

ان کے خلاف مقدمے کی سماعت ہوتی تو

اس دن دلی کے سینما گھروں میں تماشائیوں

کی تعداد بے حد کم ہوا کرتی۔ اس کا مطلب

یہ ہوا کہ "شاہ کمیشن" کی کارروائی عوام

کے لئے ہماری فلموں سے کہیں زیادہ دلچسپ

رہی ہے۔

★

لندن میں ان دنوں سینما گھروں

کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس سے آپ یہ

اندازہ مت لگائیے کہ لندن کے باشندے

فلمیں زیادہ دیکھنے لگے ہیں بلکہ حقیقت

بالکل برعکس ہے۔ فلموں کے تماشائیوں کی

تعداد کم ہونے کی وجہ سے اب لندن میں

ایک سینما گھر کو دو سینما گھروں میں تبدیل

کیا جا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ فلمیں

نمائش کے لئے پیش کی جا سکیں اور

اس طرح تماشائیوں کی دلچسپی برقرار

رہے ■

With the best compliments from

Phone : Off. 39-Res. 93
Grams : 'LARKSON'

L. ABDUR RAHMAN KHAN & SONS.

MINE OWNERS

Dealers in : High Grade Lime, High Grade Lime Stone, Hydrated Lime Powder, Calcium Carbonate Powder, Soap Stone Powder, Barytes Powder, Clay Powder & Whiteshale Etc.

P. O. DHONE, KURNOOL DIST. (A. P.)

with the best compliments from :

Grams : 'LARK'

Phone Off. 39 - Res. 93

LARK MINERAL INDUSTRIES

P. O. DHONE, KURNOOL DIST.
Andhra Pradesh

Formulators of : B.H.C. 10% Dust Powder
D. D. T. 10% Dust Powder

قیمت: 1-25

نومبر 1979

Registered with the Registrar of Newspaper-Registered No. 8285/64

Phone : 5295

POONAM URDU MONTHLY

Azampura, Hyderabad-500 024

Editor : Nasir Kurnooli, M A.

قیمت: 1-25
نومبر 1979

اشاعت کا پندرھواں سال

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد (۱۵)

شمارہ (۱۱)

نومبر ۱۹۷۹ء

زر سالانہ ۱۵ روپے

ادارے کیلئے ۲۰ روپے

پونم

خط و کتابت کا پتہ

منیجر ماہ نامہ "پونم"

16-7-300/1

اعظم پورہ، حیدرآباد 24

ترتیب

مطبوعہ:- دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد

ماہنامہ **پونم** کا

خاص نمبر

آندھرا پردیش کے منتخب افسانہ نگاروں کی
پسندیدہ تخلیقات

• فوٹو آفسیٹ تصاویر

★ حالاتِ زندگی اور دیگر رنگا رنگ دلچسپیاں

؟؟؟ خوبصورت گٹ اپ ★ رنگین سرورق

سالِ نو کے اس خوبصورت تحفے سے
متعلق
• صفحات • قیمت اور دیگر
تفصیلات
ڈسمبر کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

جن افسانہ نگاروں نے اب تک اپنے فوٹو روانہ نہیں فرمائیں ہیں وہ بعجلت ممکنہ پاسپورٹ سائز فوٹو روانہ فرمادیں۔ (ادارہ)

انٹرویو

از صفیہ ملک

پروین شاکر سے ملاقات

(حال ہی میں پروین شاکر کو انکے مجموعۂ کلام "خوشبو" پر ۱۹۷۶ء کا عظیم "آدم جی" ایوارڈ بھی مل چکا ہے)
(ادارہ)

میرا شہر، وسیع البلاد کراچی جس کی مشینی زندگی کے، جس کی بے مہریوں کے لوگ شاکی رہتے ہیں لیکن پھر بھی امڈے چلے آتے ہیں۔ اس "دلہن" کے ماتھے پر ایک اور چاند "خوشبو" کی صورت میں چمکا اور اس کے سحر کا ایک زمانہ اسیر ہوگیا۔

شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ اس کی پذیرائی کو اس کی "رونمائی" کو خلعتِ شہر میں عزیز تر چہروں کا بھی جم غفیر تھا۔

جب لوگ "خوشبو" کے حوالے سے اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ میں نے ان پر کان دھرنے سے زیادہ خود اسے سمجھنے کے لیے ورق الٹنے شروع کر دیئے۔ جانے کتنا وقت گزرا۔ ایک کومل، کومل سی لڑکی کی تصویر ابھرتی رہی — پھر میرا دھیان بٹا۔

یادوں کے نگار خانے میں ایک آواز ابھری۔

ایک آواز، ایک شخصیت،

ایک فنکار — جس کا فن امر ہوگیا ہے جب صرف آواز کا رشتہ تھا تو آواز کی لہر میں ایک شہزادے کی شبیہ اترتی تھی — اور جب صوتی اور بصری واسطے ٹی وی نے اس آواز کے شاہزادے کا سراپا دکھایا تو شاہزادہ شہنشاہوں کے سے وقار اور جلال سے مالامال ملا — یہ آواز اور روپ کا انوکھا ملاپ استاد امانت علی خاں کا تھا۔

سر، تال اور گائیکی کے مزاج کی بات کرنے کی اہل نہیں، میں تو اتنا جانتی ہوں کہ خدا نے استاد امانت علی خاں کے گلے میں نور اتارا تھا جبھی تو وہ دلوں کو کھینچ لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

آواز کا بانکپن جس شہزادے کی تصویر کھینچتا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجاہت کہانیوں کے شاہوں کی سی تھی۔ آواز اور شخصیت کا اتنا سچا رشتہ مجھے اس فنکار کے بعد اب کسی میں نہیں ملتا اور اب یہ عالم ہے کہ جب بھی استاد امانت علی خاں کی آواز کانوں میں پڑتی ہے تو نگاہوں میں تصویر پھر جاتی ہے۔ شاعر کے درد کو چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ادا کرتے کرتے جن کی خوب صورت آنکھیں درد کی تصویر بن جاتیں۔

بارہا ایسا ہوا کہ کسی خوب صورت غزل کو پڑھتے پڑھتے میرا جی چاہا اگر اسے امانت علی خاں کا لحن مل جائے تو کیا ہے۔

لیکن!

"خوشبو" کی ورق گردانی کرتے ہوئے جی چاہا کہ کوئی خوش گلو نازک اندام خاتون ہی اس کی غزلیں گنگنائے تو بہتر ہے — کیوں؟ — اس کا جواب ذرا تفصیل چاہتا ہے جس کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے — لیکن سنیئے۔

"خوشبو" کی شاعرہ پروین شاکر "دریچۂ گل" سے یوں مخاطب ہے۔

"برس بیتے — گجرات کے کسی شہر سے ہوئے سناٹے میں اس نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے — (کچی عمروں کی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ آشوبِ آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پر آج تک نہیں اترا) اور اسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہرِ ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا ہے۔

آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی ہیں — ایسا نہیں ہے کہ اس نے اپنے عکس کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ کی! بہت کی

ین میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی
نگلیاں لہولہان ہوگئیں۔

"خوشبو" اسی سفر کی کہانی ہے۔
مران آنکھوں، شبنمیں رخساروں اور
ر اس مسکراہٹ والی اس لڑکی کو اعتراف
ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے (اور یہ کیا دنیا
ں کوئی کہانی نئی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے اندر
کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سندر بنا دیتا
ہے کہ سنسار کا من موہ لے۔"

آگے چل کر یہ کومل سی لڑکی بڑی سچائی
سے رقم کرتی ہے ؎

تمام رات مرے گھر کا ایک در کھلا رہا
ہمارا راہ دیکھتی ہی وہ راستہ بدل گیا

پھر بے ساختہ کہتی ہے ؎

دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے آج، کدھر بھول پڑے وہ

اور سادگی تو دیکھئے ؎

حال پوچھا تھا اُس نے ابھی
اور آنسو رواں ہو گئے

حالِ دل کہتے کہتے جب جلا دصفت
نقادوں سے سابقہ پڑا تو بڑے الہڑ پن
سے کہنے لگی۔

"مگر — دیکھئے نا — ابھی میرا
فن کچی عمروں میں ہے (آپ اسے خواب ہی
دیکھنے دیجئے"۔

اتنی گمبھیر دانشوری۔ شبانہ الجھائیے)
میں نہیں چاہتی — کہ میرا فن جوان
ہونے سے قبل بوڑھا ہو جائے اور فلسفے

کا عصا لے کے چلنے لگے۔
(نظم — تنقید اور فن)

اور "خوشبو" جس لڑکی کی تصویر کشی
کرتی ہے وہ پروین ہی ہے۔ اس بات
کا پتہ تو چند سرسری ملاقاتوں میں ہی چل گیا
تھا لیکن اپنی کھوج میں کہاں تک کامیاب
ہوں۔ کچھ اسے پرکھنے اور کچھ اپنے طور پہ
پہچاننے۔ قارئین کو پروین شاکر سے متعارف
کروانے کے لیے ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔
ملاقات شام کو ہونے والی تھی لیکن لوگوں
سے باتیں کرتے — دفتر میں — سفر کے
دوران۔ دماغ کا ایک گوشہ پروین کے بارے
میں سوچ رہا تھا شاید اس کیفیت کو اس
شعر میں ادا کیا گیا ہے ؎

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

بارے شام ہوئی۔ پروین کے گھر
جانا ہوا۔ ڈرائنگ روم میں پہونچ کر پہلا
خیال یہی آیا کہ جمن ذہن میں اگر خیال کے
پھول سجائے جا سکتے ہیں تو ڈرائنگ روم
کو مصنوعی پھولوں سے گلزار کیا جا سکتا
ہے لیکن خاتونِ خانہ کا با ذوق اور سلیقہ
مند ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے کہ اپنی اور پروین
کی گفتگو کا احاطہ پیش کروں، آپ چند
موٹی موٹی باتیں جان لیں کہ تشنگی نہ رہے۔

پروین شاکر نے کراچی میں جنم لیا۔
طالب علمی کے زمانے سے ہی مقامی اخبارات
اور کالج میگزین میں مضامین لکھے۔ پھر اپنی
ایک استاد عرفانہ عزیز صاحبہ کے مشورے
پر ۱۹۶۶ء میں جنگِ ستمبر ۶۵ء پر ایک یادگار
مشاعرے میں ایک نظم کہی۔ اور یوں رفتہ رفتہ
"فنون" میں چھپنے کے بعد پاک و ہند کے تمام
معتبر رسائل میں چھپنے لگیں۔

تعلیمی مدارج :۔ سرسید کالج سے انٹر کیا
پھر کراچی یونیورسٹی میں بی اے آنرز میں داخلہ
لیا پھر ایم اے انگلش کے بعد جامعہ کو خدا حافظ
کہا۔

تدریس :۔ مارچ ۷۳ء سے عبداللہ
کالج میں انگریزی کی استاد ہیں۔

گھریلو زندگی :۔ ڈاکٹر نصیر علی سے شادی
ہوئی، جو علاوہ ادبی بھی ہیں۔

"آپ نے اپنے مجموعے کا نام "خوشبو"
رکھا ہے۔ اس کا پس منظر تو بتائیں؟"

"بس اچانک ہی عنوان ذہن میں آگیا تھا
ہوا در اصل یہ کہ کتاب طباعت کے مرحلے سے
گزر رہی تھی لیکن عنوان ابھی تک نہیں رکھا گیا
تھا۔ ایک دن ہم اور عمو (احمد ندیم قاسمی)
ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے
کہ میرے ذہن میں آیا — میں نے عمو سے
کہا — "اگر کتاب کا عنوان "خوشبو" رکھ
لیں تو کیسا رہے؟" — انہوں نے کچھ دیر سوچا
اور پھر کہا۔ "ٹھیک ہے"۔ اور یوں عنوان طے
ہو گیا۔"

"کیا کبھی اپنے کلام پہ کسی سے اصلاح لی؟"

اصلاح اس معنی میں تو نہیں لی کہ جس طرح زمانہ کا روز مرہ ورک دکھایا جاتا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو جب کچھ چیزیں جمع ہو جاتیں تو میں عرفانہ عزیز کو جا کر سناتی جو میری براہ راست استاد تو نہیں تھیں لیکن ان کے ہی مشورہ پر میں نے شاعری شروع کی تھی ۔ اور پھر اگر وہ ضرورت محسوس کرتیں تو تبدیلی کر دیتیں ورنہ چلو کچھ عرصے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا"۔

"آپ کے خیال میں ابتدا میں حوصلہ افزائی کی کیا اہمیت ہے ؟"

"بہت اہمیت ہے ۔ ساری بات حوصلہ افزائی اور انسپائریشن کی ہے ورنہ کچھ نہیں بنتا ہے"۔

"آپ کو شعر کہنے کے لیے کس قسم کی فضا کی ضرورت ہوتی ہے ؟"

"مجھے صرف سکون اور تنہائی درکار ہے"۔

"لیکن آج کی زندگی تو اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ انسان کو ہر وقت سکون اور تنہائی میسر نہیں ہوتی"۔

"ہوتا یوں ہے کہ کوئی چیز کوئی بات یا کوئی آواز ذہن میں اٹک کر رہ جاتی ہے پھر وہ چیز ذہن میں پکتی رہتی ہے اور جب مزاج کے مطابق ماحول ملتا ہے تو یہ اظہار کا لمحہ ہوتا ہے اور شعر ہو جاتا ہے"۔

"سچ کہیے اس وقت تو موڈ نہیں ہو رہا ہے شاعری کا"۔

پروین میرے اندیشے پر بے اختیار ہنس دیتی ہیں ۔ مجھے اطمینان ہو جاتا ہے ۔ کاغذ اور قلم پر گرفت مضبوط ہو جاتی ہے ۔

"اپنے شہر میں اتنے خوش رنگ پھول تو نہیں جتنے آپ کی شاعری میں ہیں"۔

"بھئی ہم رپورٹ تو نہیں کرتے سارے موسم اپنے باطن سے پھوٹتے ہیں یہ تو اندر کی خوشی ہے ۔ شاعر کے اندر اپنا ایک شہر ہوتا ہے ۔ وہ بتاتا ہے کہ موسم کیسا ہے ۔ اور میری شاعری میں پھول ، تتلیاں ، موسم یہ سب سمبل ہیں ۔ ان کی اپنی سمبالک ویلیوز ہیں"۔

"ٹھیک ! لیکن یہ بتائیں تتلی کو دیکھ کر آپ کے ذہن میں کیا تاثر آتا ہے"۔

"ایک چھوٹی سی چیز جو خوبصورتی اور نزاکت کا ایک سمبل ہے ۔ اس میں مجھے لڑکیوں کی جھلک نظر آتی ہے"۔

"لڑکیاں جب شعر کہتی ہیں تو ایک جھجک سی اپنا ئے رکھتی ہیں آپ کے یہاں اظہار کی بے باکی کیوں نکھر آتی ہے ؟"

میرا سوال سن کر پروین پہلو بدلتی ہیں ۔ پھر بڑے پُر اعتماد انداز میں کہتی ہیں ۔

"میں اسٹوڈنٹ ہوں لٹریچر کی ۔ یہ جانتی ہوں کہ جب اظہار پر قید باندھ دی جاتی تو شاعری نہیں ہوتی ہے اس پر جب تک جھجک دور نہ ہو گی کچھ نہ جائے گا ۔ اور جہاں تک اظہار کی بات ہے تو میرا کام تو فہمیدہ ریاض نے بہت آسان کر دیا ہے ۔ راہ کے پتھر تو اس نے سمیٹے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے کردار میرے پیرایۂ اظہار میں فرق ہے"۔

"جدید نثری نظم اور آزاد نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟"

"نثری نظم کے مستقبل کے بارے میں تو میں مشکوک ہوں اس میں اب تک توانائی نظر نہیں آئی ہے ۔ ابھی تو بار توڑنے کی ہو رہی ہے ۔ شاید کوئی بڑا شاعر اسے مل جائے تو کچھ ہو سکے ۔ ہاں آزاد نظم پھل پھول رہی ہے اس میں کشور ناہید سب سے پاور فل ہیں"۔

"شاعری کی تعریف ؟"

پروین پہلے تو سوال کی تعریف میں پھر کہتی ہیں "خواہش اور حقیقت کے درمیان جو کچھ ہے ..... وہ شاعری ہے"۔

ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ اپنی بات کی وضاحت کرتی ہیں ۔

"یوں سمجھیے کہ زندگی جیسی آپ کو نظر آتی ہے یہ تو حقیقت ہے ۔ دوسرے یہ آپ زندگی کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں آپ کا خواب ہے ۔ اور ان کے درمیان

ہے وہ شاعری ملی ہے؟

"کہا جاتا ہے خوبصورت شعر کو سمجھنے کے لیے ایک خاص ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کی معاشرہ میں کمی ہے۔ پھر آپ بتلائیے کہ آپ کی شاعری کس طبقہ کے لیے ہے؟"

"کسی بھی طبقے کے لیے نہیں — ہاں! میری شاعری کو سمجھنے کے لیے تھوڑا سا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس میں تمثیل تمام دنیا کے ادب سے لیے گئے ہیں جس سے جب تک قاری کو پس منظر ہی معلوم نہ ہو تو وہ صحیح طور پر میرے اشعار سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ نے شاعری میں روایات سے کہاں کہاں انحراف کیا ہے؟"

"جہاں جہاں سچ بولا ہے — لیکن یہ حقیقت ہے کہ روایت سے بالکل کٹ کر کوئی بڑی شاعری نہیں کر سکتا ہے۔ نہ خواہ مخواہ روایات کو توڑنا چاہیے۔ نہ صرف روایات کو ہی دیکھنا ہے کیونکہ صرف روایات نہیں بلکہ تجربہ شعر کے سفر کو بڑھاتا ہے اس لیے جہاں جہاں ضروری سمجھا انحراف کیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی اور پیرایہ کے اعتبار سے بھی۔"

"کہتے ہیں شاعری کے لیے عشق لازمی ہے"

"عشق ایک آدمی سے مراد بہت محدود ہے۔ عشق تو انسان کی تہذیب کرتا ہے۔ یہ تو ابتدا ہے اپنے آپ کو سمجھنے کی اور جب انسان اپنے آپ کو سمجھ لیتا ہے تو اس میں ایک تبدیلی آ جاتی ہے اور یہ تبدیلی بڑی چیز ہے۔ جب انسان کو پتہ چل جاتا ہے کہ چاہنا اور چاہے جانا کتنی بڑی بات ہے پھر وہ مہذب ہو جاتا ہے — انسان کو تحمل اور قوت برداشت کا سبق عشق ہی سکھاتا ہے پھر آپ صرف ایک آدمی سے محبت نہیں کرتی ہیں، ساری کائنات اس دائرے میں آ جاتی ہے اور یہ شاعری میں کام آتی ہیں اور شاعر جتنا حساس ہو گا چیزوں کو اتنی ہی شدت سے محسوس کرے گا اور اتنی ہی آسانی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکے گا"

"عشق اور محبت میں فرق؟"

"محبت جب تقاضائے جسم و جان سے ماورا ہو جاتی ہے تو الہام بن جاتی ہے۔ عشق کو مرتبہ حاصل ہے۔ لفظ عشق میں مذہبی رنگ ہے، عشق صوفیوں کا بھی تھا۔ شعری شاعری ہمارے صوفیائے کرام نے بھی کی ہے۔ یہ تو اپنے اپنے محسوس کرنے کی بات ہے۔ آپ چاہیں جو اسے نام دے لیں۔ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو بات وہی رہے گی۔"

"جو شاعر جیسے ہے شاعر نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

پروین زیر لب مسکراتے ہوئے کہتی ہیں

"احمقانہ حرکت ہے۔ شعر سے شاعر بڑا لگے تو زیادہ اچھی بات ہے"

"ابتدا میں کیا آپ کو اندازہ تھا کہ اتنی شہرت حاصل کریں گی؟"

"نہیں اتنی شہرت کا یقین نہیں تھا۔"

"اپنی شہرت سے محظوظ ہوتی ہیں؟"

نہیں بھئی — بلکہ پرائیویسی ختم ہو گئی ہے۔ آزادی سے گھومنا پھرنا مشکل ہو گیا ہے دوکاندار سے جھگڑ نہیں سکتے کیونکہ لوگ پہچان لیتے ہیں۔"

اور ایک سوال کے جواب میں بطور استاد پروین کہتی ہیں۔

"ہمیں اردو کے بارے میں کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اردو یقیناً انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے لیکن انگریزی کو سیکنڈ لینگویج کے طور پر ضرور رہنا چاہیے کیونکہ رابطے کی مشترکہ زبان بہت ضروری ہے دنیا سمٹتی جا رہی ہے اور ہمیں یورپی اقوام سے بھی معاملات کرنے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اردو ابھی عالمی پیمانے پر سمجھی جانے والی زبان نہیں ہو سکی ہے اس لیے انگریزی کی لازمی تعلیم رہنی چاہیے۔ لیکن قومی زبان کو دفتروں میں رائج کرنے کے لیے تدریجاً درجہ بدرجہ اور آہستہ آہستہ لانی چاہیے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"آپ کو عورت کا کونسا روپ سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"ماں کا روپ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے اپنی والدہ بہت اچھی لگتی ہیں۔"

ہم نے بعض اوقات مردوں کو محفل میں

جو تجزیہ ہوتے دیکھا ہے۔ جب اُن کا تعارف یوں کرایا جاتا ہے۔ بیگم فلاں یا مسز فلاں کے شوہر۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک سوال اُبھرا۔

"جب آپ کے شوہر کو آپ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے تو ان کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے؟"

"نصیر میرے فرسٹ کزن ہیں اس لیے اُن کو سب پتہ تھا اس وجہ سے ایسی باتیں کبھی پریشانی کا باعث نہیں بنتی ہیں۔ انھوں نے تو جہاں لکھنے جیسی ہے کی [illegible] پسند کا فیصلہ کروایا تھا"

آپ کے شوہر مشاعروں میں رات گئے تک آپ کی شمولیت پر معترض تو نہیں ہوتے؟

"نہیں اسے کیونکہ انھیں میرا سارا پروگرام معلوم ہوتا ہے پھر دوسرے شہروں میں جو مشاعرے ہوتے ہیں اُن میں [illegible] تو بہت کم گئی ہوں اور جب بھی گئی ہوں تو نصیر ساتھ ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہی ہم دونوں میں یہ طے ہو گیا تھا کہ شاعری میرا ذاتی مسئلہ رہے گا۔ اور وہ اس کا احترام کرتے ہیں۔"

"شوہر کی پسندیدہ عادت؟"

"زیادہ دیر تک خفا نہیں رہ سکتے ہیں۔ بہت سے بہت ایک دن خفا رہتے ہیں کیونکہ اُن کا دل ہی نہیں لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صبح اُٹھتے ساتھ نہ جھگڑا کرو ورنہ میں دن بھر بہت پریشان رہتا ہوں۔"

"ناپسندیدہ عادت؟"

"بہت جذباتی ہیں اور اس وجہ سے مجھے بہت دیر لگتی ہے سمجھانے میں۔ لیکن اب تو برداشت آ گئی ہے۔ [illegible] بالکل نہیں تھی۔"

"اور آپ کی کونسی عادت ہے جو ڈاکٹر صاحب کو بہت ناپسند ہے؟"

"[illegible] بات بے غیر [illegible] کہ وہ کیا چاہتے ہیں"

"کیا کبھی ایسا ہوا کہ کسی محفل میں خوب صورت مرد کو آپ کی طرف متوجہ دیکھ کر غصہ آ گیا ہو؟"

"فطری بات ہے غصہ آ جاتا۔ لیکن اب کیا کروں نہ لڑکی بھی ہوں شدید [illegible] اور بدصورت بھی نہیں ہوں اس لیے اب تو عادی ہو گئے ہیں۔"

"آپ کی تین حیثیتیں ہمارے سامنے ہیں۔ شاعرہ، معلمہ اور بیوی۔ آپ کے اندر جو فن کار ہے وہ آپ کو دوسری حیثیتوں سے متصادم تو نہیں ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے لیکن پھر میں سمجھا لیتی ہوں۔ سمجھوتہ کر لیتی ہوں کہ اسی میں گھر کی بہتری ہے۔"

"ایک پروین بیوی ہے۔ ایک معلمہ ہے اور ایک شاعرہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے۔ کیا کوئی ایسی بھی پروین ہے جو لوگوں سے مخفی ہے۔ پوچھنا یہ ہے اصل پروین کون سی ہے؟"

"ہر جگہ انسان کا رویہ بدل جاتا ہے اس کے مطابق لہجہ بدل جاتا ہے لیکن "خوشبو" میں اصل پروین ہے۔"

"یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ بعض پبلشر خواتین کے ناموں سے مردوں سے لکھواتے ہیں جس کی وجہ سے دیگر خواتین بھی مشکوک سمجھی جاتی ہیں کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے پوچھا ہو کہ کس سے لکھوائی ہے یہ غزل؟"

"شروع میں تو یہی ہوا لیکن جب دو تین بار ایسے واقعات ہوئے کہ مجھے اچانک فی البدیہہ کہنے کے لیے کہا گیا اور میں نے ہمت کر کے نظم یا غزل جس کی بھی فرمائش کی گئی تھی مکمل کر دی تب لوگوں کو یقین آ گیا۔ لیکن جب طالب علمی کا دور ختم ہوا اور میں توجہ سے "فنون" میں لکھنے لگی تو لوگ خود بخود ماننے لگے۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ تخلیق کار کو اپنی ہر تخلیق عزیز ہوتی ہے لیکن آپ ہمیں کوئی ایسی غزل بتائیے جو آپ کو کسی خصوصیت کی بنا پر بہت پسند ہو؟"

"ہاں۔ وہ غزل ہے جس کا ایک شعر ہے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

یہ شعر یہ غزل میری شاعری کا ٹرننگ پوائنٹ ہے اس کے بعد میری شاعری کا لہجہ بدلتا ہے۔ یہ وہ غزل ہے جو غالب کی زمین میں ہے۔ ایک تو غالب کی زمین میں لکھنا ہی بڑی بات ہے پھر جب غزل لکھ لی تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک ایک شعر نئے رنگ کا ہے اور یہ غزل جس مشاعرے میں میں نے پڑھی [illegible]

میری زندگی کا پہلا کل پاکستان مشاعرہ تھا۔ جو
حضرت امیر خسروؒ کے جشن صد سالہ کے سلسلے
میں منعقد ہوا تھا۔"
اتحاد میری گفتگو میں یہ پہلا موقع
تھا کہ پروین نے کوئی شعر سنایا تھا۔
اب میں نے سوال کیا۔
"جب آپ کوئی شعر کہتی ہیں تو
آپ کو بھی بعض شاعروں کی طرح سامع کی
تلاش ہوتی ہے؟"
"ہرگز نہیں ۔۔ کیونکہ عام طور پہ
ایسا ہوتا ہے کہ جب کچھ لکھا تو مطمئن ہو گئے
کہ لکھ لیا پھر کسی کو چھپنے کے لیے بھیج دیا۔
اور جب اُن لوگوں کی رائے پہنچی تب
اطمینان ہو گیا کہ بات پہنچ گئی ہے اتنے
لوگوں تک ۔ میرا تو یہ عالم ہے کہ مجھے
غصہ آجاتا ہے جب لوگ عام محفلوں میں ہم
سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔
میری چند قریبی دوست ہیں اگر وہ
کہیں کہ پروین کچھ نیا لکھا ہو تو سناؤ۔
اگر موڈ ہو تو سنا دیتی ہوں ورنہ حسبِ معمول
وہ میری ڈائری اُٹھا لیتی ہیں۔ اس کے لئے
بعض اوقات وہ مجھے چائنیز کھانا بھی کھلانے
لے جاتی ہیں لیکن تب بھی اگر موڈ ہو تو وہاں
سنا دیتی ہوں ورنہ موڈ پر بات ٹل جاتی ہے"
"کیا کوئی ایسی شخصیت ہے جس سے
ملنے کی خواہش ہے؟"
پروین چند لمحوں کے لیے ذہن پر زور
دیتی ہیں۔ پھر جواب ملتا ہے۔

"اب تو نہ ملنے کی کوشش کرتی ہوں
کہ ان لوگوں سے صرف اُن کی تحریروں میں
ملوں تاکہ بُت ٹوٹ نہ جائیں کیونکہ اکثر
ایسا ہوا کہ بڑی خواہش تھی ملنے کی لیکن ملنے
کے بعد سوچا کہ اچھا ہوتا نہ ملتی"۔
"کیا کبھی ایسا ہوا کہ جن لوگوں نے
پہلے آپ کو پڑھ رکھا تھا جب آپ سے اُن
کی ملاقات ہوئی تو آپ انھیں کچھ مختلف
لگیں؟"
"کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لیکن ہاں ایک
بار ایک خاتون کو یہ کہتے ضرور سنا کہ ۔۔
"ارے اتنی خوب صورت تو
نہیں ہیں جتنی ڈائری پر لگتی ہیں" مجھے
بڑی ہنسی آئی کیونکہ حسن تو عارضی چیز ہے"
"کیا کبھی شعر کہنے سے ریٹائرمنٹ
لیں گی؟"
"نہیں کبھی ریٹائرمنٹ نہیں لوں
گی۔"
"اب آپ سے آخری سوال ہے
وہ یہ کہ آپ کو اپنی شاعری سے بھی زیادہ
کوئی چیز پسند ہے؟"
"مجھے اپنی شاعری سے زیادہ کچھ
پسند نہیں۔ میں اس کے لیے ہر قربانی دے
سکتا ہوں کیونکہ یہ میری پہچان ہے ■

*

حاصل کی اس حقیقت کی لاعلمی کا غم ضرور ہے
یہ پہیلی میرے لیے ساری زندگی پہیلی
رہے گی ۔ ■

بقیہ:۔ لیو ٹالسٹائی کے ...

سے پیش کیا گیا ہے میکسم گورکی نے اپنی تحریروں
میں ان لوگوں کی مصنوعی انسان دوستی کی عکاسی
کی ہے جو حالات و واقعات کے خاموش تماشائی
بنے ہوتے ہیں۔ انھوں نے دانشوروں اور
تمام ملک کے عوام کو للکارا کہ امن جمہوریت
اور آزادی کے لیے سرگرم جدوجہد کریں اور
سامراج و فاشزم کے خلاف لڑیں۔ گورکی نے
سوویت یونین میں سوشلسٹ تعمیر کے عظیم الشان
اقدامات کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔
میکسم گورکی کی شاندار اور سچی انسان دوستی
مسرت اور خوشیوں سے بھرپور زندگی کی جدوجہد
کے لیے تمام ترقی پسند انسانیت کا ہاتھ بٹاتی ہے ■

بقیہ پہلی صفحہ ۲۱ سے آگے

پسند تھیں۔ میری کن باتوں سے وہ خوش
ہو جاتی تھی۔ کس سطح پر وہ مجھ سے بالکل
کھل جاتی تھی۔ میں بکمال احتیاط یہ اندازہ
لگا چکا تھا کہ ستیا مجھے کس شدت سے
چاہتی ہے ستیا میری بیوی تھی۔ اس
کا میں نے نہایت قریب سے مطالعہ کیا تھا
لیکن ایک بات جس کے متعلق میں شک
ضرور کرتا تھا اور جس کا مجھے علم نہیں تھا،
ستیا نے خودکشی کر کے مجھ پر واضح کر دی
میرے شک کے صحیح ہونے کی تصدیق
کرتے ہوئے ستیا نے خودکشی کر لی۔ اُن
[illegible] ستیا نے [illegible] کے ساتھ
[illegible] کیسے کامیابی [illegible]

محمد شاہد عظیم

لیو ٹالسٹائی کے افکارِ عالیہ

مہاتما گوتم بدھ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ ان کی نظر میں خوش نصیبی کا کیا مفہوم ہے اور کس آدمی کو خوش نصیب کہا جا سکتا ہے مہاتما بدھ نے جواب دیا تھا کہ خوش نصیب وہ ہے جس کی فکر سماج کو دانشوروں اور فلاسفروں سے نوازتی ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب میکسم گورکی اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہ دنیا کے ان خوش نصیب ترین ادیبوں میں ہیں جن کی فکر کا دھارا کئی نسلوں کو فیضان بخشتا رہا اور آج تک بھی اس میں جمود اور ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ بلاشبہ گورکی ایسا فنکار ہے جو کسی خاص دور سے نہیں بلکہ تمام ادوار سے تعلق رکھتا ہے اس نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ کسی مخصوص عہد کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ہر عہد کی کہانیاں ہیں جو آنے والی کئی صدیوں تک ہماری نسلوں کو متاثر کرتی رہیں گی۔

روس کے مشہور افسانہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالیے تو گورکی اپنی انفرادیت اور امتیازی شان کی وجہ سے بہت ہی نمایاں نظر آئیں گے۔ انھوں نے روسی ناول، افسانہ نگاری میں حقیقت نگاری اور ادب برائے زندگی کو اپنا اسلوب بنایا اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی عکاسی کی۔ گورکی نے خیالات و تصورات اور جمالیاتی اصولوں کی نئی دنیا بنائی تھی اور انھوں نے اپنے ادب میں انسان دوستی کا ایک اچھا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ نئے سوشلسٹ ادب کے بانی تھے اور انھوں نے ابتدائی روسی ادب کے کلاسکی نمونے پیش کئے۔ انھوں نے زندہ اور تابندہ رہنے والے حسین ادب کی داغ بیل ڈالی اس میں ایک ایسے سماجی نظام کی تعمیر کا ولولہ اور حوصلہ ہے جو ظلم و تشدد سے پاک ہے۔

گورکی نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے وہ شہر نزنی گورڈ میں ایک معمولی شپنگ ایجنٹ کے گھر ۲۸ مارچ ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے یہ شہر اب گورکی کے نام سے مشہور ہے اور روس کا چھٹا بڑا شہر ہے۔ گورکی ابھی پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا گورکی کا اصل نام الیکسی میکسووچ پشکوف ہے انھوں نے یہ قلمی نام گورکی بعد میں اختیار کیا۔ روسی زبان میں گورکی کے معنی کڑوا اور تلخ کے ہیں گورکی کو چونکہ کمسنی ہی سے نہایت صبر آزما حالات، نکبت و افلاس کا سامنا کرنا پڑا اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں تھیں اس لئے انھوں نے یہ نام اختیار کیا۔

شہر کازان میں قیام کے دوران انھوں نے موچی اور بیکری کی ملازمت کے علاوہ چوکیدار کے فرائض انجام دیئے۔ ناسازگار حالات سے تنگ آکر گورکی نے ایک مرتبہ خودکشی کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ایک اسٹیمر پر ملازمت کے دوران ایک باورچی نے انھیں مطالعہ کا چسکا لگایا جو عادت ثانیہ بن گیا۔ موجودہ صدی کے روس کے اس مقبول ترین ادیب نے ۱۸۹۲ء میں اپنی پہلی کہانی "مکر چودرا" لکھی تاہم "چلکاش" کے بعد جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی وہ بحیثیت ادیب سامنے آئے۔ اس کہانی سے انھیں غیر معمولی شہرت ملی۔ یہ گورکی کے ادبی سفر کا آغاز تھا۔ انھوں نے ابتدائی تصانیف میں بڑے جاندار اور حوصلہ مند کردار پیش کئے جو زندگی کے بے رحم وار اور صدموں کو ہنس کر جھیل جاتے ہیں انھوں نے لوگوں کو خوشیوں اور مسرت کے حصول کے لیے مجاہدانہ جد و جہد کے لیے للکارا۔ جب گورکی نے شروع شروع میں کہانیاں اور ڈرامے لکھے تو وہ زندگی کی کافی سنگلاخ راہ طے کر چکے تھے افلاس کے ستائے ہوئے گورکی روس کے طول و عرض کی خاک چھان چکے تھے۔ انھوں نے درجنوں پیشوں کا

تجربہ کیا تھا اور بعد میں انھوں نے لکھا "میری نگاہوں میں زندگی، دشمنی اور بیداریوں کی ایک زنجیر تھی جس کا سلسلہ کہیں ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔

گورکی نے یوں تو بے شمار ناول، مختصر کہانیاں اور ڈرامے لکھے جن کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن گورکی نے اپنے ناول "ماں" میں دنیا کے ادب میں پہلی بار انقلابی جذبہ اور انقلابی مزدوروں کی وسیع تصویر پیش کی جو انسانوں کے ہاتھوں انسان کی موت کے خلاف صبر آزما جد وجہد کرتے تھے انھوں نے دکھایا کہ صرف وہ قائدین جو عوام سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں اور اپنے فرض کو سمجھتے ہیں عوام کو فتح کی منزل کی طرف لے جا سکتے ہیں ماں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ کتاب تمام ملکوں کے محنت کشوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ اس وقت سے گورکی کی تحریر والے عالمی ادب کی ترقی میں مرکزی جگہ حاصل کی جو انھوں نے محض فن اور صلاحیت کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اس لیے بھی حاصل کی کہ ان کی فکر اپنے عہد کے ترقی پسند اقدامات کو پیش کرتی ہے۔

گورکی کا دوسرا مقبول ناول مالوہ ہے جو انھوں نے اس وقت سپرد قلم کیا جبکہ وہ اڈیسہ ODESSA اور جنوبی روس میں آوارہ گرد اور ایک بے خانماں انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ مالوہ میں انسانی زندگی اپنے سماجی کرب اور تلخی کے باوجود دھڑکتی اور مچلتی دکھائی دیتی ہے۔ گورکی دیواریں، پاتال، بنگلے والے اور بڈھا ان کے شہرۂ آفاق ڈرامے ہیں۔

گورکی نے اپنی وفات سے چند برس پہلے امریکہ کا دورہ کیا تھا جہاں انھوں نے امریکی معاشرت کے گوشہ گوشہ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ نیویارک کی تنگ گلیوں میں اور کشادہ سڑکوں پر ایک ہجوم کو بھاگتا دوڑتا دیکھا، وہاں کی صبحیں اور شامیں دیکھیں، اندھیرے اور اجالے دیکھے، خواب ہوشیاں کے ساتھ ایک قبرستان میں جا کر مردوں کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی کیا اور ایک رپورتاژ بھی لکھا جو عوام میں "گورکی امریکہ" میں کے نام سے شائع ہوا اس رپورتاژ سے گورکی کی سرمایہ داری، غیر متوازن معاشی ترقی اور اخلاقی قدروں سے گراوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ گورکی کو افسوس ہے کہ زبردست مادی ترقی کے باوجود انسان غیر مطمئن ہے اور زر پرستی کا بھوت گھروں کا حسن اور ہمارے گوشت پوست سے زندگی کی نمی چوستا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں انسان کی اہمیت اور قدر گھٹ گئی ہے اور وہ قہقہوں کے لیے ترس گیا ہے نتیجہ کہ ہماری روحیں تک مسرت و انبساط سے محروم ہیں اس رپورتاژ میں بعض جگہ گورکی کے لب و لہجہ میں بلا کی تلخی آ گئی ہے۔ امریکہ کی دورنگی انھیں پسند نہیں آئی ایک جگہ لکھتے ہیں مرد اور عورتیں سینے سے سینہ ملائے رقص کرتے ہیں لیکن یہی لوگ سامنے والی عمارت میں جا کر وعظ سنتے ہیں وہ ہفتہ کے چھ دن کام کرتے ہیں اور ساتویں روز وعظ بھی کرتے ہیں اور گناہ بھی۔ گورکی کو صدمہ ہے کہ بچے جو ہمارے مستقبل کی ضمانت ہیں یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی نے مرجھائے ہوئے پھول گلیوں میں پھینک دیے ہیں ان کے خون میں شہر کے دھوئیں کا زہر گھلا ہوا ہے اور اعصاب پر بھاری سڑکوں، ٹراموں اور ریل گاڑیوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کا زبردست اثر ہے انہیں فکر ہے کہ یہ بچے بڑے ہو کر دماغی اور جسمانی لحاظ سے کیوں کر صحت مند رہ سکیں گے۔

گورکی کی انسان دوستی کی جڑیں محبت میں نہیں بلکہ نفرت میں ہیں محنت کشوں کی ظالموں اور جاگیرداروں سے نفرت میں، گورکی کا کہنا ہے کہ جب تک نفرت کرنے کا گر معلوم نہ ہو آدمی محبت نہیں کر سکتا۔ وہ تمام دوسرے ادیبوں سے زیادہ اس پستی اور گراوٹ کو ذلت سمجھتے تھے جس کے دلدل میں سرمایہ داری نے انسان کو دفن کر رکھا ہے جو بندگی کا خالق ہے اور جو حسن اور سچائی کی تخلیق کرتا ہے جو محنت و مشقت کا خدا ہے وہ انسان کی ہر ذلت کو اپنی ذلت کی طرح محسوس کرتے تھے۔ گورکی کی انسان دوستی کی روشن مثال ان کی دوسری تحریریں بھی ہیں جن میں لاجواب، نکتہ رسی ہے۔ یہ بے بہا تصانیف ہیں جن میں جد وجہد کی پکار اور آگ ہے ان تحریروں میں مزدور طبقہ کی انقلابی جد وجہد کے اہم اور بڑے مرحلوں اور منزلوں کو بڑے ہی جامع اور ٹھوس ڈھنگ

(بقیہ صفحہ پر)

خاص "پونم" کیلئے
کلامِ تازہ

تبرکاتِ جوش ملیح آبادی

بتوسط: اختر حسن (اسسٹنٹ سکریٹری اردو اکیڈمی)

زانو پہ جو میں سر کو جھکا لیتا ہوں — افکار کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوں
انفاس پہ تولتا ہوں میں عرش و کرسی — کونین کو چٹکی میں اٹھا لیتا ہوں

تجسس وہ کیا برسوں کہ حکمت کے خزانے سے — یقیں جس پہ فدا ہو وہ گماں بخشا گیا ہم کو
کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ خاکساری کی — جو سر رکھا زمیں پر آسماں بخشا گیا ہم کو

ٹھہرے ہوئے دریا میں تلاطم لایا — نوحوں کے حصار میں ترنم لایا
اس درجہ تھکن ہوئی کہ دل ڈوب گیا — میں کھینچ کے لب تک جو تبسم لایا

شاذ تمکنت

اے خاکِ ہند تیرا مقدر ہمیں تو ہیں
ہر آئینہ کے حق میں سکندر ہمیں تو ہیں

فردا کی چلمنوں سے اُجالوں کی آہٹیں
محسوس کرنے والے سخن ور ہمیں تو ہیں

کرتے رہے ہیں مدحِ لب و عارضِ وطن
شیریں بیان و قند مکرر ہمیں تو ہیں

کوہِ گراں کو ہم نے صنم زار کر دیا
تیشہ بدست، صورتِ آذر ہمیں تو ہیں

اپنے لہو کی سینچ میں کیف و سرور ہے
ساقی ہمیں ہیں بادہ و ساغر ہمیں تو ہیں

مانا کہ خار خار سے ہے آبلوں کی چھیڑ
رفتارِ دہر تیرے برابر ہمیں تو ہیں

باھوں میں بانہیں ڈالے ہوئے وقت ہے رواں
تاریخ کی زبان پر ازبر ہمیں تو ہیں

جس طائرِ خیال کی پرواز ہے بلند
اُس طائرِ خیال کے شہپر ہمیں تو ہیں

کیا ظلمتوں کا خوف، کفِ دست، مہر ہے
کیا تشنگی کا ذکر سمندر ہمیں تو ہیں

اے بارگاہِ لیلیٰ فردا ترے نثار
دیوار ہے بلند تو کیا در ہمیں تو ہیں

رنگِ چمن ہمارے لہو سے ہے لالہ گوں
زخمِ کہن کے واسطے نشتر ہمیں تو ہیں

سنگِ نہاد ہم ہیں، عمارت بنیں گے وہ
کل آنے والے لوگوں سے بہتر ہمیں تو ہیں

ہر سمت کی پہلی صف میں ہمارا قدم ہے شاذ
ہر کربلا کے حق میں بہتر ہمیں تو ہیں

وسنت کمار

آخری گیت

وسنت کمار ہندی کے ایک شاعر ہیں جو ہندی اردو کو اپنی ماں مانتے ہیں بلکہ اپنے افکار کو اردو میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی اردو تخلیق "آخری گیت" جو انھوں نے خاص طور پر پونم کے لیے بھجوائی ہے۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

آخری گیت اپنائے جاتا ہوں تمھیں
ہو سکے تو سر سنسار اسے دے دینا تم
لفظ، خاموشی کی چادر اوڑھ چپکے ہیں
گر ہو ممکن تو کوئی پیغام انھیں دے دینا تم
زندگی کبھی جو دے نہ پائی مجھ کو
پیار میری موت کو وہ دے دینا
تنہائی کے ساگر میں ڈوب چکا ہوں گہرا
نام مگر تجھ کو ہو سکے تو دے دینا تم
ہنستے ہنستے رو لینا۔ روتے روتے ہنس لینا
ہر کٹھن سمے کو میرا عنوان سمجھ کر جی لینا تم
سانس کا دامن خالی خالی، جاں کی نگری اندھیاری
پر امید کی آنکھوں میں زندہ ہے ایک آس کبھی کی
اسی آس کو میرا اسلام، میری سوغات سمجھ کے لینا تم
تم ہی شکتی، تم ہی مکتی، تم ہی بھگتی شانتی اپنی
اپنے کو اپنے سے بچا کر صرف مجھے دے دینا تم
آخری گیت اپنائے جاتا ہوں تمھی کو
ہو سکے تو اپنی آواز اسے دے دینا تم

نصر قریشی

ہجرت کی کتھا

خواہشوں کے سانپ نے اک خوشۂ گندم کی خاطر در بدر سب کو کیا
ہجرتوں کا سلسلہ روزِ ازل سے چل رہا ہے
قحط، طوفاں، برق، باراں، خشک سالی
جنگ، جھگڑے، بربریت، شدتیں
خون کے پیاسے درندوں کا ہجوم
سرزمینِ کربلا یا سرزمینِ ویتنام یا بنگلہ دیش
کوئی چنگیزی، کوئی فرعونی لشکر کی طرح
ہر طرف اک لشکرِ عفریت کا بھاری پڑاؤ
اژدروں کا اک ہجوم
انگلی مالا یا سروں کی مالا گردن میں پڑی
بستیاں ویرانوں کی تصویر تھا۔

سرحدوں کو توڑتا انسانوں کا سیلِ رواں
ہجرتوں کے باب میں اک بابِ غم کا جوڑتا
روز اخباروں کے کالم میں کوئی تازہ کتھا
صفحے ناکافی ہوئے
ہجرتوں کی یہ کہانی آخر ہم کب تک لکھیں؟

غزلیں

جرم محمد آبادی

تمام شب جاگ کے گزاری کہاں ستاروں کو نیند آئی
نہ آنکھ جھپکی ذرا ہماری نہ غم گساروں کو نیند آئی

گلوں کا ہنسنا بجا ہے لیکن چمن سے خطرہ ٹلا نہیں ہے
خزاں جگا جائے گی رنگ اپنا اگر بہاروں کو نیند آئی

نہ اب وہ موجوں کا ہے تلاطم نہ اب وہ گرداب کا ہے چکر
ڈبو دی کشتی زندگانی تو غم کے دھاروں کو نیند آئی

تمام شب دور میں تھا ساغر عجیب منظر تھا میکدے کا
نہ ہاتھ ساقی نے اپنا روکا نہ بادہ خواروں کو نیند آئی

سکوں کی دشمن بنی ہوئی تھی بڑھی ہوئی زندگی کی الجھن
سہارا دینے پہ جب وہ آئے تو بے سہاروں کو نیند آئی

ہزار جھگڑے تھے زندگی میں سکون کب زندگی نے بخشا
اجل نے جب آ کے لوریاں دیں تو غم کے ماروں کو نیند آئی

خلافِ فطرت ہی جرم ہم نے اثر نمودِ سحر کا دیکھا
ہوئی جو بیدار ساری دنیا تو چاند تاروں کو نیند آئی

عزیز حامد مدنی

عشق کی اک بحث ردِّ ما و تو تک آ گئی ہے
ہم کناری کی شبِ نو گفتگو تک آ گئی ہے

تجھ سے مل کر مدتوں کے بعد دل ہے شاد کام
دل کی تنہائی دلیلِ آرزو تک آ گئی ہے

نیم وا آنکھوں میں پا کر اک سوالِ زندگی
عشق کی جرأت جوابِ روبرو تک آ گئی ہے

رہ کے زندانِ وطن میں حدِ آزادی ہے کیا
پھر کوئی زنجیرِ پا اس جستجو تک آ گئی ہے

کل جو جزر و مد میں غلطاں تھی بہ ہنگامِ وصال
اب وہ موجِ ساعتِ رفتہ لہو تک آ گئی ہے

نیند کی اک رو جو تھی اس کے گدازِ جسم میں
بوسۂ لب سے کسی خوابِ نمو تک آ گئی ہے

وہ ہوا مدنی جسے کہتے تھے جانِ میکدہ
کیا رقیبانہ حریفانِ سبو تک آ گئی ہے

مہدی پرتاب گڑھی

تھا بڑا مجھ سے مرا سایا بہت
آپ اپنے سے میں شرمایا بہت

کوئی لمحہ زیست کا اپنا نہ تھا
میں نے اپنے آپ کو ڈھونڈھا بہت

مرتے دم تک ساتھ تو اس نے دیا
میرا غم ہی میرے کام آیا بہت

آپ اپنے سے لپٹ کر رو لیے
جب کبھی جی اپنا گھبرایا بہت

اڑ گئی آئینۂ ماضی سے گرد
کیا ہوا وہ آج یاد آیا بہت

جس کو آندھی نے گرایا پچھلی رات
تھا گھنا اس پیڑ کا سایا بہت

اب مری آنکھوں کے سوتے خشک ہیں
زندگی نے مجھ کو رلوایا بہت

اندھی راہوں کا مسافر خود بنا
دوستوں نے مجھ کو سمجھایا بہت

بن گئی میری غزل بھی مرثیہ
وقت نے نغموں پہ اکسایا بہت

دین ہے مہدی ہجومِ یاس کی
جی مرا خوشیوں سے گھبرایا بہت

وقار خلیل

وہ مسرت ہو کہ غم، بانٹ لیا کرتے تھے
دوستو! درد کے رشتے بھی عجب ہوتے تھے

کوئی محفل ہو، ستاروں کی طرح سجتے تھے
روشنیوں کے صحیفے تھے، بھلے لگتے تھے

دل سے مجبور کچھ اتنے تھے کہ آتے جاتے
بے سبب بھی تری چوکھٹ پہ رُکا کرتے تھے

شعر کے نام پہ وہ عاشقی ہوتی تھی کہ بس
وقت کچھ اور تھا، حالات بھی کچھ ویسے تھے

ہم بُرے شہر کے میں لائے چشمِ خرد آج تو کیا
کل تک اِس شہر کی تہذیب کے گلدستے تھے

اب تو وہ لوگ کتابوں میں ہیں پیدا، ہیہات
گالیاں کھا کے بھی جینے کی دُعا دیتے تھے

کیوں ہر اک شخص کو تہذیب سکھاتے ہو وقار
ایک ہی گھر میں کبھی لوگ بہم رہتے تھے

محمد منظور احمد

گھُپ اندھیرے میں مجھکو ڈھونڈتی تھی
رات سناٹے میں صدا کس کی

آشیاں میرا، زد میں تھا لیکن
جانے کیسے بھٹک گئی بجلی

کارواں جا چُکا سوئے منزل
دیر تک گرد پیچھے بھی اُڑتی رہی

سوچ میں گم، نراس کیوں بیٹھیں
تھی مگر اتنی آس بھی تو نہ تھی

رات تھوڑی سی اور باقی ہے
اور کچھ دیر جاگ لیں تو سہی

کچھ مداوا نہ ہو سکا اب تک
کب اِن آنکھوں کی دور ہو گی نمی

کھولے بیٹھا ہے منہ ہر ایک صدف
جانے حصے میں کس کے ہے موتی

محمد علی اثر

دوستوں سے عمر بھر لڑتے رہے
دشمنوں کے واسطے اچھے رہے

لوگ آئینوں کی صورت تھے مگر
خوف تھا ایسا کہ سب ڈرتے رہے

سایہ سایہ زندگی چلتی رہی
فاصلے گھٹتے رہے بڑھتے رہے

راستوں کے پیچ و خم کے باوجود
دل کی بستی کی طرف چلتے رہے

غم نصیبوں کی بھلا اوقات کیا
زندہ رہنے کے لیے مرتے رہے

زندگی قسطوں میں لکھی تھی اثر
ہنستے ہنستے غم کو سہتے رہے

طلعت تابش

لانکہ روشنی کی پہونچ سے بھی دور ہوں
نیا سمجھ رہی ہے میں سرتا پا نور ہوں

ریا میں غرق ہو کے بھی پانی سے دور ہوں
شنہ لبی ہے ساتھ میں بھیگا ضرور ہوں

ئی نہیں جو پوچھے میری حیات سے
ں اس کی دسترس سے ابھی کتنی دور ہوں

ذرہ پڑا ہوں راہ میں ذرات کی طرح
سا زندگی کے بوجھ سے حد درجہ چور ہوں

ہروں کے اژدہام میں ڈھونڈھوں میں کس طرح
رسے کسی کی چاہ میں نکلا ضرور ہوں

شخص میرے شہر کا ہے مجھ سے بد گماں
ں کس سے یہ بتاؤں کہ میں بے قصور ہوں

بش سمجھ سکے گا مجھے کوئی کیا کہ میں
نی کتابِ زیست میں بین السطور ہوں

واحد برنی

اس طرح تیرہ شبی آئی ہے گھر گھر اے دوست
جیسے کونین ہو تاریک سمندر اے دوست

صبح کے بدلے میں کیوں شب کے ہو خوگر اے دوست
یہ اندھیرا تو نہیں اپنا مقدر اے دوست

خونِ دل صرف کریں حسنِ چمن کی خاطر
آؤ بن جائیں بہاروں کے پیمبر اے دوست

در حقیقت ہے وہی واقفِ اسرارِ حیات
جس نے پہچان لئے وقت کے تیور اے دوست

غم نہیں اہلِ خرد جتنے بھی چاہیں برسائیں
پھول ہیں اہلِ جنوں کے لیے پتھر اے دوست

ہم پرستارِ وفا ہیں تو ذرا غور کریں
مضمحل کیوں ہیں کئی پھول سے پیکر اے دوست

نشترِ غم، دلِ واحد کو ملے ہیں اتنے
اس کی ہر سانس ہے اب صورتِ خنجر اے دوست

شاہد نعیم (کراچی)

انسان سے ڈرتا ہوں کچھ خوف سا لگتا ہے
اے دوست مرے دل میں جو زخم ہے گہرا ہے

اے ابرِ شبِ ماتم کیا رنگ دکھائے گا
خود میری تباہی کا آنکھوں میں نظارا ہے

اے وقت کے فنکارو اب شکوہ بہ لب کیوں ہو
حالات کے پیکر کو تم ہی نے تراشا ہے

اب شہرِ تمنا میں کوئی بھی نہیں اپنا
آنسو بھی ہمارے ہیں دامن بھی ہمارا ہے

ناکردہ گناہوں پہ آنسو نہ بہا شاہد
شعلہ سا مرے دل میں ہر لمحہ بھڑکتا ہے

★

(بنگلہ کہانی)

پہیلی

مانک بندھوپادھیا

ایس۔ایم۔حیات

خزاں کی ایک کہر آلود صبح تھی۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی میں نے ایک بھرپور جمائی لی۔ گذشتہ رات مجھے گہری اور پُر سکون نیند آئی تھی۔ اسی نیم خوابی کے عالم میں میری نظریں چھت کے کاریشہتیر سے چپکی ہوئی ایک چھپکلی پر پڑیں۔ اتوار کا دن تھا۔ بستر سے اٹھ جانے کے لئے کوئی جلدی نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی بستر پر ایک اور گھنٹہ دراز رہنے کے محض تصور سے بھی ایک گونہ سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

میرے بستر کا دایاں حصہ تھا۔

مجھے اکثر پتہ نہیں چلتا کہ سبیتا کب بستر سے اٹھ کر کمرے کے باہر نکل جاتی ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی وہ سارے برتن مانجھ لیتی ہے اور کھانا بنانے میں لگ جاتی ہے۔ پتہ نہیں وہ اتنے سویرے کیسے اٹھ جاتی ہے صبح تڑکے بستر پر یونہی لیٹے رہنے سے جو آسودگی اور سکون ملتا ہے اس سے خود کو محروم رکھ کر وہ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہے سبیتا بہت ہنس مکھ عورت ہے ہاتھ منہ دھونے کے فوراً بعد وہ میرے لیے چائے لے آتی ہے۔ اپنی سستی دور کرنے کے لیے جوں ہی میں اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے بدن توڑتا ہوں تو مجھے اپنے بستر کے دائیں حصے کے خالی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ سبیتا کے جسم کی لذت بخش گرمی بستر سے غائب محسوس ہوتی ہے اور بستر پر بچھی چادر یخ بستہ محسوس ہونے لگتی ہے۔

مجھے یاد آیا۔ میں نے گذشتہ رات سبیتا سے ناحق جھگڑا کر لیا تھا۔ وہ بات میں بھول چکا تھا لیکن اُس حادثہ کی یاد تازہ ہوتے ہی رات کی پُر سکون نیند کے مزے اور صبح کی نرم اور نیم دھوپ میں بیدار ہونے کی لذت کافور ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے شانے کی سطح پر پھیلے دونوں ہاتھوں کو کسی فوری جذبہ کے تحت کھینچ لیئے۔ کس شرمناک طریقہ سے ہم نے گذشتہ رات جھگڑا کیا تھا ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اُس جھگڑے میں میرا ہی زیادہ حصہ رہا ہے۔ ہلکے سے احتجاج کے طور پر سبیتا نے رو پڑنے کے سوا اور کچھ نہ کیا تھا۔ رات کو جو کچھ ہوا تھا اسے کسی بھی صورت سے دو چاہنے والوں کے درمیان کی لڑائی نہیں کہا جا سکتا۔ رات میں نے سبیتا کی سرزنش کی تھی۔ نفرت کی دہکتی آگ میں کھولتے ہوئے میں نے سبیتا پر نہایت ہی شدید حملے کر دیئے تھے۔ میرے ذہن میں جتنے بھی گندے الفاظ آتے گئے۔ میں نے اُنہیں سبیتا پر اُچھالے لفظ جتنا سخت ہوتا میرے لئے اتنا ہی مسرت بخش ہوتا۔ میں نے کوئی ایسا لفظ باقی نہ چھوڑا جس سے ایک عورت اپنی ذات کو مجروح محسوس نہ کرے۔ انجام کار میں نے ضبط کا دامن چھوڑ کر اپنے پیر کا سینڈل اس پر دے مارا۔ جواب میں وہ صرف رو دی۔

سبیتا اس رات اپنی ساری کا پلو آنکھوں پر رکھے رو رہی تھی۔ سینڈل اُس کے سینے پر سختی کے ساتھ لگا تھا۔ ساری کا پلو آنکھوں پر سے سرکا کر وہ چند لمحوں تک اس سینڈل کو دیکھتی رہی اور پھر مجھے۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اُن آنسوؤں کی چادر سے ڈھکی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھ بھی سکی کہ نہیں یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اُس کے چہرے پر اُس وقت جو کیفیت طاری تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے

لیکن۔ یہ حادثہ میری راتوں کی پُر سکون اور گہری نیند پر کسی طرح اثر انداز نہ ہوا۔ اُس عجیب اور غیر فطری ردِّ عمل پر میں متحیر رہ گیا ایک شوہر جو اپنی بیوی کی وفاداری کا بھی شک کرے اور اُسے سینڈل پھینک کر مارے کیا وہ شوہر ساری رات گہری نیند سو سکتا ہے اور صبح کو تر و تازہ بیدار ہو کر موسم کی خوشگوار تبدیلیو

سے لطف اندوز ہو سکتا ہے؟

نیند سے جاگتے ہی مجھے متاسف ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے یقیناً سبیتا کے ساتھ زیادتی کی ہے اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو میرا رویہ ناقابلِ معافی تھا یہ اور بات ہے کہ بیوی کو کبھی کبھی تادیبی سزا دینا ہی پڑتی ہے بیویوں کا ایک ناقابلِ اعتماد قبیلہ ہوتا ہے مرد کی معمولی سی رعایت انہیں خود سر اور سرکش بنا دیتی ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ہر عمل کے لیے ایک دائرہ مخصوص ہوتا ہے۔ کیا میں سبیتا کو دل و جان سے پیار نہیں کرتا؟ دفتر میں سارے دن کی غلامی جو کرتا ہوں وہ کس کے لیے؟ کیا یہ سبیتا کے لیے نہیں؟ صرف اُس کی بھلائی کے سلسلے ہی مجھے کبھی کبھی اُسے تلخ و ترش کہنا پڑتا ہے اُسے سرزنش کئے بغیر اگر میں خاموشی اختیار کر لوں تو آگے چل کر میری خاموشی اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ انسان ہمیشہ یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ اُس کے لئے اچھا کیا ہے اور بُرا کیا۔ بالخصوص عورت یہ فیصلہ نہیں کر پا سکتی کہ اُس کی بھلائی کس میں ہے اور کس میں نہیں۔ اگر عورت کی ناکامیوں اور کوتاہیوں کو اُس پر بروقت واضح کر دیں اور اُس کے لیے مناسب سرزنش کریں تو اس میں اُسی کی بھلائی ہو گی لیکن مجھے اس کے لیے اتنی زیادتی پر اتر آنا مناسب نہ تھا۔ سونے سے پہلے میں صورتِ حال کو معمول پر ...

کرتا تو معاملہ اتنا سنجیدہ نہ ہو جاتا۔ میں سبیتا سے ایک گلاس پانی ہی مانگتا یا پیر ہی دابنے کے لیے کہتا۔

اب میں اپنی طرف متوجہ ہوا۔

زمین پر دیکھا تو مجھے وہ سینڈل نظر آیا جسے میں نے سبیتا پر پھینکا تھا اُسی جگہ پر پڑا ہوا تھا جہاں کہ وہ رات کو پڑا تھا ایک ہلکا سا احساس کہ میں اپنے کئے پر نادم اور منفعل ہوں میرے ذہن میں بیدار ہوا۔ لیکن مجھے اپنی تسلی کے لئے بہت جلد مناسب الفاظ مل گئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ منہ سے نکلی ہوئی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔ تاسف کرنا اور نادم ہو جانا بے معنی بات ہے لیکن اب مجھے بستر سے اٹھ جانا چاہیئے۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں نے سبیتا سے مفاہمت کا ایک منصوبہ باندھا۔ اُس کے آگے جا کر اُس سے معافی مانگوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اپنی بیوی سے اپنے تاسف کا اظہار کروں اور اُس سے معاف کر دینے کے لئے درخواست کروں۔ میرا ضمیر اس کے لیے بھی آمادہ نہ تھا۔ اس کا محض تصور ہی میرے لئے اذیت بخش ہے۔ میں نے یہ طے کیا کہ گذشتہ رات کی بات چھیڑے بغیر ہی سبیتا کے ساتھ میرا برتاؤ ایسا ہو گا جیسے کہ میں نے کوئی سخت لفظ یا نامناسب بات نہ کہی ہو۔ ہر روز کی طرح زینوں پر اپنے سلیپر پٹختے ہوئے میں نیچے اتروں گا۔ واش ...

کو صاف کرنے کے لئے کھنکھاروں گا۔ میری آواز سن کر سبیتا فوراً چولہے کی کیتلی اسٹو پر رکھ دے گی۔ آج میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد اٹھ جاؤں اوپر اپنے کمرہ میں نہ چلا جاؤں گا سیدھے کچن میں پہنچ جاؤں گا۔ اپنے چہرے کے سنجیدہ پن اور سختی کو تبسم کی گھلاوٹ میں تحلیل کر کے ایک حصیر کو اپنی طرف کھینچ کر اُس پر بیٹھ جاؤں گا۔ جب سبیتا اپنے چہرے پر شکوہ شکایت کے جذبات لئے گم صم میرے آگے چائے اور ناشتہ کے دوسرے سامان رکھ کر جانے لگے گی تو میں اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگوں گا۔ اگر سبیتا کا رویہ ناقابلِ مفاہمت رہا جب بھی اسے نظر انداز کر کے میں باتوں کا سلسلہ برقرار رکھوں گا۔ میرے اس رویہ پر سبیتا پہلے تو یقیناً چونک پڑے گی اور پھر خود سے اس کی وجہ دریافت کرے گی اور سمجھ جائے گی کہ اُس کے شوہر نے اُس کے جُرم کو بخش دیا ہے رات کا معاملہ رات ہی رفع دفع ہو گیا ہے۔ اسے اور طول کیوں دیا جائے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ اپنے اندازِ گفتگو کو معمول پر لائے گی اسے اور برہم رہنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ وہ سوچتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اگر کوئی دوسرا شوہر ہوتا تو یقیناً اسے جان سے مار ڈالتا۔ اُس کے شوہر نے تو صرف سرزنش کی ہے سبیتا کو کہنے کے لیے کچھ نہ رہتا وہ فطرتاً کم سخن تھی۔ احسان مندی کے جذبہ کے تحت ...

اور شوہر کی محبت کی ضیا سے ضو فشاں ہو جائے گا۔

میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ پچھتاوا اور تاسف کا احساس جاتا رہا اور خود کو شادماں محسوس کرنے لگا۔ رات کو میں نے سبیتا کے ساتھ جو زیادتی کی تھی اُس کی تلافی کے لئے میں اُسے بے اندازہ پیار اور محبت دوں گا۔ جو پیار کرتا ہے وہ سزا دینے کا بھی حق رکھتا ہے اگر کوئی اپنی حد سے بڑھ جائے تو دوسرے کا سختی کرنا فطری اور واجبی بات ہے۔

ایک سلیپر میں پاؤں ڈالے دوسرے کو تلاش کرتا ہوا جوں ہی میں آگے بڑھا میری نظریں سبیتا کے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑیں۔ اُس کا آئینہ کہر کی وجہ سے دھندلا گیا تھا آرائش کا یہ سامان اور ڈریسنگ ٹیبل سبیتا کو میں نے ہی پیش کیا تھا۔ جہیز میں یہ سامان نہیں ملا تھا۔ کپڑوں کے ریکس پر بہت سلیقے سے تہہ کی ہوئی کئی رنگ برنگی ساڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ ساری چیزیں میری خریدی ہوئی تھیں کیونکہ میں سبیتا پر جان چھڑکتا تھا۔ سامنے رکھی ہوئی بینچ پر سبیتا کا صندوق اس کا کیش بکس، سوٹ کیس اور ہارمونیم رکھا تھا۔ یہ سبھی چیزیں اپنے خون پسینے کی کمائی سے میں نے سبیتا کے لیے خریدی تھیں ان سارے تحفوں اور پیشکشوں کو دیکھ کر جو میں نے سبیتا سے اپنی والہانہ محبت کے اظہار کے طور پر دیئے تھے مجھے گونہ تسکین سی ہوتی ہے میں سبیتا سے بے انتہا پیار کرتا ہوں اور اسے شدت سے چاہتا ہوں۔ جبھی میں گذشتہ رات اتنا بے قابو ہو گیا تھا میری محبت اور میرے پیار میں اتنی شدت آ گئی تھی کہ میں خود اپنی حسد کی آگ میں جلتے ہوئے پاگل ہو گیا تھا جبھی ایک بے بنیاد شک پر میں آپے سے باہر ہو گیا۔

سبیتا بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند کر چکی تھی۔ یہ دروازہ ایک اندرونی بالا خانے سے جڑ ملتا ہے جو ایک کمرہ سے کم نہ تھا۔ سبیتا ہر رات کو بالا خانے کا دروازہ بند کر دیا کرتی تھی تاکہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا رہے۔ اس خیال سے کہ باورچی خانے میں برتنوں کی صفائی کی آواز سے میری نیند میں خلل نہ پڑے۔ سبیتا اکثر باہر نکلنے سے پہلے یہ دروازہ بند کر دیا کرتی تھی۔ سبیتا کے ڈریسنگ ٹیبل پر لگے آئینہ میں اپنی شکل کا جائزہ لینے کے بعد میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کر بالا خانے میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ جھوٹے برتن اسی طرح پڑے ہیں۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ بالا خانے کا اندرونی دروازہ بند ہے پھر میں نے دیکھا سبیتا رسی کے ایک سرے سے لٹکی ہوئی ہے دو بڑے دریچوں سے جو نیچے صحن خانہ میں کھلتے تھے روشنی آ رہی تھی۔ دوسرے لمحہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف تھی کہ سبیتا نے خودکشی کر لی ہے بالا خانے سے ملے ہوئے بیٹھک کے کمرے سے وہ ایک ٹیبل کھینچ لائی تھی اور اس پر ایک کرسی رکھنے کے بعد بھی وہ شہتیر کو چھو نہ سکی اُن چیزوں کو اُس نے یونہی چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اُس نے رسی کو کئی بار چھت پر لگے اس ہک پر پھینکنے کی کوشش کی تھی تب وہ اُس کے سرے کو ہک سے باندھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ سبیتا نے خودکشی کر لی ہے یہ تو ظاہر تھا لیکن اُس سے کئی گنی اونچی شہتیر پر لگی ہک سے وہ کس طرح رسی کے سرے کو باندھ سکی یہ میں نہ سمجھ سکا۔ میں لاچار اور بے کس اپنے چاروں طرف دیوانہ وار دیکھنے لگا۔ یہ ایک راز تھا جو مجھے ہمیشہ بے چین اور مضطرب کئے دیتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ سبیتا کے خودکشی کر لینے پر نہیں، اس احساس پر کہ سبیتا نے اس طریق کار کو مجھ سے صیغۂ راز میں رکھا جس کے استعمال سے اُس نے خودکشی کی تھی۔ سولی پر چڑھنے کی کس ترکیب کو وہ بروئے کار لائی مجھے کون بتائے گا۔ سبیتا نے پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال کر جان دینے کا منصوبہ کیسے اور کیونکر باندھا یہ نہ جان پانے کے محض تصور سے میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ اپنی جان اپنے ہاتھوں خود لے کر سبیتا نے مجھ پر سب کچھ واضح کر دیا۔ اُس چھوٹے سے غیر اہم واقعہ کو راز داری میں رکھنے کی ترغیب میں وہ کیوں کامیاب نہ ہو سکی۔

سبیتا کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق مجھے جزئیاتی علم ہے۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ سبیتا کو کس قسم کے کھانے مرغوب تھے۔ کون سے زیورات اُسے عزیز تھے۔ کن رنگوں کی ساڑیاں اُسے

(بقیہ صفحہ ۱ پر)

زہرہ جبیں

(افسانہ)

کالے بادلوں کے کنارے

کھڑکی میں سے آفاق نے دیکھا نازیہ بستر لگاتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ ریشمی بالوں کی لمبی لٹ بار بار اس کے تازہ پھول سے چہرے پہ آن بکھرتی۔

ہوبہو اپنی ماں کی تصویر ہے

وہ دروازے میں چلا آیا۔

"کیا گا بجا رہا ہے؟"

وہ اس کی آواز سن کر سیدھی ہو گئی

سرکش کونپل سا اس کا سراپا جیسے سارے کمرے پہ حاوی ہو گیا ہو۔

"اب تم بستر پہ لیٹ جاؤ۔" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

لیجئے جناب وہ بے چوں و چرا لیٹ گیا

نازیہ نے آگے بڑھ کر اس پر رضائی ڈالی۔

"اب تم یہاں سے اٹھو گے نہیں۔ سمجھے۔"

"سمجھ گیا ننھی چڑیل۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کو لپکا لیکن وہ بتی مدھم کر کے جا چکی تھی۔ کمرے کی پراسرار روشنی میں ہر سو اس کے سائے رقصاں تھے اس کے وجود کا [illegible]

پڑی تھی۔

یہ کیا احساس ہے۔ یہ کون سا جذبہ جاگ اٹھا ہے۔ مچلنے لگا ہے۔ سارے وجود میں بجلی کوند جاتی ہے۔ وہ تو مدت ہوئی تمنائیں آرزوئیں۔ ارمان سب کچھ تج چکا ہے پھر اب اس کے اندر یہ کیسے بھتنے سر ابھار رہے ہیں۔ انسان کا نفس کبھی مر نہیں پاتا۔ پریشان ہو کر آفاق نے بانہہ پلٹا اور اوندھا ہو گیا۔ اسٹول پہ رکھی۔ بتی کی ناچتی لو میں عجیب کھیل جاری تھا ایک چہرہ بن بن کر بگڑتا اور ایک بے چارگی اور بے بسی کی تصویر لیے ثوما نظر آئی۔ دوسری بار نازیہ کی متجسس اور محاسب نگاہیں ابھرتیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آنکھیں ملیں۔

روشنی کی کروڑوں شعاعوں میں ثوما کا وجود تحلیل ہو گیا۔ اور اب ہر طرف نازیہ کی شبیہ ابھرنے لگی۔ کمرہ بھر گیا۔

"یہ کیا سحر ہے؟"

آفاق اپنے آپ سے الجھ گیا۔ یہ تبدیلی [illegible]

اُجڑنے کی بات تو بہت پرانی تھی مدت ہوئی اُس نے دل کے نگار خانے کو خود ہی چھوڑ چھاڑ کر دیا تھا وہاں تو اب نہ کوئی نقش تھا نہ سراپا۔ طلب نہ چاہت۔ ثوما کو اس نے چاہا تھا پر وہ تو ایک جگا دے جذبہ کی بات تھی۔ وہ ایک طوفان سا سے گزرا تھا لیکن پھر جیسا کہ ہوتا ہے دھل دھلا کے صاف ہو گیا تھا۔ ثوما کی ذات سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی اب تو وہاں محض عادتاً چلا آتا۔ غیر ارادی طور پر۔ بس یوں ہی کہ بے مقصد۔

اور یہ لڑکی۔ یہ ثوما کی چھوٹی بیٹی کس رعب کس طنطنے سے آئی۔ کب کیسے اور کدھر سے آئی۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن اسے زندگی کی حرص اور کھویا ہوا نفس لوٹا گئی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا اس نے سرہانے پر پٹخا۔

زمانے بیتے، گاؤں کے پیپل تلے چبوترے کی سلوں پہ پنج گٹیا کھیلتی ہوئی معصوم لڑکی نے پہلا بار اس کے ننھے منے دل پہ دستک دی تھی۔

"اوئے فاتے۔" اس نے سنہری لٹیں جھٹک کر ناک چڑھائی تھی۔ "تمہارے پاس کانچ کی گولیاں ہیں؟"

"ہوں نہ۔"

"دو نا۔"

اور وہ چور جو نے مرنے پر کتنا مشہور تھا جو دوسروں کی چیزیں چھین لیتا تھا۔ غرّایا نہ بولا۔ بس جیب اس ستارہ آنکھوں کے آگے [illegible]

سارے اثاثے میں یہی ایک قیمتی بات تھی۔ اسکول کے دنوں میں لڑکوں میں دشمنی چل گئی۔ سارے گاؤں کی دیواروں پر انھوں نے ایک دوسرے کی خیالی محبوباؤں کے نام لکھ ڈالے۔ ایک دو جگہوں پہ ثوما کا نام بھی لکھا گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کس کے لیے تھا۔ لیکن آفاق کے آگ لگ گئی اور یہ آگ اتنی بھڑکی اور لڑکوں کی لڑائیاں اتنی بڑھیں کہ گاؤں میں کشیدگی پھیلنے لگی۔ تب اس کی پٹائی ہوئی اور خوب ہوئی تھی بعد میں وہ جلد ہی شہر چلے گئے تھے ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے والد نے کوئی اور نوکری کر لی۔

جب وہ میٹرک میں تھا تو ایک بار گاؤں آیا۔ صبح ہی صبح وہ کہیں جا رہی تھی۔ گلی کے نکڑ پر دوسری گلی میں چوڑیاں کھنکیں، اس کی دھڑکنیں بج اٹھیں۔ ثوما ادھر ہی آ رہی تھی۔ اس کے گرم خون نے زور مارا، یا جانے کیا ہوا آفاق نے جیب سے گڈی نکالی اور راہ میں نوٹ بچھانے شروع کر دیئے۔ ثوما کی کوئی سی گردن تن گئی اور اس کی نگاہوں سے شرارے برسنے لگے۔

"انہی پہ چل کے آؤ۔" آفاق نے ارشاد کیا۔ "آسمان پہ تارے نہیں ورنہ لا بچھاتا۔"

ثوما کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ وہ کچھ نہ بولی نوٹوں پہ پاؤں رکھتی گزر گئی۔ گلی میں اس وقت کوئی نہ تھا لیکن دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح آفاق کے باپ تک پہنچی۔ زندگی میں دوسری بار اس نے باپ کے ہاتھ دیکھے گاؤں میں اس کا آنا جانا بند کر دیا گیا پر کہیں دریاؤں پہ بھی بند بندھے ہیں دھارے راستہ بنا لیتی ہیں۔ گاؤں سے اس کا رابطہ قائم تھا اسے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اپنی دنیا میں خوش تھا جیسے تیسے اس نے میٹرک کر لیا تو اسے ٹیلیفون کی ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہیں اسے منتظر کا خط ملا جس میں اور خبروں کے ساتھ ثوما کی شادی کی خبر بھی تھی۔ اس پہ آسمان ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسے ہوا کیونکر اسے پہلے کیوں نہ پتہ چلا۔ اس حادثہ کے بعد اس نے کبھی کوئی دلچسپی دکھائی نہ تھی۔ وہ محبت کو رسوائی سے بچاتا رہا اور لوگ سمجھے شریر لڑکا اپنے مسخرے پن سے باز آگیا ہے کھیلنے کھلانے والے لڑکے سنجیدہ نہیں ہوا کرتے اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ ٹریننگ کے بعد برسر روزگار ہو کر وہ پہلے ثوما کو مانگے گا۔

"یہ کیا ہوا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ کیسا مذاق کیا۔" ہنستا کھیلتا لڑکا کھنڈر کی طرح ویران ہو گیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب وہ کسی اور عورت کے متعلق سوچے گا بھی نہیں۔ اپنے آپ سے انتقام لینے کا صحیح طریقہ یہی تھا وہ جو چلبلا اور اکھڑا تھا محبت کے معاملے میں کس قدر بزدل اور بے وقوف ثابت ہوا تھا۔ اس نے ہر طرف کے دروازے اپنے پہ بند کر لئے اور اپنی ذات میں قید ہو گیا۔ برس گزر گئے۔ دوستوں نے بیاہ جوڑی کی۔ گھر والوں نے حیلے کئے۔ لیکن وہ پتھر بن چکا تھا۔ وقت عظیم چارہ گر ہے۔ زخم آخر مندمل ہو ہی جاتے ہیں۔ کسک کم ہو جاتی ہے سکون آ ہی جاتا ہے اس سال بے پناہ بارشیں ہونے کی وجہ سے ان کے مکان کی اندرونی دیوار گر گئی۔ والد کی ناتوانی اور بھائی کی مصروفیت کی وجہ سے اس کو جانا پڑا۔ وہ گاؤں میں ایک بالکل اجنبی بے تعلق اور کھیا نے شخص کی طرح داخل ہوا لیکن گئی گزری حکایتوں نے اس کے سر پہ ہتھوڑے برسانے شروع کر دیے۔

وہ راج مزدوروں کے پاس کھڑا تھا

"ماموں"

"چاچا"

کوئی بچہ ماں کے ساتھ تتلا رہا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ دشمن جاں کھڑی تھی اپنے پہلو میں دو بچے لٹکائے ہوئے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ گنگ ہو گیا۔

"آفاق تم کب آئے۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ "خیریت" سے ہو نا۔؟"

"ہنہ"۔ وہ بے دلی سے بولا۔ "یہ عورتیں کم بخت عجیب ہوتی ہیں۔ بچوں کی مائیں بن کر کیسی بزرگ بن بیٹھتی ہیں۔"

"دیوار گر گئی تھی۔"

"ہنہ"

اور کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔" وہ صحن سے گزرتی کمروں کے اندر چلی گئی۔ وہ بھی بڑھتا اس کے پیچھے چلا آیا۔

"بند گھروں کا یہی حشر ہوتا ہے۔" آفاق
تم شادی کر کے اپنی دلہن کو یہیں رکھو۔"
"شادی کروں؟" وہ گلوگیر ہو کر بولا
جو جیسے بادل اس کی آنکھوں میں برسنے لگے۔

ثوما تھرا گئی۔ ان کہی کہانیاں اُسے
لرزا گئیں۔ بھرم رکھنے کو بولی۔ ہاں آفاق
اب گھر بسا لو۔"

"تم نے اپنا گھر بساتے وقت میرے گھر
کا سوچا ہوتا۔" وہ شیر سا مرد رو پڑا۔ اندر
کا دکھ اُمڈ آیا تھا۔ لاوا موقع ملتے ہی بہہ
نکلتا ہے۔" تمہیں ذرا بھی احساس نہ ہوا۔"

"تم نے احساس دلایا ہوتا نا آفاق۔
ثوما کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول گئی۔
"ناگن کی طرح پھنکارا کرتی تھیں تم۔"
"تم بھی تو سانپ تھے۔" اور دونوں ہنس
پڑے۔ آنسوؤں اور ہنسی کی آنکھ مچولی ہوئی۔
"پگلے خود بھی جلے۔"
"گیا۔"
"مجھے بھی جلایا۔" آفاق نے پہلی بار
اُسے نظر بھر کر دیکھا۔
"تم جلیں۔"
"تو اور۔"
"ثوما۔" آفاق نے اس کا دوپٹہ پکڑ لیا
"ہاں آفاق۔ تم پہلے کیوں نہ۔۔۔"
اور وہ [illegible] پھوٹ پڑا۔ بند اُکھڑ گئے۔ سیلاب
بہہ نکلا۔

"میں نے ہمیشہ تمہاری راہ دیکھی ہے اب
بھی۔۔۔"

آفاق نے سر اٹھایا۔ تو یہ گندم کی بالی
کی طرح لرزتی۔ خود پسند عورت دکھی ہے میرے
لیے لیے ہے۔ جرم تو اس کا تھا وہ اسے
کھو کے کیوں دے رہا ہے۔ اس معاشرے
میں کوئی عورت کوئی خوبصورت عورت
سکھی نہیں۔ مرد اُسے دکھی کر کے خود 'خود
ترسی' کا شکار ہوتا ہے۔

"چھوڑو پگلے قسمت میں یہی لکھا تھا
اب تو زندگی نے اپنی اپنی راہیں اختیار کر لی
ہیں۔" ثوما نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
گھر بسانے کی فکر کرو۔ میں تمہارے لیے دلہن
لاؤں گی۔"

"اب تم کہاں سے لاؤ گی۔ وہ کھو چکی
ہے۔"

"میں اسے ڈھونڈ لاؤں گی۔ میرے
شاعر۔"

اور کئی سالوں سے جو بوجھ اس
کے سر کو ڈسیں رہا تھا خود بخود کہیں ڈھلک
گیا تھا۔ وہ ڈھل ڈھلا کر ہلکا پھلکا ہو گیا۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ایک مہینہ پندرہ
دن کے بعد گاؤں آنے لگا۔ ثوما کے گھر۔ دنیا
کو چرچے کرنے کے لیے ایک بات مل گئی
بہت اُلجھنیں، بہت فساد پیدا ہوئے
لیکن ثوما اس آزمائش میں پوری اتری
اس نے اپنے خاوند کو عمل سے باور کروا دیا
کہ وہ صرف اسی کی ہے۔ اس کی امانت
میں خیانت نہیں کر سکتی ہے نہ کرے گی
آفاق کو بس بحیثیت ایک انسان سہارا
دے رہی ہے۔ وہ خود اس کا گھر بسانے کی
فکر میں رہتی لیکن وہ تو خواہش سے آزاد
ہو چکا تھا اس کی فقیر منشی اس کی سچائی
کا بڑا ثبوت تھی۔

وقت گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ باتیں
دبتے دبتے دبنے لگیں۔ آفاق اپنی جگہ پہ
رہ گیا ثوما آگے نکل گئی گھر میں کھو گئی۔ بچے
بڑھنے لگے۔ گھر کے ماحول کو سمجھنے لگے لوگوں
کے رویے کو محسوس کرنے لگے اور ثوما کو تب
خبر ہوئی جب اس کی بڑی لڑکی نازیہ بات
بات پر اُسے ٹوکنے لگی۔ دوسروں سے انسان
اُلجھ سکتا ہے قسمیں کھا کر سچا ہو سکتا ہے لیکن
اپنے پیٹ سے نکلے ہوئے سانپ سے کون
نپٹے گا۔ اس سے کون آنکھ ملائے۔ نازیہ
کی تیز اور کڑوی نگاہیں ماں باپ اور آنے جانے
والوں کا کڑا محاسبہ کرتیں اور ثوما بغیر وجہ کے
خجل ہوئی پھرتی۔ اس کے آنسو اُمڈ آتے۔ وہ
سوچا کرتی۔ بارِ الٰہا کن نا کردہ گناہوں کی سزا
ہے۔ اس الجھاؤ میں سلجھاؤ کی ایک صورت نکل
آئی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آفاق کی محرومیوں
کا ازالہ کرے گی۔ اس کی وفا کا بدلہ چکائے گی۔

وہ نازیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہے گی
اُسے ثوما سمجھے۔ لیکن وہ بہت عظیم ہے بہت
پوتر ہے اس نے ایسا کبھی نہ سوچا ہوگا۔
نازیہ اس کی بیٹیوں کی جگہ ہے یا کہیں میں نے
اُسے پھر غلط سمجھا ہو۔ اُسے صدمہ نہ پہنچے کہیں
وہ غصے میں پڑ جائے۔ نہیں اب اسے آفاق کی
نظروں میں اور نہیں گرنا۔

بقیہ ۔ کالے بادلوں کے کنارے

- - - - - - - - - - - - - - -

پھر کیا ہو ۔ ؟
ایک مدت سے اس نے اسی الجھن میں گزار دی لیکن یہ روح کا بوجھ تب تک اُترنے کا نہیں جب تک وہ آفاق سے بات نہ کرے۔ وہ ہفتہ بھر اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔ اسی ہفتہ کی شام کو جب آفاق لدا پھندا گھر آیا تو اس نے ساری چیزیں نازیہ کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ نازیہ نے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہر چیز سلیقے سے محفوظ کر لیا۔ آفاق کے کپڑے نکالے اُسے چائے دی۔ کھانے کے بعد سب دیر تک رسوئی میں بیٹھے گپیّں لگاتے رہے۔ اس تمام عرصہ میں نازیہ وہاں سے پل بھر کے لیے نہ ہلی۔ ثوما ڈری سہمی، جھکی بیٹھی رہی۔ جب وہ سب سونے کے لیے آٹھے تو نازیہ لالٹین اٹھا کر آفاق کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔

ثوما چور چور ہو کر بستر پر گری۔ اس سے زیادہ کوفت برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ آفاق سے کس وقت بات کی جائے۔ اس کی بیٹھا کا ردّ عمل جانے کیا ہو۔

وہ تانے بانے بنتی رہی۔ رات کا پہلا پہر ڈھل گیا آفاق سے بات نپٹانے کا مناسب موقع تھا۔

وہ آہستہ سے اُٹھی۔ پاؤں میں جوتے ڈ اسے ابھی ایک قدم بھی نہ چلنے پائی تھی کہ بم پھٹا۔

" کہاں جارہی ہو ۔ اماں ؟ "
جیسے چور چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔ اس کے قدم زمین سے بندھ گئے بیٹی کے لہجے میں نفرت اور دھتکار تھی

چودھری محمد ارشد

تحریک کے خوگر

(افسانہ)

وہ کون تھا؟
آیا اور چلا گیا۔ کچھ پوچھے بغیر، جیسے اندر سے سب سمجھ لیا ہو۔ بے وطن ہونے اور مفلسی کی پوری داستان،
خوب انہماک سے کھا کر پال نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس اندر اتارا تو کچھ توانائی و استراحت کا احساس ہوا اور اس کی دھندلی شبیہ ذہن میں ابھر آئی۔ اگرچہ کوشش کے باوجود خدوخال واضح نہ ہو سکے — بے چینی سے پال کی نگاہوں نے ہال کے باہر فٹ پاتھ اور سڑک پہ اُسے تلاش کیا۔ لیکن وہی پرانے چہرے تھے۔ جھوٹے، فریبی، خول میں بند!۔
ایک پال ہے اور دوسرا شاید وہ —
ہال میں ایک ہجوم سا سمٹ آیا ہے۔ پال کے گرد کی میز یں خالی کیے کچھ لوگ کھڑے رہ کر بھی پُرسکون ہیں۔ گندی، چھیتڑے سے جھولتی ہوئی پوشاک اور سکھوں کے شور سے دور۔
یہ دور کیوں ہیں؟ — یہ انسان شوکیس میں بند۔ گندگی کو چھپائے۔ گندگی سے دُور۔ کیسی عجیب بات ہے۔ عجیب دنیا ہے۔ عجیب، خوبصورت، اور نمائشی دنیا۔
ایک شوکیس پال کے پاس بھی تھا مگر اندر کے وحشی کی چیخ، شدید چیخ سُن کر نیلام کر دیا۔ کئی کئی بار چیخنے والا یہ وحشی —! کیسی دردناک آواز تھی کسی نے سنا نہیں۔ سب نے حقارت سے کہا۔
"شرم کرو۔ زندگی اتنی آسان نہیں زندگی کے زہر کا حصہ اور اندر کے وحشی کی چیخ — اُف!"
یہ حقیقت ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت۔
یہ مشینی دور ہے یا انسانی؟
ہر زمانہ تیز رفتار رہا ہے۔ مگر یہ عہد اسپرنگ کا آدمی، فلائٹ جیسی اڑان شور، چیخیں، تیز بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ، مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ بڑے بڑے زہریلے دھماکے — کیسی کاوش ہے، کس کی تلاش؟ یہ تلاش! تلاش تھا کر وہ ناتواں بھی ہیں کچھ پار لگے اور — کچھ —!!
کچھ میں پال بھی تھا چیخوں سے کراہتا ہوا۔ ایک دم لاغر۔ ہارا ہوا قیدی۔ مگر یہ دنیا حسبِ فطرت تلاش میں اسے روندتی ہوئی افراتفری پھیلاتی رہی۔
یکایک کسی نے اپنی نگاہوں کے حصار میں لے لیا۔ ان آنکھوں کی مسکراہٹ میں پال نے شباب سے لدی چھاتیوں کو دیکھا۔ اور — دو پتلے اور سرخ ہونٹوں کی حرکت سے چمکیلے موتیوں جیسے الفاظ پھسل گئے۔
"تم میرے ساتھ چلو گے محبت کی راہ پر؟"
"پال نے سوالیہ نگاہوں میں خود کو پلنے کی کوشش کی۔"
"میں تمہیں فٹ پاتھ نہیں، مخملیں فرش دوں گی، اچھا سا محل، روشنی، رات کی تاریکی۔ اور اپنا بستر بھی۔"
پال چپ رہا۔
"یہ باہیں، میری کالی گھٹائیں اور تم!!"
وہ پھر بھی خاموش رہا۔ لیکن وحشی بے چین ہو کر چیخ اٹھا۔
"نہیں — تم یہ سب کچھ نہیں دو گی۔
وحشی چیخ رہا تھا۔ مت چھیڑو۔ ہو سکے تو کچھ وقت کا سہارا دے دو۔ ضرورت کی شدت کو کم کرو۔"
"ضرورت!"
کہہ کر وہ ہنسی۔ "وہ دیکھو! سامنے کی فٹ پاتھ پہ گھسٹتے ہوئے بھکاری کو بھی

ضرورت ہے۔ تلاش ہے۔ اور اس
نمائش زدہ بھوکے پاگل کتے کو بھی — تم
خوب صورت ہو۔ جوان ہو۔ اور
میرے پاس حسن ہے۔ پیسہ ہے "
تم بھاگ جاؤ میری آنکھوں کے سامنے
سے ورنہ۔ ... ورنہ، میں تمھارا گلا
گھونٹ دوں گا "
پاس سے گذرتا ہوا ایک بیرا ٹھہر
گیا۔ "کیوں بے۔ حرام کی روٹی کھا کے
غُراتا ہے "
پال اپنی بڑبڑاہٹ پر کچھ جھینپ
سا گیا۔ چہرے اور جسم کے متعدد حصوں پہ
اس کے سرخ، رسیلے ہونٹ چپکے ہیں۔ ہلکی
گہری ٹیس ابھی تک اٹھ رہی ہے۔
فرش پہ نشانات، فٹ پاتھ پہ
جمی ہوئی بوندیں کھلیاں۔ لال، الفانیت
کی سسکیاں۔ اب بھاگتے ہوئے قدموں
سے کچلے جا کر گرد میں کھو گئی ہوں گی۔
سُرخ ہونٹوں سے ایک کربہہ چیخ بلند
ہوئی تھی۔ اور پھر ایک جم غفیر تھا۔ بہت سی
آوازیں گونجنے لگیں۔
"مارو — مارو — یہ عزت کا
سوداگر ہے "
وہ آیا۔ خون اور دھول سے لپٹا
ہوا بدن اٹھاتے ہوئے بولا۔
"چلو سامنے ہوٹل میں!"
"وہ کون تھا؟"
"ایک بڈھا — چوتھی بلڈنگ کے
بائیں بازو والے بنگلے میں رہتا ہے "
گھن گرج سے پُر آواز سنتے ہی
پال باہر نکل آیا۔ آواز مدھم ہوتی جا رہی
تھی —

* * * * *

زندگی کے اس پل کے سامنے بھی ایک
چٹان۔ اس چٹان سے دھتکاری ہوئی
مفلوج زندگی کا ٹکرانا ایک چیلنج تھا۔
انتہائی کمزور چیلنج۔
پال ٹھہر گیا۔ لمحے چھوٹتے رہے۔
سرکتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹہ کا فاصلہ طے ہوا۔
پال نے پھر بجھی بجھی آنکھوں سے
جائزہ لیا۔ چٹان تنی کھڑی تھی۔ پائیں
باغ اور لان کے بعد پختہ عمارت۔ ایک
گمبھیر خاموشی۔ جانی پہچانی سی کسی پچھلے
زمانے کی۔ اس میں پال کا لمس ہوگا۔ زینے
اور کمروں کے فرش پر قدموں کے نشانات۔
ہاں یہ عمارت مختلف نہیں ہے۔ وہی
نقش و نگار، گیٹ کے سامنے کالا گلاب۔
شاید وہی دنیا ہے۔ کالی۔ گلاب
کی مانند کھلی ہوئی۔ یہاں پہ ایک انقلاب
آیا تھا۔
"اتار دو ان تاریک لبادوں کو۔
منتشر کر دو یہ شیرازے۔ یہ عمارت کالی
ہو چکی ہے۔ کبھی دیکھی ہے کھلی ہوئی
ان آنکھوں سے۔ مگر وہ آنکھیں ہیں
کہاں؟"
اس زمانے میں بھی پال اکیلا تھا۔
ممتا اور شفقت کے رشتے وقت کی ضرب
سے ٹوٹ گئے۔ ایک اکیلی جان شکست
کھا کر بہت دور چلی گئی۔
ہر سمت تاریکی۔ اُف یہ تاریکی!
ایک مخالف سمت ہے !!
ایک تنہا زندگی ہے !!!
لمحوں کی بارات نکل گئی۔
ایک گھنٹہ اور ہوا
پھر کئی گھنٹے گذرے
اور پھر
اندر کے وحشی کی چیخ بلند ہونے
پال پھر کر وحشی کا گلا دبانے لگا
ایک کرخت آواز گونجی۔
"پال! یہ بزنس مینوں کی دنیا ہے
یہاں دھرتی سے لے کر آکاش تک کی بزنس
ہے اور بزنس گھاٹے کا نام نہیں!۔ تم
یہیں نکل آؤ۔ ورنہ وحشی مر جائے گا۔ تحریک
ڈوب جائے گی۔"
تحریک ڈوب جائے گی" پال کے
کو جنبش ہوئی۔ اور وہ چونک اٹھا۔ پھر
ہوئی زندگی کو پکڑنے کے لیے دوڑا۔ چ
ٹکرایا اور پائیں باغ میں چہل قدمی کر
ہوئے بھاری بھرکم مہاتما جی کے وجود تک
پہونچا۔
"وہ کون تھا؟ کہاں گیا؟ وہی، ایک آ
انھوں نے سراپا کا جائزہ لیا پر وقار لہجہ
"وہ میرا آلۂ کار تھا۔ لیکن تم اگر
سکو گے۔ وہ رانچی کے پاگل خانے کی طرف
گیا ہے! — اور — اور تم بھی پاگل!

محمد اکرام اللہ خان

فلمنامہ

ہم سمجھتے تھے کہ آئی ایس جوہر کی شخصیت صرف فلمی دنیا ہی میں مقبول ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے ان کے کارناموں نے بعض سیاسی لیڈروں کی نیند حرام کر رکھی ہے فلم ہو یا سیاست جوہر کے لیے کوئی میدان ایسا نہیں ہے جو ناقابل تسخیر ہو۔ ویسے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ فلموں میں آنے سے قبل جوہر سیاست ہی سے وابستہ تھے۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے جوہر پنجاب کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ سیاسی جلسوں میں جوہر کی ظرافت سے بھرپور تقریریں ہنگامہ برپا کرتی تھیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد شرنارتھیوں کا جو قافلہ بمبئی پہونچا اس میں جوہر کے علاوہ بی۔ آر چوپڑہ بھی شامل تھے جوہر اور چوپڑہ صاحب کو صحافت سے خصوصی دلچسپی تھی اور چوپڑہ صاحب تو پنجاب کی صحافتی دنیا میں اچھا خاصا مقام بھی رکھتے تھے۔ بمبئی پہونچنے کے بعد جوہر نے رسائل کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کی۔ بی۔ آر چوپڑہ نے بمبئی کے ایک فینانسر کی مدد سے فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ اتفاق سے فلم کی کہانی جوہر کے قلم کی مرہون منت تھی۔ چوپڑہ صاحب کو کہانی پسند تھی اس لیے انہوں نے اس کو فلم کے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس فلم کا نام ہے "افسانہ" جس کی ریلیز نے آئی ایس جوہر اور بی آر چوپڑہ دونوں کی قسمت چمکا دی۔ جوہر کہانی کار کے علاوہ ہدایت کار بھی بن گئے اور ایک دو مزاحیہ فلمیں بھی بنا ڈالیں۔ ان کی شہرت سے متاثر ہو کر ہالی وڈ کی ایک فلم کمپنی نے انھیں انگریزی فلموں میں کام کرنے کا پیش کش کیا۔ ہالی وڈ میں بھی وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا نے میں کامیاب رہے۔ جوہر کے فلم بنانے کا انداز انوکھا ہوتا ہے ان کی فلمیں یا تو ہٹ ثابت ہوتیں یا پھر فلاپ! وہ ہمیشہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں انھوں نے "گوا" فلم اس وقت بنائی جبکہ گوا کو آزاد کرانے کی جد وجہد زوروں پر تھی۔ بنگلہ دیش کے قیام کے پس منظر نے انھیں "جے بنگلہ دیش" بنانے پر مجبور کیا۔ ایمرجنسی کے برخواست ہوتے ہی انھوں نے فلم "نسبندی" بنانے کا اعلان کر دیا جو ہنوز زیر تکمیل ہے۔ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد انہوں نے بھٹو کی زندگی پر مشتمل فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر کو انہوں نے فلموں میں کام کرنے کا پیش کش اس وقت کیا تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ہمراہ شملہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کشمیر آئی تھیں۔

غرض جوہر کی سیماب صفت طبیعت کب کونسا گل کھلائے گی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان دنوں ان کو راج نارائن سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی ہے وہ لوک سبھا کے انتخابات میں راج نارائن کے خلاف الیکشن لڑنے پر بضد ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے دہلی میں ایک پریس کانفرنس اور جلسہ کو مخاطب کیا تھا جس میں انہوں نے ایک شخص کو راج نارائن کے حلیہ میں پیش کر کے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اس فرضی راج نارائن کی وجہ سے اصلی راج نارائن کی جو مٹی پلید ہوئی ہے اس کا اندازہ خود راج نارائن کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے اخبارات میں شائع کروایا تھا۔

★

فلمی اداکاروں کی شخصیت ہی نہیں بلکہ ان کے شوق بھی نرالے ہوتے ہیں۔ امیتابھ نے فلم "دیوار" اور "زنجیر" میں ایک لمبی سی موٹر استعمال کی تھی جو جرمنی میں "فوکس ویگن" کہلاتی ہے۔ اس موٹر کے پچھلے حصے کو جس طرح چاہے استعمال کیا جا سکتا ہے چنانچہ امیتابھ بچن نے اس گاڑی میں صوفہ، میز، کرسی، پلنگ کے علاوہ ریفریجریٹر اور دیگر ضروری سامان بھی فٹ کروا لیے تھے۔ گویا گاڑی نہ ہوئی چھوٹا موٹا گھر ہو گیا جس میں آرام و آسائش کی ساری سہولتیں موجود تھیں امیتابھ کا دیکھا دیکھی دھرمیندر، شتروگھن سنہا، رشی کپور وغیرہ نے بھی ایسی ہی گاڑیاں خریدی ہیں اور اس میں ضروری سامان فٹ

کردار رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ان گاڑیوں کی حیثیت چلتے پھرتے مکانوں کی ہوگئی ہے اب سنا ہے کہ راکھی نے بھی ایسی ہی گاڑی خرید لی ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ راکھی اور گلزار کے درمیان اختلافات کی جو دیواریں کھڑی ہوئی تھیں وہ اب خود بخود ٹوٹتی جارہی ہیں۔

*

کشور کمار کا عشق آج کل پھر زوروں پہ ہے لینا چندا ورکر اور وہ دوسری مرتبہ چپکے سے ہندوستان کے باہر گئے ہوئے ہیں یوگیتا بالی سے طلاق کی کارروائی ابھی عدالت میں زیر دوراں ہے۔ ویسے لینا اور کشور کمار دونوں نے اس خصوص میں خاموشی اختیار کی ہے لیکن جو لوگ کشور کمار کے طریقۂ عشق سے واقف ہیں وہ صاف کہہ رہے ہیں کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ اگر کشور کمار کو کامیابی نصیب ہو جائے تو لینا چندا ورکر اس کی چوتھی بیوی ہونگی۔ ابھی حال ہی میں ایک ریکارڈ بنانے والی کمپنی نے کشور کمار کی پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر مبارکباد دیتے ہوئے ان کے پسندیدہ گیتوں کا ایک ریکارڈ ریلیز کیا تھا۔ لتا منگیشکر نے بھی اپنی پچاسویں سالگرہ منائی ہے حالانکہ دیکھنے میں وہ بہت کم عمر معلوم ہوتی ہیں۔ آشا بھونسلے اور آر ڈی برمن نے شادی کرکے ان افواہوں کو ختم کردیا جو ایک عرصہ دراز سے گشت کر رہی تھیں آشا بھونسلے کا جوان لڑکا جو آر ڈی برمن

(بقیہ :۔ صفحہ ۳۲ پر)

تماشائی

فلمی ڈائری

گذشتہ ماہ ۱۵ر اکتوبر کو فلم والوں کی نیشنل پارٹی کی اڈہاک کمیٹی کی ایک میٹنگ میں اداکار دیو آنند کو پارٹی کا صدر چنا گیا۔ جی پی سپی اور سری رام بوہرہ کو نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ دوسرے عہدیداروں کے انتخابات ابھی عمل میں نہیں آئے (دسمبر کے مہینے میں تشکیل پانے والی اس پارٹی کی ابتدائی تفصیلات گذشتہ مہینے کے شمارے میں دی گئی تھیں) اڈہاک کمیٹی کی اس میٹنگ میں دیو آنند نے کہا کہ وہ پوری تن دہی اور دلچسپی کے ساتھ پارٹی کے لیے کام کرے گا۔ فلم والوں کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی جو سماجی و سیاسی زندگی میں تعمیری رول ادا کرنا چاہتے ہیں نیشنل پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ دیو آنند نے بتایا کہ انتخابات کی تیاریوں کے سلسلے میں وہ لوگ جنگی خطوط پر کام کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اس نے نوجوانوں اور خصوصاً طلباء سے اپیل کی کہ وہ نیشنل پارٹی سے تعاون کر کے قومی تعمیر کی ذمہ داری کو پورا کریں۔

اس دوران نیشنل پارٹی نے انتخابی نشان الاٹ کرنے کے سلسلے میں جو درخواست چیف الیکشن کمشنر کے پاس دی تھی وہ اس بنا پر مسترد کر دی گئی کہ کسی بھی پارٹی کو انتخابی نشان صرف اسی صورت میں الاٹ کیا جاتا ہے جبکہ وہ انتخابات میں کم سے کم ایک فیصد ووٹ حاصل کرے۔ جی۔ پی۔ سپی نے الیکشن کمیشن کے اس فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ از کار رفتہ قانون کی بنیاد پر کیا گیا ہے اور اس طرح لاکھوں رائے دہندوں کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ پارٹی نے الیکشن کمیشن کو اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کے لیے درخواست دی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اگر الیکشن کمیشن اپنے فیصلے پر اٹل رہے تو نیشنل پارٹی اپنے جمہوری حق کے حصول کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔

ہندوستان میں دس ہزار کے قریب سینما گھر ہیں۔ ۲۰ لاکھ سے زیادہ آدمی کسی نہ کسی صورت میں اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ ۲۰۷ کروڑ سے زیادہ سرمایہ فلمی کاروبار میں مشغول ہے جہاں کالے دھن کی بھی کمی نہیں۔ ہر ہفتہ تقریباً ۸۰ لاکھ افراد فلمیں دیکھتے ہیں۔ فلمی ستاروں کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ہے۔

ان اعداد و شمار کے پیش نظر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیشنل پارٹی اگر انتخابات میں حصہ لے تو اسے نمایاں کامیابی ہوگی۔ جی۔ پی۔ سپی کا کہنا ہے کہ ان کی پارٹی کو چار سو کے لگ بھگ نشستیں حاصل ہوں گی۔ لیکن یہ اندازہ خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ خود فلم والوں کا کہنا ہے کہ نیشنل پارٹی میں جمہوری انداز میں کام نہیں ہو رہا ہے اور چند نا تجربہ کار لوگ اپنی من مانی چلا رہے ہیں۔ آپسی اختلافات سے ہٹ کر فلم اور سیاست کی دنیا میں جو فاصلہ ہے وہ بمبئی اور دلی کے درمیانی فاصلے سے کئی گنا زیادہ ہے اسے ایک چھلانگ میں طے کرنے کی کوشش خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مدراس کے سیاست دانوں کی مثال اس لئے نہیں دی جا سکتی کہ یہ لوگ فلم کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی بیس پچیس سال سے وابستہ رہے ہیں۔ بمبئی کے فلم والوں کے لیے اس دشت کی سیاحی اتنی آسان نہیں۔ سنیل دت سے جب نیشنل پارٹی کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ مجھے تو یہ سب تماشہ لگتا ہے یہی خیال اور دوسرے بہت سے فلمی ستاروں کا ہے۔ بہرکیف گھوڑا میدان سامنے ہے۔ دیکھیے فلمی گھوڑے اس میدان میں کتنا دم خم رکھتے ہیں۔

رشی کپور کشمیر میں فلم "قرض" کی شوٹنگ

کے دوران گھوڑے سے گرکر زخمی ہوگیا۔ اس کے جسم اور ہاتھ پر چوٹیں آئیں۔ فلم کے ایک نمائندے نے کہا کہ یہ چوٹیں بہت معمولی تھیں اور رشی کپور اب شوٹنگ میں حصہ لے رہا ہے۔ ہدایت کار سبھاش گھئی بھی ایسے ہی ایک حادثے سے دوچار ہوئے ہیں۔

★

فلم "کرانتی" کے متعلق جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ اس فلم کی کہانی ایک مرہٹے جنرل کانوجی کی زندگی پر تیار کی گئی ہے تو بمبئی کے دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی کانوجی کی زندگی کے متعلق مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے انداز میں اسے فلم کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں شیام بنیگل، منوہر مول گاؤنکر کی لکھی کانوجی کی سوانح حیات کے حقوق خریدنے کے چکر میں ہیں۔ وجے تنڈولکر نے بمبئی کی ایشیاٹک لائبریری سے وہ تمام کتابیں حاصل کر لی ہیں جو اس مرہٹے ہیرو کی زندگی سے متعلق ہیں۔

★

فلم "سرگم" کے پروڈیوسر ہیما مالنی کو تو اپنی فلم کی ہیروئن نہیں بنا سکے۔ اور بنا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ رشی کپور کے ساتھ اس کی جوڑی مناسب نہیں تھی لیکن انہوں نے جیا پردھا کے کردار کو جو اس فلم کی ہیروئن ہے "ہیما" کا نام دے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس فلم میں رشی کپور کا نام راجو ڈبری والا ہے۔ پندرہ سال پہلے "جس دیش میں گنگا بہتی ہے" میں راج کپور کا بھی یہی نام تھا۔

★

امجد خاں ویلن سے ہیرو بنا اب ہدایت کار کے روپ میں سامنے آ رہا ہے۔ نڈیاڈ والا نے اپنی نئی فلم کی ہدایت اس کے سپرد کی ہے۔

★

باکس آفس پر "جنون" کی ناکامی کے باوجود بھی ششی کپور نے اپنی دوسری فلم کی ہدایت کاری بھی شیام بنیگل کے حوالے کی ہے۔

★

ملیالم کی ایک فلم میں نہ صرف دو ہندی فلم کے ستاروں تنوجہ اور مدہو مالینی کو لیا گیا ہے بلکہ اس فلم میں دو ہندی گانے ہیں جن میں سے ایک محمد رفیع کی آواز میں ہے اور دوسرا یسوداس کی۔

★

فلم "علی بابا چالیس چور" کے ایک ہزار پرنٹس روس میں ریلیز کئے جا رہے ہیں یہ فلم ہند۔ روس اشتراک سے بنی ہے روسی زبان میں اس کی صرف ۱۳ ریلیں ہیں جب کہ ہندی میں یہ کافی طویل ہے۔ روس میں اسے پندرہ سرکاری زبانوں میں ڈب بھی کیا گیا ہے۔

★

برطانیہ کی ایک فلم کمپنی عیدی امین کی زندگی پر فلم بنا رہی ہے۔ یوگنڈا میں اس فلم کی شوٹنگ کے دوران اس کے ہیرو نے فلم ساز سے مطالبہ کیا کہ اس کے لیے مسلح باڈی گارڈ کا انتظام کیا جائے کیونکہ اگر یہاں کے عوام اسے اصلی و حقیقی عیدی امین سمجھ بیٹھے تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں۔

★

وہیشی بھٹ کی فلم "لہو کے دو رنگ" میں گل آنند خصوصی طور پر مختصر سے رول میں آتا ہے۔ لیکن اس کی اداکاری اتنی اچھی ہے کہ فلم فیر ایوارڈ کمیٹی اسے خصوصی انعام دینے پر غور کر رہی ہے۔

★

پروین بابی کی اچانک اور پر اسرار بیماری کی وجہ سے۔ جی۔ پی۔ سپی کی ملٹی اسٹار فلم "شان" کی شوٹنگ رکی ہوئی ہے اسٹوڈیو میں دس لاکھ کے خرچے سے بنا ایک شاندار سیٹ اس کا انتظار کر رہا ہے منوج کمار اپنی "کرانتی" کے لیے بھی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اسے پیلیا (عرقان) ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ اعصابی و دماغی انتشار کا شکار ہے بعض لوگ کہتے ہیں اسے جلدی بیماری ہو گئی ہے۔ جی۔ پی سپی جب اسے دیکھنے کے لیے گئے تو انہیں اس کے کمرے میں جانے سے یہ کہہ کر منع کر دیا گیا کہ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

بمبئی کے ایک فلمی ہفتہ وار کے بموجب دلیپ کمار کو بمبئی کا "شریف" بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ دلیپ کمار جہاں اداکاری کے میدان میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہیں سماجی و فلاحی کاموں میں بھی وہ سب سے آگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں یہ غیر معمولی اعزاز دیا جا رہا ہے۔ وہ ۲۰ ردسمبر کو اپنے اس عہدہ کا حلف لیں گے۔

*

پچھلے دنوں لاس اینجلیس میں محمد رفیع نے ایک دلکش موسیقی ریز پروگرام پیش کیا۔ اس موقع پر یہاں کے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی جانب سے ایک خیر مقدمی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ہیوی ویٹ چمپین محمد علی کلے نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور رفیع کی خدمت میں خیر مقدمی خطبہ پیش کیا۔

*

بمبئی کے ایک ہاسپٹل میں ۱۲ر اکتوبر کو مشہور کریکٹر اداکار سپرو کا انتقال ہو گیا ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ سپرو نے تقریباً ۲۰۰ فلموں میں مختلف کردار ادا کیے ہیں۔

بقیہ ـ فلمستان

سے کچھ ہی کم عمر ہے اب نئے میوزک ڈائرکٹر کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے۔ غرض فلم والوں کی یہ دنیا ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ امنگوں اور حوصلوں سے بھرپور۔ ■

ریلویز کی مدد کیجئے تاکہ وہ آپ کی بہتر خدمت کر سکے

صفائی : صفائی صحت اور مسرت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ صفائی کی عادت ڈالیئے۔ کوڑا کرکٹ، سنترے اور کیلے کے چھلکے، سگریٹ کے ٹکڑے اور ناکارہ غذا وغیرہ پھینکنے سے گریز کیجئے کیونکہ وہ مکھیوں اور چونٹیوں کو راغب کرتے ہیں جو بیماریاں پھیلانے کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کو پلیٹ فارمس پر فراہم کردہ کچرے دان ہی میں ڈالیے۔

تھوکنا : اسٹیشن پلیٹ فارمس پر جا بجا تھوکنا ایک گندہ اور غیر صحت مندانہ علامت ہے اس کے لیے تھوکدان کا استعمال کیجئے۔

ہماری مدد کیجئے تاکہ ہم اسٹیشنوں اور ریلوے ڈبوں کو پاک صاف رکھ سکیں۔

جاری کردہ

چیف پبلک ریلیشنز آفیسر

ساوتھ سنٹرل ریلوے

PUB/4/1/79/333

Registered with the Registrar of Newspaper-Registered No. 8285/64

HSE : 6 Phone : 52957

POONAM URDU MONTHLY

Office : **Azampura, Hyderabad-500 024** *Editor* : **Nasir Kurnooli,** M. A.

قیمت 1-25

اشاعت کا پندرھواں سال
جلد (۱۵)
شمارہ (۱۲)
ڈسمبر ۱۹۷۹ء
ایڈیٹر "ناصر کرنولی"

جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت

پونم

علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ
خط و کتابت کا پتہ
مینیجر ماہ نامہ "پونم"
16-7-300/1
اعظم پورہ، حیدر آباد ۲۴

زر سالانہ ۱۵ روپے | بیرونی ممالک
لائبریریز کیلئے ۲۰ " | ۲۵ شلنگ

ماہ نامہ پونم میں شائع ہونے والے مضامین، نام، واقعات، کردار اور مقامات سب فرضی ہوتے ہیں ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لیے پرنٹر، پبلیشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

ترتیب

مطبوعہ: دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار، حیدر آباد

بشیر انور

نصیر اختر صدیقی (مرحوم)

(چند یادیں۔ چند تاثرات)

لندن سے ایک بری خبر آئی کہ نوجوان ادیب، صحافی اور افسانہ نگار نصیر اختر صدیقی کا وہاں اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ منحوس خبر نصیر اختر صدیقی کے ارکان خاندان، رشتہ داروں، دوست اور احباب کے لیے تو یقیناً ایک سانحہ ہے لیکن اس سانحے سے دنیائے ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے پچھلی مرتبہ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے اپنے احباب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ ضرور ملیں گے اس بات کو بھی کئی برس گذر گئے اب نصیر اختر صدیقی کا پسندیدہ مصرعہ خود انہیں آواز دینے لگا تھا کہ ؎

چلے بھی آؤ کہ تیرا انتظار کب سے ہے!

لیکن ہمارا یہ انتظار، مدعا اور تمنائیں وجد کے اس شعر کی تفسیر بن گئے ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

نصیر اختر صدیقی کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ہندوستان کی آزادی سے قبل حیدرآباد کے شاہی نظام اور جاگیردارانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ وہ ایک قاضی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

لیکن ان کی افتاد طبع نے ماحول کی روایت پرستی کو قبول نہیں کیا اور بجائے اس کے کہ وہ خود بھی قاضی یا مشائخ بن جاتے، انہوں نے ترقی پسند ادبی تحریکات اور سیاسی نظریات سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا۔ یہ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے جبکہ ہمیں سیاسی آزادی ملے پانچ سال اور جاگیردارانہ نظام سے چھٹکارا پائے چار سال گزر چکے تھے حیدرآباد کے سیاسی اور معاشی محاذ پر افراتفری کا عالم تھا ایسے میں یہاں کے سراسیمہ لوگ پہلی بار جمہوریت کا تجربہ اور اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرنے جارہے تھے۔ پرانے شہر کے اس حلقے سے جہاں نصیر اختر صدیقی رہتے تھے ممتاز عوامی رہنما اور شاعر مخدوم محی الدین اسمبلی کی رکنیت کے لیے امیدوار تھے۔ امیدواری سے قبل مخدوم محی الدین تلنگانہ تحریک کے سلسلے میں عرصے تک روپوش رہے تھے اس کے بعد کے عرصے میں زیادہ جیل بھگت رہے تھے ہم ان کے متعلق سنتے تھے، اخبارات میں پڑھتے تھے، ان کی انقلابی شاعری سے متاثر تھے۔ حیدرآباد کے شب گزیدہ اور سیاسی تبدیلیوں سے متاثرہ عوام کو مخدوم محی الدین کی شکل میں ایک رہنما مل گیا تھا۔ گلی گلی میں شور تھا ؎

لو سرخ سویرا آتا ہے
لو سرخ سویرا آتا ہے

آزادی کا سورج تو طلوع ہوچکا تھا جو مجبور اور مظلوم عوام کے مسائل کا مداوا نہ کرسکا اس لیے "سویرا" کے بعد "سرخ سویرا" کی نوید عوام کے خوش آئند مستقبل کی نقیب بن کر فضاؤں میں گونجنے لگی۔ اس حلقے کے تعلیم یافتہ باشعور اور ترقی پسند نوجوان بھی پوری ذمہ داری دیانتداری اور تندہی کے ساتھ "سرخ سویرا" لانے کی مہم میں جٹ گئے۔ ہمارے کاروان میں نصیر اختر صدیقی کے علاوہ جہاندار افسر، وقار خلیل، امجد باغی، اکبر صدیقی (مرحوم) اور جلیل بھائی وغیرہ شامل تھے۔ جو پو پھٹتے ہی سرخ پرچم اٹھائے، انقلابی گیت گاتے اور نعرے لگاتے محلہ محلہ گھومتے۔ اس انتخابی مہم میں نصیر اختر صدیقی کے ساتھ کام کرنے اور ان سے قریب رہنے کا موقع ملا۔ مہینوں تک ہم لوگ صبح سے شام تک بستی بستی گھومتے، ایک ایک گھر پر آواز دیتے، ایک ایک فرد سے درخواست کرتے کہ "سرخ سویرا" لانے میں وہ ہماری مدد کرے۔ ہم میں سے بہت سوں کو اس وقت ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا اس کے باوجود بہترین معاشرے کی تشکیل کے لیے ہم اپنا جمہوری فرض پورا کررہے تھے۔

اس مقصد کے لیے نصیر اختر صدیقی کی سرشاری، اولوالعزمی، ترقی پسندی اور تندہی جائے حوصلے بڑھاتی۔ احساس کی شدت نے انہیں بھوک پیاس اور کوچہ نوردی کی تکلیف سے یکسر عاری کر دیا تھا۔ دن بھر گھوم پھر کر ہم اپنے غذائی پیکٹ لیے ملپورہ چمن میں نرم گرم ریت پر بیٹھ جاتے جہاں دن بھر کے کام کا جائزہ لیا جاتا۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ ادب اور سیاست پر بحثیں چھڑ جاتیں۔ نصیر اختر صدیقی ان بحثوں میں پیش پیش رہتے اور اپنی ہمہ دانی فہم اور ذکاء کے جوہر دکھاتے۔ بعد میں شعر و شاعری کا دور چلتا جس میں جاندار افسر اور وقار خلیل کلام سناتے اور بے تحاشہ داد پاتے۔ آخر میں نصیر اختر صدیقی سے فرمائش کی جاتی کہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار سنائیں۔ وہ فوری تیار ہو جاتے اور اپنے مخصوص ترنم میں اشعار، نظمیں اور غزلیں لہک لہک کے سنانے لگتے تان ہمیشہ اس مصرعے پر ٹوٹتی ؎

چلے بھی آ کہ ترا انتظار کب سے ہے

نصیر اختر صدیقی شاعر نہیں تھے لیکن انھوں نے شاعری کا اعلیٰ ذوق پایا تھا۔ بیسیوں معیاری اشعار انہیں ازبر تھے۔ ترقی پسند شعرا کی نئی نظمیں اور کلاسیکی شاعروں کی مقبول غزلیں انہیں یاد تھیں۔ فیض، مخدوم اور فراق ان کے پسندیدہ شعرا تھے۔ اپنا پسندیدہ کلام سنانے وہ ہمیشہ تیار رہتے۔ ڈوب کر لہک لہک کر فضا کو نغمہ ریز کرتے اور انتہائی کرب، یاس، و حرماں کے عالم میں یہ مصرعہ ضرور سناتے ؎

چلے بھی آ کہ ترا انتظار کب سے ہے

پتہ نہیں کہ نصیر اختر صدیقی کو کس کا انتظار تھا؟ وہ کونسے خواب تھے، تمنائیں تھیں، ارمان تھے یا پیکری وجود تھا، جس کے لیے وہ ہمیشہ بے چین و بے قرار رہتے ان کے لہجے سے تڑپ اور کرب کا احساس ہوتا۔ نہیں معلوم یہ ایک نسل کے احساسِ محرومی کی تڑپ تھی یا خود اپنی ذات کا کرب تھا یا ان اندھیروں کا درد تھا جو آزادی اور جمہوریت کے سورج کے گہنا جانے سے پھیلتے جا رہے تھے۔ بحثوں اور تقریروں کے علاوہ قلم کو بھی انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ صاحب کتاب "بننے کے لیے عمر نے تو وفا نہیں کی"، لیکن ان کے افسانے اور سیاسی، ادبی اور علمی مضامین مختلف رسالوں اور اخبارات میں محفوظ ہیں۔ اپنی تحریروں میں بھی نصیر اختر صدیقی نے ہمیشہ ترقی پسندی، انسانیت اور زندگی کے اعلیٰ اقدار کو ملحوظ رکھا۔ لندن میں لکھے گئے ان کے بیشتر افسانے جو ماہنامہ "شمع" اور "نُجوم" میں چھپ چکے ہیں، اردو افسانے میں گرانقدر اضافہ ہیں۔ اپنے احساسات کی ترجمانی صلاحیتوں کے اظہار اور ادیبانہ ذوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے پیشۂ صحافت کو اختیار کیا اور برسوں نوکِ قلم سے خونِ دل بکھیرتے رہے۔ سیاسی میدان میں جہاں وہ عوامی جمہوری محاذ اور متحدہ شہری کمیٹی سے منسلک رہے، وہیں ادبی محاذ پر وہ انجمن ترقی پسند مصنفین، عوامی ادبی سوسائٹی اور حلقۂ فکر و نظر سے وابستہ تھے۔

نصیر اختر صدیقی کی سیمابی صفتی نئے نئے افق کی تلاش میں رہتی۔ یہ بے چینی، بے قراری اور اضطراب ان کا مقدر بن چکے تھے۔ انہوں نے کئی مصروفیتیں اپنائیں پھر انہیں چھوڑ دیا۔ چھوٹے بڑے کئی اخبارات سے وہ منسلک رہے کئی رسالوں کی ترتیب کا کام کیا۔ پھر پیشۂ وکالت کو اپنایا لیکن جرم و سزا کا یہ ماحول بھی انہیں راس نہیں آیا۔ ان کے اضطراب نے اچانک اس بے حس، اپاہج اور پسماندہ معاشرے سے اپنا ناطہ توڑ لیا اور نسبتاً بہتر معاشرے میں خود کو adjust کرنے کی امنگ لیے وہ لندن چلے گئے۔ لندن جانے کے بعد کچھ عرصے تک وہ اپنے احباب سے منقطع رہے۔ غالباً نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ دوریوں کو خط و کتابت کے ذریعہ پاٹنے کی کوشش میں نصیر اختر صدیقی نے لندن سے جو طویل خطوط لکھے وہ اب ان کی جدائی کے بعد دوستی اور رفاقت کی یادگار بن چکے ہیں۔ یہ خطوط جہاں ادبی چاشنی، شگفتگی، برجستگی خلوص اور شعری لطافتوں کے حامل ہیں، وہیں ان سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ درد کا درماں، نقلِ مقام سے بھی ممکن نہیں۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ بھی کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ غالباً مغرب کے مشینی اور مادی معاشرے کے عفریت نے

نصیر اختر کو نگل لیا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے اس غریب الوطن دوست کو بھولتے جا رہے تھے کہ ایک دن اس کی آمد کی اطلاع ملی۔ مجسم شوق بن کر اور شکوے شکایتوں کے دفتر لیے گئے

پٹ جانے کی تمنا لیے اس تک پہنچے تو ایک اپاہج وجود کو دیکھ کر جھرجھری سی ہو گئی۔ وہ کسی طویل بیماری کے نتیجے میں چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ اس حالت میں بھی وہ بستر پر پڑے پڑے کسی نہ کسی موضوع پر بحث چھیڑ دیتے۔ یہ ہماری آخری ملاقاتیں تھیں نصیر اختر صدیقی جیسے آئے تھے ویسے چلے بھی گئے اس کے بعد خط و کتابت بھی نہیں رہی البتہ وہ کبھی حیدرآباد کے اخبار سیاست کے صفحات پر نمودار ہوتے اپنے مشاہدات کو قارئین تک پہنچاتے اور اپنے بالغ نظر وجود کا ثبوت دیتے۔ لندن میں ان کی مصروفیتوں کے سلسلے میں پتہ چلا تھا کہ وہ حالیہ عرصے میں ایک اہم موضوع پر پوری سرگرمی سے کام کر رہے تھے جس کے ذریعہ وہ ان صیہونی اور سامراجی عناصر کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے جو دنیا کی کئی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اسلامیات میں گھس کر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نصیر اختر کی افسوسناک جوانمرگی نے اس مجاہدانہ پراجکٹ کو ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

نصیر اختر صدیقی کا چراغ حیات گل ہونے سے قبل بھڑکا بھی تھا۔ چنانچہ اطلاع ملی تھی کہ وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہیں اور آسانی سے چل پھر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ امید بندھی تھی کہ وطن کی خاک کی کشش انھیں پھر کھینچ لائے گی

اور وہ پھر سے ملنے کا اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔ اچانک قضا نے انہیں آواز دی ؎

چلے بھی آؤ کہ تیرا انتظار کب سے ہے

اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس غریب الدیار صحافی، ادیب اور مخلص دوست نے اپنا سارا درد و کرب ہماری جانب پھینک دیا اور خود آسمانوں کی راہ لی۔ ■

نظمیں

سایوں کی لکیر

سید فیضی

وقت کا بوڑھا مسافر کب سے
راہ بے راہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور گزرتے ہوئے ہر لمحے میں
کوئی ان جان چبھن میرا کلیجہ چھلنی
کوئی بے نام جلن میرا جگر چھنکتا ہے
کوئی موہوم شکن میری جبیں کے اوپر
چھوڑ کر گردشِ ایام گئی تھی جس جا
تیری باہوں نے وہیں تھام لیا تھا مجھ کو

زندگی شرط ہے، ان لمحوں میں
کبھی سورج کی حسیں کرنوں سے
دھوپ بھی پڑتی ہے اور سائے بھی لہراتے ہیں

تو مرے دیدۂ پُر شوق کا آئینہ ہے
میں ترا عکس ہوں اور کچھ بھی نہیں
شام و سحر کی تصویر
ایک سایوں کی لکیر
چاند ابھرے تو یہی چاندنی بن کر لہرائیں
اور سورج کا عمل ہو تو اجالا بن جائیں

لغزشوں کے دائرے

قمر ہاشمی

ہر طرف سڑکوں کا سینہ شق
سیہ مٹی کے تودے راستہ روکے ہوئے
خامشی کے بھوت
اندھیروں کی تہوں میں ناچتے
نیم عریاں جسم ملبوسات کی تہمت اٹھائے
راستے کی ٹمٹماتی روشنی کے سائے میں
کچھ کاروباری عہد و پیماں
جاز کی ہلکی دھنوں میں دلفریبی کی کھٹک
اک گلی کے موڑ پر پائے سفر آشام بھی آہو خرام
مے گساری کا تکدّر — لغزشوں کے دائرے
درد کی رفتار کی مانند اک بے ربط زخمی چال
آدھی رات تک خاموش گلیوں کا طواف
کچھ دریدہ جھگیاں سوئے ہوئے ماحول کے دریا میں غرق
نیند سے بوجھل پپوٹوں کے لیے
سازِ نفس بھی طبلِ جنگ
سیٹیوں کی دور تک پھیلی صداؤں سے ہے
سناٹوں کا آنچل تار تار
ٹیکسیاں، رکشے، بسیں
ہر چیز خوابوں کے سمندر میں ہے غلطاں
شہر کی گردن میں تاریکی کی باہیں
بار کا بدمست چوکیدار
خالی بوتلوں کے ساتھ محوِ خواب ہے!

رؤف خلش

حساب، کون سا حساب

ثابت رات،
میرے حواس پر اُتر آئی
بکھرے دن کی دھجیاں سمیٹ کر
میں نے پیوند پیوند جوڑا

قرغل بنایا
جو ثابت نہیں تھا

اور روشنیوں کی تمام برہنگی
جسم کی آلودگیوں میں چھپالی

مجھے یہ اعجاز کہاں ملا
کہ مادر زاد اندھوں کو شفا دے دوں
یا مٹی کا پرندہ بناؤں
اس میں جان ڈال دوں

مکر و حیلہ پہن کر
ظاہری آنکھ نے بہت تماشے دیکھے
میں بھول نہیں سکا کہ

میرے پیدا ہونے پر
شیطان نے مجھے خوب بھا تھا
وہ میری رگوں میں لہو کا دھارا ہے
اور سمندروں پہ اپنا تخت بچھا کر
حکم دیتا ہے اپنی فوجوں کو گمرہی کا

میں تجھ سے پناہ طلب کروں خدایا!

تو مجھ سے حساب طلب نہ کر
کہ مجھے اپنے دوسرے عمر سے خوف آتا ہے
اور خوف کی کوئی منطق نہیں ہوتی!!

غیاث متین

ایک نظم

ا[illegible]وں کی جواں سیج تھا
روشنی پوچھتی ہے کہ میں
کیسے اندھا ہوا

میں تو اندھا ہی ٹھہرا، مگر
وہ جو بینا ہیں کیوں
رات رنگوں کو بھی
ایک ہی جانتے ہیں!

روشنی کل جہاں دھوپ تھی
آج سایہ بنی
کس کے پیروں سے چل کر
یہاں تک چلے آئے تم
رات کے ساتھ مجھ کو نکلنے کی خواہش
کتنی مہنگی پڑی ہے
کوئی سورج تمہارے بدن میں بھی پلنے لگا ہے
یہ زمیں،
ایک کانٹوں بھرا تاج کیوں بن گئی ہے؟

رشید انصاری (مترجم حافظ شیرازی)

رشید صاحب عربی، فارسی اور اردو کے متبحر عالم اور حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ہیں۔ آپ نے حافظ شیرازی کی غزلوں کو بہت عمدگی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ حافظ شیرازی کے علاوہ فارسی کے متعدد مشہور شعراء کے سینکڑوں اشعار کو آپ نے اردو اشعار کا لباس پہنایا ہے۔
ان منظوم ترجموں کے علاوہ رشید صاحب نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے آپ بہت پاکیزہ اور صاف ستھری زبان میں شعر کہتے ہیں۔ نمود و نمائش سے دور آپ پچھلے چالیس برس سے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ادارۂ "بزم" کی خواہش پر آپ نے ایک غزل عنایت فرمائی ہے جو نذرِ قارئین ہے۔ (ادارہ)

ہمارے اشکِ غم طوفاں سے ٹکرایا نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں، احسان جتلایا نہیں کرتے

خودی کا درس دیتا ہے مجھے کیا واعظِ ناداں
جنونِ عشق والے ہوش میں آیا نہیں کرتے

قمارِ عشق میں سودائے جاں بازی مبارک ہو
جو خود کھوتے نہیں کچھ بھی وہ کچھ پایا نہیں کرتے

کہا میں نے کہ تم اچھے ہو، وفا کرتے تو اچھا تھا
وہ پہلے مسکرائے، پھر یہ فرمایا نہیں کرتے

مری آوارگی سے دامنِ صحرا کو شکوہ ہے
کہ جب چادر ہو چھوٹی، پاؤں پھیلایا نہیں کرتے

مکررّ دید کے قابل نہیں وضعِ جہاں شاید
یہاں سے جانے والے لوٹ کر آیا نہیں کرتے

رشید اس سے نہ مانگو جو تمہیں دیتا ہے بن مانگے
سخی کے آگے ناداں، ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے

حافظ مترجمہ : سلیم طہرانی

محمد منظور احمد

اُس کے جلووں میں کھو گئے ہم بھی
یعنی دیوانے ہو گئے ہم بھی

تیرے کوچے میں جو نظر آیا
ساتھ بس اُس کے ہو گئے ہم بھی

کیسا نشہ ہے اُس سے ملنے میں
ہاتھ سے اپنے لو گئے ہم بھی

کچھ حسین وعدوں کی ملی سوغات
اس سے ملنے کو جو گئے ہم بھی

بزم میں اس کی کچھ کہا نہ سنا
ویسے کہنے کو تو گئے ہم بھی

بوجھ اور زندگی کا اے منظور
کس قرینے سے ڈھو گئے ہم بھی

غزلیں

رؤف خلش

کتنے ساحل پہ ہیں پیاسوں کے سفینے دیکھو
ہم تو صحرا سے چلے آئے ہیں پینے دیکھو

پردہ چھوڑا ہی نہیں، پانی کا یہ گھر ہے کھلا
بڑھ کے دہلیز تک آجاؤ تو زینے دیکھو

سیپیاں، ریت کی زنجیر، چمکتے وہ سراب
کیوں سمندر ہمیں دیتا نہیں جینے دیکھو

اڑتی مرغابیاں، دھوپوں کے کھلاتی ہیں چمن
برف زاروں کے بھی چھوٹے ہیں پسینے دیکھو

نیلے دریا کے تموج نے ابھارے ہیں حباب
تم جواں ہو تو دھڑکتے ہوئے سینے دیکھو

بادبانوں کو دکھاتی ہیں شبوں میں راہیں
آنکھیں جلتی ہوئی رکھدی ہیں کسی نے دیکھو

ہم تو مٹی سے بنے، مٹی میں جلنے والے
گھل کے پانی میں خلش آبی دفینے دیکھو

غیاث متین

کشتی کے ساتھ وہ بھی گیا، ڈھونڈتے ہو کیوں
ساحل کے آس پاس سدا گھومتے ہو کیوں

اڑ جاؤ شاخ سے کہ وہ موسم نہیں رہا
سوکھا ہے پیڑ، تیز ہوا، جھولتے ہو کیوں

آنکھوں میں ہے وہ راستہ کب سے کھلا ہوا
پلکوں پہ رک کے اس کا پتہ پوچھتے ہو کیوں

منظر بدل نہ جائے کہیں، اتنی دیر میں
دیکھو سفر تمام ہے اب اونگھتے ہو کیوں

ہم کو تو اپنے ہونے پہ شرمندگی سی ہے
تم کاغذی لباس ہو، یوں چھو لیتے ہو کیوں

علی الدین نوید

لمحوں کو سوئیوں پہ چڑھاتا ہوں رات بھر
آبِ رواں پہ نقش بناتا ہوں رات بھر

سورج کے غم میں اشک بہاتا ہوں رات بھر
مرحوم دن کا سوگ مناتا ہوں، رات بھر

جیسے خلا زمیں پہ نہیں آسماں پہ ہے
کچھ یوں دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں، رات بھر

کاغذ کی ایک ناؤ بناتا ہوں شام تک
کالے سمندروں میں چلاتا ہوں رات بھر

افسانۂ حیات، میں خود اپنے آپ کو
عنواں بدل، بدل کے سناتا ہوں رات بھر

تنہائیوں کی جھیل کے پہلو میں بیٹھ کر
زخموں کی چاندنی میں نہاتا ہوں رات بھر

★

مشفق خواجہ

پھر ذہن میں ابھرے وہی یادوں کے دھندلکے
پھر درد سے لبریز ہوئے شعر غزل کے

پھر دل کو ملی اک غمِ تازہ کی رفاقت
بیتے ہوئے غم تازہ ہوئے روپ بدل کے

اک لمحۂ جاں بخش کا فیضان ہے یہ بھی
دل خاک ہوا آگ میں خود اپنی ہی جل کے

بیگانہ روی اس کی ہے، تنہا روی میری
کیا دل کو ملا شوق کی راہوں پہ بھی چل کے

آگاہ کیے جو مرے احوال سے مجھ کو
ایسا بھی کسی آنکھ سے آنسو کوئی ڈھلکے

بکھرے ہوئے خوابوں کو سمیٹوں تو یہ سوچوں
کیوں فاصلے بڑھتے ہی گئے فکر و عمل کے

اک شخص خوش انفاس کے احساں ہیں کیا کیا
جو بات بھی ہوتی ہے سو لہجے میں غزل کے

جمیل نقوی

جانے کیسے طے ہوگا زیست کا سفر تنہا
عشق ہے اِدھر تنہا، حسن ہے اُدھر تنہا

دل کو ڈسنے لگتی ہے شام ہی سے تنہائی
ہے اگر یہی حالت ہو چکی سحر تنہا

کتنی دل نشیں یادیں آس پاس رہتی ہیں
باوجود تنہائی دل نہیں مگر تنہا

دیکھیں کون ہوتا ہے اب رفیقِ تنہائی
گھوم کر پلٹ آئی بزم سے نظر تنہا

یاد کے دھندلکوں میں رات یوں گذرتی ہے
جیسے جلتی رہتی ہے شمع رہگذر تنہا

گو ہجوم ہے ہر سو، زندگی کے میلے میں
ہم نے خود کو پایا ہے پھر بھی بیشتر تنہا

عمر بھی اک حقیقت ہے اے جمیل سوچو تو
دل کو کیا سکوں دے گی عظمتِ ہنر تنہا

مرتضیٰ برلاس

اپنا تو بس کام یہی ہے سب کے غم اپناتے رہنا
ناخن زخمی کرتے رہنا، ہر گتھی سلجھاتے رہنا

جانا ہے تو شوق سے جاؤ دور نگر آباد کرو
وقت ملے تو گاہے گاہے خوابوں کو مہکاتے رہنا

آج یہ جن دیواروں کو تم اونچا کرتے جاتے ہو
کل کو ان دیواروں سے پھر اپنا سر ٹکراتے رہنا

ہم ہیں وہ آواز جو گھٹ کر ساری فضا میں گونجیں گے
بعد ہمارے آوازوں کو زنجیریں پہناتے رہنا

لوگ تو تم کو بادل سمجھیں، پانی کی امید کریں
اور تمھارا کام ہمیشہ پتھر ہی برساتے رہنا

ہم تو ہیں بس شام کا دیپک اولِ شب بجھ جائیں گے
تم ہی یارو آخرِ شب تک دیپ سے دیپ جلاتے رہنا

مستنصر مسعود

(کہانی)

عزیز از جان

قدیم فلورنس میں فیڈریگو نامی ایک نوجوان رہا کرتا تھا وہ ایک ہمہ صفت شخص تھا۔ خوبصورت خوش مزاج، طبیعت کا سخی، فنونِ حرب کا ماہر، محفلوں کا شوقین، شکار کا ماہر، کونسی خوبی تھی جو فیڈریگو میں نہ تھی۔ شہر بھر میں اُس کا چرچا تھا، شہر کی ہر خوبصورت اور نوجوان عورت اس کے بازوؤں میں آنے کی خواہش مند تھی، فیڈریگو کی طبیعت بھی رومان پسند تھی۔ چنانچہ اس کی بہادری اور دوسری خوبیوں کے قصوں کے ساتھ ساتھ اس کی محبتوں کی کہانیاں بھی عام تھیں۔

لیکن ایک روز نیزہ بازی کے ایک مقابلے میں تماشائیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی اسے ایک ایسی عورت نظر آئی جس کا حسن بے مثال تھا اور بدن کسی یونانی دیوی کی مانند تناسب کے اعلیٰ ترین سانچے میں، مرمریں ڈھلا ہوا۔ فیڈریگو اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بس ایک ساعت کے لیے فیڈریگو کی نظر اس پری جمال کے حسن بے مثال پر پڑی اور اسے ہمیشہ کے لیے دیوانہ کر گئی۔ اسی ساعت دوسری تمام عورتیں اُس کے ذہن اور دل سے نکل گئیں اور وہ عورت جس کا نام مونا گیووانا تھا۔ اس کی آرزوؤں کا مرکز بن گئی۔

لیکن جب فیڈریگو نے ایک بوڑھی عورت کے ذریعے اسے اپنی محبت کا پیغام بھیجا تو جواب مایوس کن تھا۔ اس زمانے کے فلورنس میں مرد ہی نہیں، ہر عورت بھی دل پھینک تھی۔ رومان فضا میں رچا ہوا تھا۔ معاشقے زندگی کا معمول تھے۔ کسی بھی عورت کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ خاوند کے ساتھ وفاداری کی زندگی گزار رہی ہے اور اسے کوئی چاہنے والا ہی نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ معزز اور متمول گھرانوں کی حسین عورتوں میں عاشقوں کی تعداد بتانے اور معاشقوں کی داستانیں سنانے کا رواج تھا، اور ہر عورت فخریہ بیان کرتی کہ اُس کے حسن نے کتنے مردوں کو گھائل کیا۔

فیڈریگو کی بدقسمتی کہ جس عورت پہ اُس کا دل آیا۔ وہ ایک مختلف عورت نکلی، وہ پاکباز تھی اور وفاشعار بھی، یہ ایسی خوبیاں تھیں جنھیں اُس زمانے کی عورتیں خامیاں خیال کرتی تھیں۔ بہرحال فیڈریگو نے حوصلہ نہ ہارا۔ اُسے اعتماد تھا کہ اُس کا عشق صادق ہے اور وہ بالآخر کامیاب ہوگا سو اسی یقین کے ساتھ اُس نے دعوتوں، ہنگاموں اور مقابلوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ہر محفل میں مونا گیووانا اور اس کے خاوند کو مدعو کیا جاتا۔ ہر مقابلے میں فیڈریگو فنونِ حرب میں اپنی مہارت کا ایک نیا ثبوت پیش کرتا شعر و سخن کی محفل اور رقص و موسیقی کی بزم میں اُس کا نام فنونِ لطیفہ کے مربی کی حیثیت سے ادب کے ساتھ لیا جاتا۔ کبھی وہ شکار کا اہتمام کرتا اور نشانہ بازی کا ایسا مظاہرہ کرتا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے اور شکار پر ساتھ جانے والے روسا اور امراء عش عش کر اٹھتے مگر اس کی خوبیوں کی تمازت مونا گیووانا کے دل کے برف کو نہ پگھلا سکی۔ محبت نے فیڈریگو کے ہر ہنر کو صیقل کر دیا۔ مگر دل کا زخم مندمل ہونے کی بجائے بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔

ہنگاموں کی اس زندگی اور محبت کے لیے کامرانی کی تلاش میں فیڈریگو نے خود کو اور اپنے وسائل کو اس بے دردی سے خرچ کیا کہ اُس کی ساری دولت لٹ گئی۔ ایک روز اسے احساس ہوا کہ اب وہ فلورنس کا کوئی رئیس نہیں بلکہ ایک معمولی آدمی ہے جس کے مالی وسائل سابقہ انداز میں زندگی گزارنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کے پاس تھوڑی بہت زمین باقی تھی، جس کی آمدنی گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی۔ فیڈریگو حساس طبع شخص تھا۔ جس شہر میں وہ مسند نشین رہا تھا۔ وہاں ایک عام آدمی بن کر رہنا اسے گوارا نہ تھا جہاں وہ ہنگاموں کا مرکز رہا تھا، وہاں خود ہجوم میں کیسے شامل ہو جاتا۔ پھر فلورنس میں رہتا تو شہر کے لوگ اس سے انہی ہنگاموں کے اہتمام کی توقع کرتے جنھوں نے اُسے شہر کی سماجی زندگی کی ایک اہم

شخصیت بنا رہا تھا۔ اب ایسا کرنا اُس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ سو اُس نے شہر کی ہنگامہ آرائی پر اپنی مختصر جاگیر کی رہائش اور تنہائی کی زندگی کو ترجیح دی۔ وہاں وہ سب سے دُور الگ تھلگ رہتا۔ گزشتہ زندگی کو یاد کرتا تو اس کے دل میں کوئی حسرت نہ ہوتی، مونا گیووانا کو پانے کی تمنا البتہ اب بھی موجود تھی مگر اسے احساس تھا کہ زندگی کا یہ ایک خواب اب ہمیشہ ادھورا رہے گا۔

تنہائی کی اس زندگی میں اُس کا فقط ایک ساتھی تھا، ایک باز جو پرانے دنوں کی تنہا یادگار تھا۔ یہ پالتو باز پہلے بھی اُسے بہت عزیز تھا، اب تو فیڈریگو کا سارا وقت اس کے ساتھ گزرتا۔ باز کو بھی شاید اپنے مالک کی تنہائی کا احساس تھا۔ وہ بھی فیڈریگو سے کسی لمحے جُدا نہ ہوتا۔ وہ باز تھا بھی خوب صورت اور بہت سدھا ہوا شکار۔ کے زمانے میں وہ تیر کھائے ہوئے پرندے کو فضا میں اُچک لیتا تھا۔ ایسا سُبک پرواز کہ نگاہیں ساتھ نہ دے سکیں۔ اور ایسا سمجھ دار کہ اپنے مالک کے بدلے ہوئے حالات میں اُس سے اس قدر اور اس طرح پیار کرتا جیسے اس کی دلجوئی کر رہا ہو۔ اس مختصر سی جاگیر پر فیڈریگو اپنے پالتو باز اور ایک بوڑھی خادمہ کے ساتھ زندگی کے دن خاموشی سے گزار رہا تھا۔

ادھر مونا گیووانا کے حالات نے بھی پلٹا کھایا۔ شوہر مختصر بیماری کے بعد وفات پا گیا۔ وصیت کے مطابق اُن کا اکلوتا بیٹا جائیداد کا تنہا وارث تھا خاوند کی موت کے بعد شہر پرست مونا کو شہر میں کوئی دلچسپی نہ رہی اور وہ بھی فلورنس کو خیرباد کہہ کر اپنی جاگیر پر آ گئی جو اتفاق سے فیڈریگو کی زمینوں کے قریب ہی تھی۔ مونا پہلے اگر وفا شعار بیوی تھی تو اب انتہائی شفیق ماں تھی۔ وہ اب بھی جوان اور حسین تھی۔ بیٹے کے منہ سے بات نکلنے کی دیر ہوتی، مونا کی طرف سے اُسے پورا کرنے میں کبھی تاخیر نہ ہوتی۔

اکثر بیٹا اپنے شکاری کتوں کو لے کر گھڑسواری کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات فیڈریگو سے ہوئی۔ فیڈریگو کا باز اس کے نوجوان دل کو بھا گیا۔ فیڈریگو کو اپنی گوشہ نشینی میں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ لڑکا کون ہے اور لڑکے کو تو بہرحال یہ خبر نہ تھی کہ فیڈریگو کبھی فلورنس کا ایک رئیس تھا جو اس کی ماں کے عشق میں ناکام ہوکر، جائیداد لٹانے کے بعد یہاں وقت گزار رہا ہے۔ بہرحال دونوں میں دوستی ہو گئی۔ مونا گیووانا کا بیٹا اکثر فیڈریگو کے پاس آ جاتا اور گھنٹوں وہیں رہتا۔ اس کا زیادہ تر وقت باز کے ساتھ کھیلنے میں گزرتا۔

تھوڑے ہی عرصے میں اسے باز سے اتنی ہی محبت ہو گئی جتنی کہ فیڈریگو کو تھی۔ پھر اچانک وہ بیمار پڑ گیا۔ اور بیماری بھی ایسی کہ ڈاکٹر اور حکیم جواب دے گئے۔ ماں نے اُس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ دن بدن اُس کی حالت گرتی گئی۔ مونا نے کئی بار بیٹے سے پوچھا کہ اسے کوئی غم تو نہیں؟ اس کے دل میں کوئی خواہش تو نہیں؟ وہ ہر مرتبہ خاموش رہتا۔ مگر ایک دن جب وہ سخت بیمار اور ہذیان کے عالم میں تھا اس نے مونا کو بتا دیا کہ اُسے فیڈریگو کا باز بے حد پسند ہے۔ اُس نے ماں سے پوچھا "کیا آپ وہ باز مجھے لے کر دے سکتی ہیں؟"

ماں کیا جواب دیتی؟ اُسے فیڈریگو کی محبت اچھی طرح یاد تھی اُسے اپنی سرد مہری کا احساس بھی تھا۔ اسے علم تھا کہ فیڈریگو اُس کے عشق میں رئیس سے گدا بن گیا۔ وہ شخص جو ہنگاموں کا مرکز اور محفلوں کی جان ہوتا تھا، کیسے تنہائی میں دن گزار رہا تھا۔ کئی برسوں کے واقعات چند لمحوں میں اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے سابقہ رویے کے پیشِ نظر وہ فیڈریگو کے پاس کیوں کر جا سکتی ہے، مگر پھر ہر احساس پر ماں کی محبت غالب آ گئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی انا کو بیٹے کی خواہش پر قربان کر دے گی۔ اس نے بیٹے سے کہا، تم فکر نہ کرو، میں سینور فیڈریگو سے ان کا باز تمہارے لیے مانگ لاؤں گی یہ سنتے ہی بیٹے کے چہرے پر رونق آ گئی اور ذرا دیر میں اُس کا حال بہتر ہونے لگا۔

دوسرے روز صبح ہونے کے کچھ دیر بعد مونا گیووانا نے ایک بوڑھی ملازمہ کو ساتھ لیا اور فیڈریگو کے گھر پر دستک دی۔ وہ اپنے پائیں باغ میں باز سے کھیل رہا تھا۔ بازو کے ایک جھٹکے سے باز کو اُڑاتا اور باز پلک جھپکتے میں فضا کی وسعت میں گھوم کر واپس اپنے مالک کے بازو پر آ بیٹھتا دستک سن کر بازو پر باز سجائے ہوئے فیڈریگو نے خود دروازہ کھولا۔ مونا گیووانا

کو وہ پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ اسے بھول سکتا ہی کب تھا؟ فیڈریگو اُس کو اپنے گھر میں موجود دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ ہو گیا جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ بمشکل اس نے خود پر قابو پایا اور اپنی حسین مہمان کو گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔

مونا گیو وانا نے اُس سے کہا "فیڈریگو شاید تم کو معلوم ہو کہ میں بھی یہاں قریب ہی آ گئی ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ ماضی میں، میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب میں اس احساس اور خواہش کے ساتھ آئی ہوں کہ اگر ممکن ہو تو کسی حد تک اپنے سابقہ رویّے کی تلافی کر سکوں۔ تم نے میری محبت میں خود کو تباہ کر لیا۔ مگر میں خاموش رہی۔ تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکی۔ اگر تمہارے دل میں اب بھی میرے لیے کوئی جذبہ ہے تو شاید یوں بن بلائے میرا آ جانا تمہیں ناگوار نہ گزرے گا!"

"ناگوار" فیڈریگو نے کہا۔ "اس ایک لمحے کے خواب میں تو میں نے عمر بسر کر دی۔ آپ کا یہاں آنا میرے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جس کے لیے میں ہزار بار بھی زندگی تباہ کرنے سے گریز نہ کروں گا مجھے یقین ہے کہ آپ آئی ہیں تو کچھ دیر قیام بھی کریں گی۔"

مونا گیو وانا نے کہا "میں اسی امید سے آئی تھی کہ آپ مجھے خوش آمدید کہیں گے اور اپنے ساتھ کچھ وقت گذارنے اور دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت دیں گے۔"

"تشریف لائیے" فیڈریگو نے کہا: "آپ کی مدارات میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہو گی۔"

فیڈریگو مونا اور اس کی خادمہ کو ساتھ لیکر باغیچے میں پہنچا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ آ گیا ہو۔ مونا گیو وانا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے اپنی خود غرضی پر بے حد افسوس ہوا۔ لیکن ساتھ ہی اسے پہلی مرتبہ فیڈریگو کی محبت، اُس کی بے لوث چاہت کا یقین بھی آ گیا۔ وہ محبت جو مدتوں اسے متاثر نہ کر سکی اب چند لمحوں میں اس کے سارے وجود کو پگھلا گئی تھی۔ اس کا اپنا دل فیڈریگو کے لیے محبت سے لبریز ہو گیا۔ اس لمحے اُسے احساس تھا کہ یہ اُن دونوں کی پہلی ملاقات ضرور ہے آخری ہرگز نہیں۔

فیڈریگو انہیں باغیچے میں بٹھا کر خود گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مونا گیو وانا کی آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ کئی پرانے زخم یک لخت ہرے ہو گئے تھے۔ وہ خواہشیں جنھیں نامرادی کے احساس نے راکھ کر دیا تھا، اب پھر بھڑک اٹھی تھیں۔ ساتھ ہی اُسے اپنی بے مایگی کا احساس بھی تھا، اس کے گھر ایک ایسا مہمان آیا تھا جس کی ایک لمحے کی رفاقت اس کی ساری زندگی سے زیادہ قیمتی تھی اور اس کے پاس اس مہمان کی تواضع کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ بہر حال اس نے اپنے تمام وسائل یکجا کیے، خادمہ کو کھانا تیار کرنے کی ہدایات دیں اور خود میز سجانے میں مصروف ہو گیا اس کی محبوبہ پہلی بار اُس کے گھر آئی تھیں مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ یہ وقت اس کی قربت میں گزارے۔ مونا گیو وانا اپنی خادمہ کے ساتھ باغیچے میں بیٹھی رہی اور وہ خود بیک وقت مسرور اور مردہ اُس کی مدارات کا اہتمام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا اور اس نے اپنی حسین مہمان کو اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

تنگ دستی کے باوجود فیڈریگو نے اپنی محبوبہ کے شایانِ شان ضیافت کا اہتمام کر لیا تھا اس کا دل ہی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے کیسے کیا، مگر میز سج گئی تھی اور اُس پر قابوں میں چنے ہوئے لذیذ کھانے فیڈریگو کے حسین مہمان کے منتظر تھے۔ اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد مونا گیو وانا نے پوچھا کیا آپ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے؟ فیڈریگو نے جواب دیا کہ اس کی یہی خوش نصیبی کیا کم ہے کہ مونا اس کے گھر کھانا کھا رہی ہے، اُس نے کہا کہ اتنی بے پایاں مسرت اور اتنے بڑے اعزاز کے بعد اُسے کوئی خواہش کوئی اشتہا نہیں رہی!

مونا گیو وانا کھانا کھاتی اور کھانے کی تعریف کرتی رہی اور فیڈریگو دست بستہ ملازموں کی مانند اس کی گفتگو سنتا اس کے اشاروں کا منتظر رہا۔ کبھی ایک قاب اس کے آگے بڑھاتا کبھی دوسری۔ کبھی شراب سے اس کا جام بھرتا۔ کبھی حیرت سے اسے دیکھتا اور اپنی خوش قسمتی پہ ناز کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد مونا نے ایک بار

پھر اُس سے کہا کہ وہ کم از کم شراب میں تو اس کا ساتھ دیئے۔ "یہ میری درخواست ہے۔"

فیڈریگو کے لیے یہ حکم تھا، وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران بھی اپنی آمد کا مقصد مونا کے ذہن میں تھا اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر شرمندہ ہو رہی تھی کہ اپنی آمد کے اصل مقصد سے فیڈریگو کو کیسے آگاہ کرے لیکن پھر بیٹے کی محبت اور اس کی بیماری کے خیال نے اسے مجبور کر دیا، بالآخر اس نے کہا "سینور فیڈریگو، آپ جانتے ہیں میرا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ ان دنوں بہت بیمار ہے۔"

فیڈریگو نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے مادام۔"

مونا گیوووانا نے بدقت اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اس نے کہا۔ "وہ آپ کے پاس اکثر آیا کرتا تھا۔ بیماری سے قبل وہ یہاں آکر دیر تک آپ کے خوبصورت اور سدھے ہوئے باز کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اُسے آپ کے باز سے بہت محبت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم اس کی بیماری کا علاج نہیں کر پاتے۔ خود اس کی خواہش ہے کہ آپ کا باز اُسے کسی نہ کسی طرح مل جائے۔ باز کے ذکر ہی سے اس کا حال بہتر ہو جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے حاصل کر کے وہ ضرور تندرست ہو جائے گا۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق تو نہیں۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے اس کے پیشِ نظر آپ میری درخواست رد نہیں کریں گے۔"

فیڈریگو نے کوئی جواب نہیں دیا پھر سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر بے انتہا درد اور بے حساب تاسف تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا نظر آنے لگا۔

مونا نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، مجھے علم ہے کہ وہ باز آپ کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اسے آپ سے ہرگز نہ مانگتی۔ مگر میرے بیٹے کی زندگی کا دار و مدار اس ایک خواہش کی تکمیل پر ہے، میری التجا ہے کہ آپ یہ باز میرے بیٹے کو دے دیں۔ آپ کا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔"

فیڈریگو نے بڑی کوشش سے اپنا سر اُٹھایا اور مونا گیوووانا کی طرف تھکی ہوئی مایوس اور اشک آلود نگاہوں سے دیکھا پھر اُس نے شکستہ آواز میں کہا۔ "میں بھی کس قدر بدقسمت ہوں کہ میری عزیز ترین ہستی نے زندگی میں پہلی بار مجھ سے کوئی چیز مانگی مگر میں اس کی خواہش پوری کرنے میں قاصر ہوں۔"

فیڈریگو نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر مونا گیوووانا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "مادام آپ جانتی ہیں کہ میرے حالات پہلے جیسے نہیں رہے اب میں ایک غریب آدمی ہوں۔ آج آپ نے میرے گھر میں قدم رکھا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ناداری کے باوجود میں نے چاہا کہ آپ کی خاطر میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ مگر بدنصیبی کہ میرے پاس آپ کے شایانِ شان تواضع کے لیے کچھ نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر فیڈریگو پھر خاموش ہو گیا اور اُس نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے پاس بس ایک باز رہ گیا تھا۔ وہی بھون کر کچھ دیر پہلے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اب تو صرف باورچی خانے میں اُس کے پر بکھرے پڑے ہوں گے۔" ■

ارشادِ مرتضیٰ علی!

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسین علیہ السلام کو ہدایت دیتے ہیں کہ جو مذہب کے معاملے میں آپ کے ہم خیال نہیں۔ لیکن احتیاط کرنا! ایسی گفتگو نہ کرنا جس سے کسی کی دل شکنی اور رنجش ہو!

فرحت فاطمہ

(کہانی)

ماں

دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے کالی ساڑی میں ملبوس ایک نہایت خوب صورت، سرو قامت جوان لڑکی کھڑی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کا جادو تھا۔ میرے کمرے میں آکر اُس قیامت نے کہا۔ "آپ کے پاس وجے کا فون آیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں! آپ کامنی دیوی ہیں؟" میں کچھ ہڑبڑا گیا۔

وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "کامنی دیوی نہیں، صرف کامنی۔ اور ویسے مجھے سب منی کہہ کر پکارتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ صوفے پہ بیٹھ گئی اور میرے سامنے دونوں ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"پہلے آپ کون سا ہاتھ دیکھیں گے؟ دایاں یا بایاں؟ سُنا ہے عورتوں کا پہلے بایاں ہاتھ دیکھا جاتا ہے۔"

میں نے ایسے خوبصورت ریشم کی طرح ملائم ہاتھ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

محدب شیشے کی مدد سے میں اُس کے ہاتھ کی ریکھائیں پڑھنے لگا اور وہ بےخبر سی کھڑکی سے باہر سمندر کی اُچھلتی ہوئی لہریں دیکھنے لگی۔ میں نے اُس کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ہاتھ میں رومانس کی بڑی گہری اور لمبی لکیر ہے اور دولت کا اُبھار تو کمال کا ہے اور......"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی "آپ مجھے سیدھی اور صاف باتیں بتائیں۔ پہیلیاں نہ بجھوائیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی میں تین بار رومانس ہے۔"

"کب ہوگا تین بار رومانس؟" وہ بولی۔

"آپ کا پہلا رومانس اٹھارہ برس کی عمر میں ہوگا۔ دوسرا انیس برس کی عمر میں اور تیسرا..."

وہ بیچ ہی میں بول پڑی۔ "دیکھئے میری عمر اس وقت اکیس (۲۱) برس ہے اور میں آج تک چھ بار رومانس کر چکی ہوں یا ہو چکا ہے۔ میرا پہلا رومانس سولہ برس کی عمر میں میرے ایک کلاس فیلو سے ہوا تھا جو بعد میں موٹر سائیکل کے حادثے میں مر گیا۔ دوسرا رومانس سترہ برس کی عمر میں اپنے سنگیت کے ماسٹر سے ہوا تھا جو بعد میں پاگل ہو گیا۔ تیسرا رومانس فلموں کے مشہور پروڈیوسر منگت بھائی سے ہوا تھا۔ جب میں اٹھارہ برس کی تھی۔ منگت بھائی کہتے... [illegible]

منگت بھائی کہا کرتا تھا کہ اُس نے میری جیسی جذباتی کلاکار پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ آج کل منگت بھائی چوپاٹی پہ بھیل پوری بیچتا ہے۔ کبھی کبھی اب بھی میں اُس کے پاس بھیل پوری کھانے جاتی ہوں۔ میرا چوتھا رومانس انیس برس کی عمر میں ایک ہیرو کے ساتھ ہوا تھا جو فلموں میں آنے سے پہلے گورکھپور میں نائی تھا۔ میرے ساتھ رومانس کے بعد اُس کی مارکیٹ گر گئی۔ آج کل وہ گنجے ایکٹروں کے لیے مردہ عورتوں کے بالوں سے "وِگیں" بناتا ہے۔ میرا پانچواں رومانس بیس سال کی عمر میں ایک ساٹھ برس کے کروڑ پتی امریکن سے ہوا جو رومانس شروع ہونے کے چھ دن کے اندر ہی ختم ہو گیا۔" وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ گلاس سے پانی کے چند گھونٹ پیئے۔ پھر کہنے لگی۔ "اور آج کل میرا رومانس مہارشی برہم چاری گُرو آنند سے چل رہا ہے۔ یہ جو آپ خوبصورت جسم دیکھ رہے ہیں، یہ مہارشی کی شکتی ہی کی دین ہے۔ مہارشی جی نے مجھے وچن دیا ہے کہ میں ہمیشہ بیس برس کی ہی لگوں گی۔' حالانکہ اُن کی عمر پچپن برس ہے اور وہ ستر برس کے لگتے ہیں۔ نہ اُن کے سر پہ بال ہیں اور نہ منہ میں دانت، وہ کہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ اپنی ساری کی ساری شکتی مجھے دے دیں گے اور ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو؟ اُن کے پاس اسمگلروں سے لے کر دیش کے بڑے بڑے لیڈر تک آتے ہیں اور پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ایکٹر اور ایکٹریس وغیرہ کو تو عام لوگوں کے ساتھ لائن میں کھڑے ہو کر آنا پڑتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ ایک گھونٹ پانی

اور پامسٹری کرلیتی۔ "میں آپ سے یہ پوچھنے نہیں آئی ہوں کہ میرے کتنے رومانس ہوں گے مجھے تو آپ صرف خاص خاص باتیں بتائیں۔"

میں نے پھر اُس کے ریشمی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اب کی بار بڑے غور سے اُس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے کے بعد کہا۔ "آپ کی اولاد کی ریکھا بتاتی ہے کہ آپ کے دو اَبارشن ہوں گے اور.....؟"

یہ سُنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے بولی۔ آپ کی آدھی باتیں تو ابھی سے غلط نکل رہی ہیں۔ میرے اب تک چار اَبارشن ہو چکے ہیں، کتنے اور ہوں گے؟ یہ میں نہیں جاننا چاہتی۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میں ٹاپ کلاس ایکٹریس کب بنوں گی؟

میں تیسری بار اُس کے ملائم ہاتھوں کی باریک باریک لکیروں کو ٹٹولنے لگا۔ اب کی بار میں نے تہیہ کر لیا کہ اُسے اپنی جہالت کا قائل کر کے چھوڑوں گا۔ "دیکھئے کامنی جی۔ آپ کی زندگی میں کافی جدوجہد ہے کیونکہ سنگھرش ریکھا بیچ میں ٹوٹی ہوئی ہے۔ آپ ٹاپ کلاس ایکٹریس کافی جدوجہد کرنے کے بعد بنیں گی....."

وہ فوراً بپھر گئی۔ "کتنی جدوجہد کرنا ہے مجھے؟ کیا یہ کم نہیں کہ میرے پچھلے چھ عاشقوں نے مجھ سے سمندر جتنے وعدے کیے۔ پہاڑوں جتنی آشائیں دیں اور ان وعدوں، آشاؤں کی آڑ میں میرے جسم کو بھوکے گِدھوں کی طرح نوچتے، کھسوٹتے رہے۔ میں نے ایک ٹاپ کلاس ایکٹریس بننے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عورت کے آنسو دیکھ کر مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔ میں اُٹھ کر بالکونی میں چلا گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد جب میری الرجی دُور ہوئی اور میں واپس کمرے میں آیا تو کمرہ خالی تھا۔

شام کو وجے سے میری ملاقات ہوئی۔ اُس نے مجھے کامنی کے بارے میں بتایا اور اداس ہو کر کہنے لگا۔ "وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔ مجھے اُس پہ بہت ترس آتا ہے۔ کتنے ہی لوگ اُسے ہیروئن بنانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اُسے پہچانتے تک نہیں۔ میں نے کافی کوشش کی کہ اُسے دلدل سے نکال لوں مگر وہ بہت ہی ضدی ہے۔ زیادہ زور دیتا ہوں تو جواب دیتی ہے۔" اپنا تو یہیں جان دینے کا ارادہ ہے۔ میرے پاس کچھ اور بچا ہی نہیں جو کہیں اور جا کے گنواؤں۔ اِن لوگوں نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے، سب کچھ لُوٹ لیا۔"

یہ کہہ کر وجے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہنے لگا۔ "جتین! میں اُس سے سچّا پیار کرتا ہوں۔ میں اُسے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ایک بڑے خاندان کی لڑکی ہے اور اب یہ پتھروں کے ساتھ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔" یہ کہہ کر وجے بائی بائی کہہ کر چلا گیا۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ کامنی سے ایک اسٹوڈیو میں پھر مڈبھیڑ ہو گئی۔ اب کی بار اُس کے ساتھ فلموں کا مشہور ولین گجندر سنگھ تھا۔ وہ نشے میں دُھت تھا اور بار بار ایک ہی بات دُہرائے جا رہا تھا۔ "کامنی! تم میری ہیروئن ہو۔ تم صرف میری ہیروئن ہو۔"

کامنی نے مجھے بتایا کہ گجندر سنگھ، مہارشی گدانند کے خاص چیلوں میں سے ہے۔ بہت جذباتی ہے اور بہت دُکھی بھی۔ کیونکہ اس کی بیوی ایک مارواڑی کے ساتھ سارا زیور لے کر بھاگ گئی ہے۔ یہ اپنی بیوی کو مارتا تو بہت تھا لیکن پیار بھی بہت کرتا تھا۔ آج کل یہ ہر وقت نشے میں دُھت رہتا ہے اور خوب تپسیا کرتا ہے۔ مہارشی جی اسے تانترک ودّیا سکھا رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ گجندر سنگھ پچھلے جنم میں بہت بڑا یوگی تھا۔ اس نے ایک دن بھول سے ایک معصوم بچے کو مار دیا تھا، اس لیے اس جنم میں وہ فلموں میں ولین بنا اور اتنے دُکھ جھیل رہا ہے۔ اب اس کے دُکھوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ جو شکتی اس کے پاس آنے والی ہے اُس کے ذریعے یہ ساری دُنیا کا ٹاپ اسٹار بن جائے گا اور.....

کامنی کی بات کاٹ کر گجندر سنگھ اپنی پوری طاقت سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ "ہاں شکتی، شکتی، کچھ دن میں دنیا دیکھے گی کہ میں پانی پہ چلنے لگوں گا، دہکتے ہوئے انگاروں پہ یوں چلنے لگوں گا جیسے چنے چبائے جاتے ہیں۔ مُردوں کو زندہ کر دوں گا اور زندوں کو مُردہ کر دوں گا۔ ہاہا ہاہا! اتنا کہنے کے بعد اُس نے تالی بجائی۔ ایک چھوٹے سے قد کا آدمی بھاگ کر اُس کے پاس آیا۔ گجندر سنگھ کڑک کر بولا۔

"امرت لاؤ۔"

اُس آدمی نے فوراً اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکالی جیسے گجندر سنگھ بغل ہی اپنے حلق میں انڈیل گیا اور پھر ناچنے لگا اور جے مہارشی جے مہارشی کی دھن گاتے گاتے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

کامنی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ میری ڈیوٹی آج کل اسی کی دیکھ بھال پر لگی ہوئی ہے۔ یہ فلم میں کام کرنے کے بیس لاکھ روپے لیتا ہے۔ مہارشی جی کو اُس کی بڑی چنتا ہے۔" پھر کامنی نے سامنے سفید رنگ کی ۱۹۷۶ء ماڈل کی مرسڈیز کار کی طرف اشارہ کر کے بتایا" یہ گجندر نے میرے جنم دن پر مجھے پریزنٹ کی تھی؟"

میں کامنی کو جنم دن پر نئی کار ملنے پر مبارک باد دے کر آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد کامنی سے میری ملاقات کئی مہینے تک نہ ہو سکی پھر۔ ایک دن وجے نے مجھے بتایا کہ کامنی مہارشی اور گجندر سنگھ کے ساتھ پہاڑوں پر تپسیا کرنے چلی گئی ہے۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ ایک بین الاقوامی رفاہی ادارے کے سکریٹری جنرل نے جو خیر سے میرا دوست بھی تھا اور مدد آج بھی، میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں ایک مہینے کے لیے امریکہ کا دورہ کروں، وہاں شہر شہر گھوم کر ہندوستان کی غریب جنتا کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنے پر لوگوں کو آمادہ کروں۔ یہ نیک کام تھا پھر مجھے ایک جگہ رہتے کچھ ایسا احساس بھی ہو رہا تھا جیسے میری شخصیت کو کائی لگ رہی ہو۔ چنانچہ میں نے یہ پیش کش فوراً منظور کر لی۔ نیو یارک، ڈلاس اور واشنگٹن ہوتا ہوا میں لاس اینجلز پہنچا۔ جب ایرپورٹ سے باہر نکلا تو سامنے ٹیکسی اسٹینڈ پر ایک بہت بڑا بورڈ دیکھا جس پر ایک نہایت خوبصورت جوگن کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ دُور سے ایسا لگا جیسے کسی فلم ایکٹریس کی تصویر ہو۔ جب پاس جا کر دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ یہ تو کامنی کی تصویر تھی۔ وہ تصویر میں اور بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ بال سر کے اوپر جٹ کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں مالا تھی۔ سادھنا کا پوز تھا۔ تصویر کے نیچے موٹے موٹے انگریزی حروف میں لکھا تھا! "اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی مراد پوری ہو تو مہان دیوی کامنی کے آشرم میں آئیں۔ لاکھوں لوگ فائدہ اُٹھا چکے ہیں"۔ جان ڈیوڈ سکریٹری مہان دیوی۔ روحانی آشرم، اس سینٹ مارکو ٹمن۔ لاس اینجلز۔ تجسس نے مجھے ایسا اُکسایا کہ میں ٹیکسی پکڑ سیدھا کامنی کے آشرم پہنچ گیا۔ جب جیب سے پیسے نکال کر ڈرائیور کو دینے لگا تو اُس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا۔" ماں کے لیے میری طرف سے ٹیکسی کی فری سروس ہے"۔

آگے بڑھ کر میں آشرم کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا۔ دیکھا کہ ہزاروں کی تعداد میں عورتیں، مرد بچے، بوڑھے، ہر عمر کے لوگ ایک میدان میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سب کی آنکھیں بند تھیں۔ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہجوم میں اتنی خاموشی اور شانتی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

میدان کے چاروں طرف کامنی کی مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک اسٹیج تھا جس کے پیچھے کامنی کی مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں لگ بھگ۔ ۲۰ فٹ اونچی تصویر سنہری فریم میں لگی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر طرح طرح کے پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گلدستوں اور ہاروں کا دریا سا اُمڈ رہا تھا۔

اتنے میں ایک آدمی جس کا سر گُھٹا ہوا تھا اور جس نے گیروے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے، اسٹیج پر آیا اور مائک کے پاس آ کر بڑی میٹھی آواز میں کہنے لگا۔ "سب مل کر بولیے' مہان دیوی آنند چت منی کامنی دیوی جی کی جے۔" سب نے ایک آواز میں نعرہ لگایا۔ وہ آدمی کہنے لگا۔ "مہان ماتا کامنی ابھی درشن دینے والی ہیں۔ آپ سے نویدن ہے کہ سب کھڑے ہو جائیں"۔

پل بھر میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر ہاتھ جوڑ کر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے وہ انسان نہ ہوں مٹی کے پتلے ہوں۔

اب اسٹیج کے سامنے بیس سازندوں کا آرکسٹرا بجنے لگا۔ دو ایک منٹ بعد اسٹیج کے پیچھے سے کامنی نمودار ہوئی جیسے بادلوں کی اوٹ سے سورج نکلتا ہے۔ وہ زعفرانی رنگ کا ریشمی چغہ پہنے ہوئے تھی۔ دو خوبصورت جوان لڑکیاں اس کے دائیں بائیں چل رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں چاندی کے کٹورے تھے جن میں اگربتیاں جل رہی تھیں۔ کامنی کے پیچھے چھوکریاں چل رہی تھیں جن کے ہاتھوں میں [illegible] تھال [illegible] کامنی پر پھولوں کی بارش کر رہی تھیں۔

کامنی نے سب کو آشیرواد دی۔ لوگوں نے اپنا سر جھکا دیا۔ کامنی ایک گدے پر پدم آسن لگا کر بیٹھ گئی اور پھر وہاں سناٹا چھا گیا۔

کامنی آنکھیں موند کر بیٹھی رہی۔ گھٹے ہوئے سر والا آدمی دوبارہ اسٹیج پر آیا اور مائکروفون پر کہا۔ "اب ماتا جی ہم سب کے دُکھ دُور کریں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے مائیک کامنی کے سامنے کر دیا۔

کامنی نے ایک منتر پڑھا، جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اُس نے بڑی نرم، مہربان اور میٹھی آواز میں انگریزی میں کہا۔ "میرے بیٹو اور بیٹیو! تم لوگوں نے مجھے ماں کہا ہے۔ میں تمھیں وچن دیتی ہوں کہ ہمیشہ تم سب کی ایک ماں کی طرح رکھشا کروں گی۔ میں تم سب کے کشٹ اپنے اوپر لے لوں گی اور اپنی ساری شکتی تم لوگوں کو دے دوں گی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں موہ، مایا، کام، کرودھ، پیدا ہوتے ہی چھوڑ چکی ہوں۔ مجھے صرف سب کی خوشی چاہیئے۔ آج میں تم سب کو ایک ایسی سادھنا کراؤں گی میرے بچو جس سے دماغ کے وہ پھاٹک بند ہو جاتے ہیں جہاں سے کام، کرودھ، موہ اور مایا دماغ اور شریر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ میرے بچو! آج تک تم لوگوں نے جتنے بھی پاپ کیے ہیں اُن کو دھیان پوروک یاد کرو اور پشچاتاپ کے روپ میں رو رو کر ان آنکھوں سے باہر نکال دو۔ ان کو آنسو نہ سمجھنا، یہ سمجھنا کہ میری شکتی کے ذریعے وہ سب پاپ تمھاری آنکھوں کے راستے پانی بن بن کر نکل رہے ہیں اور تمھارا شریر اُن پاپوں سے خالی ہو رہا ہے۔

یہ کہہ کر کامنی خاموش ہو گئی۔ سب لوگ بے اختیار رونے لگے۔ اور خوب زور زور سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کچھ لوگ اپنا ماتھا پیٹنے لگے، کچھ اپنے بال نوچنے لگے۔ کچھ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ روتے روتے غش کھا گئے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ میں بھی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔

جب لوگ آدھے گھنٹے تک رو دھو چکے تو کامنی اُٹھ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "میرے بچو اب شانت ہو جاؤ۔ اب تمھارے شریر سے اب تک کیے ہوئے سارے پاپوں کی گندگی نکل گئی ہے۔ اب تمھارا نیا جیون شروع ہوا ہے۔ اب تم اپنے آپ کو سُکھی، شانت اور پہلے سے کہیں زیادہ شکتی وان سمجھو گے۔ اب تم لوگوں کو خوش رہنا چاہیئے اور ہر وقت ہنسنا چاہیئے۔ آؤ، اب ہم سب لوگ خوب خوش ہوں اور ہنسیں۔"

اتنا کہہ کر کامنی تو دھیان سمادھی لگا کر بیٹھ گئی اور اِدھر سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ سارا ماحول قہقہوں سے گونجنے لگا۔ میری بھی باچھیں کھِل گئیں اور میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا اور ساتھ ہی کامنی کی شکتی کی داد بھی دینے لگا کہ وہ کیسے لوگوں کو ہنسا اور رُلا رہی ہے۔

جب سب لوگ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک ہنس چکے تو اُس گھٹے سر والے آدمی نے کہا: "آپ لوگ شانت ہو جائیں۔ اب ماں کی آرتی ہو گی۔" اس کے بعد اسٹیج پر اُن آٹھ لڑکیوں نے کامنی کی آرتی اتاری۔ پھر ایک جلتی ہوئی مشعل لے کر ایک جھولا لیے بھیڑ میں گھومنے اور چندہ اکٹھا کرنے لگیں۔ میں نے بھی ایک ڈالر چندہ دیا۔ جب وہ اسٹیج پر واپس پہنچیں تو اُن سب کے تھیلے ڈالروں، زیوروں، گھڑیوں اور چیکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میرے سامنے ایک نوّے برس کی بوڑھیا کھڑی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میں نے آج جیسی شانتی اور شکتی محسوس کی ہے، اُس کی میں سپنے میں بھی اُمید نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی ساری جائیداد جو لگ بھگ دس لاکھ ڈالر کی ہے کل ماں کے قدموں میں ڈال دوں گی۔"

اس کے بعد کامنی اُٹھ کر واپس چلی گئی۔ لوگ ایک گھنٹے تک اُس کے نام کا جاپ کرتے رہے۔ میں وہاں سے بھاگ کر اسٹیج کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہاں دو ہٹے کٹے حبشی کھڑے تھے۔ میں اندر جانے ہی کو تھا کہ انھوں نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک حبشی جو باکسر معلوم ہوتا تھا، کڑکتی آواز میں بولا۔ "کہاں جاتے ہو؟"

میں نے بڑے فخر سے کہا۔ "میں کامنی کو بمبئی سے جانتا ہوں اور..."

"شٹ اَپ!" دوسرا حبشی مجھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "ماں کہو، ماں کامنی۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ماں، کامنی دیوی کو میں بمبئی سے جانتا ہوں۔" میں نے اُسے اپنے نام کا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تکلیف نہ ہو تو یہ کارڈ ماں کامنی دیوی کو دکھا دو۔ وہ مجھے فوراً اندر بلا لیں گی۔"

اُن دونوں نے باری باری میرا کارڈ پڑھا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر

پھر ایک حبشی میرا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آکر بولا: "تم اندر جا سکتے ہو۔"

میں کمرے کے اندر داخل ہوا۔ کامنی ایک اونچی جگہ بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کئی آدمی آسن لگائے بیٹھے تھے۔ ... سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ گویا اسپیشل سیشن تھا۔ وہاں بالی وڈ کے بڑے بڑے اداکار اور اداکارائیں بیٹھے تھے۔ کئی بڑے بڑے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بھی تھے۔

کچھ دیر کے بعد دھیان کا دور ختم ہوا تو سب لوگ باری باری کامنی کے پاؤں چھو کر چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔

کامنی نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولی "جیتن! تم یہاں کب آئے؟"

"میں آج ہی یہاں آیا ہوں۔ تمہارا بورڈ ایرپورٹ کے باہر دیکھا تو سیدھا ادھر چلا آیا۔ کہو کیسی ہو؟" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم بتاؤ کہ میں کیسی ہوں۔"

"تم تو کسی ملک کی مہارانی لگ رہی ہو۔"

"لیکن تم یہاں کیسے آئے؟"

"میں بھی تمہاری طرح چندہ جمع کرنے آیا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ تم اپنے لیے چندہ جمع کرنے آئی ہو اور میں دلیپ کی غریب جنتا کے لیے۔"

"شٹ اپ۔" وہ غصے سے بولی۔ "اب میں طعنے سننے کی عادی نہیں رہی۔"

ہاں اب تمہیں پوجا کروا لینے کی عادت ہو گئی ہے۔"

"تمہاری ان باتوں کو ... میں تمہیں ... کرتی ہوں۔ تم ایک شریف اور بزدل انسان ہو۔ اور مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔ مجھے تمہارے جیسے انسان کی ضرورت ہے۔ اب میں سپر اسٹار ہوں اور ناپ اسٹار کامنی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ میں تمہارے کام کی کوئی بھی قیمت دے سکتی ہوں۔ آج سے تم میرے اسپیشل سکریٹری ہو۔" یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ میں دس ہزار ڈالر تھما دیے۔

میں نے ڈالر جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "مہارشی جی آج کل کہاں ہیں؟"

کامنی نے ایک لمبی سانس لی اور بولی۔

"ان کی زبان اور گردے میں کینسر ہو گیا ہے وہ آج کل سوئٹزرلینڈ میں ہیں اور جیون اور موت کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔"

"اور گجندر سنگھ۔"

"وہ آج کل میرا باڈی گارڈ ہے۔"

آج کل میں مدر کامنی انٹرنیشنل آشرم کا سکریٹری ہوں۔ ہر وقت کامنی کے ساتھ رہتا ہوں۔ ساری دنیا میں ہماری ۳۶۵ برانچیں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں نے ایک کروڑپتی امریکن بیوہ سے شادی کر لی ہے۔ اس کے پچھلے چار شوہروں سے پانچ بچے ہیں۔

کامنی کا رومانس آج کل ایک یورپین ملک کے وزیر سے چل رہا ہے۔ میری زندگی بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ بڑے بڑے وزیر، سیٹھ، دانشور، فلم پروڈیوسر، ڈائرکٹر اور ایکٹر کامنی سے ملنے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے آشرم میں آئیے اور آکر اپنے پاپ دھو لیجیے۔ ■

ساجدہ اعظم

افسانہ

سرگوشی

دن ہو چکا ہے۔ اُفق ابھی سفید ہے
فضا شبنم سے بھیگی ہوئی لگ رہی ہے۔ ایسا
لگتا ہے نمی ہی نمی ہے، ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے
ایک گُل، حسین، خوبصورت جو شبنم میں
بھیگی ہوئی سرد ہوا کے جھونکوں سے ڈول
رہا ہے۔ اس پھول کو دو آنکھیں تک رہی
ہیں، پوچھ رہی ہیں۔ "گُل! کیا تم بھی میری
طرح اداس ہو۔ دیکھو میں کتنا اداس ہوں
کل میں کتنا خوش تھا۔ تمہارے کھلنے سے
کتنا خوش ہوا تھا۔ تمہیں کتنی بار چومنے کی
کوشش کی تھی اور تم شرما شرما کر سمٹ
جاتے تھے۔ کل مجھے اس کالے بھنورے پر
بہت غصہ آیا تھا جو تمہارے گرد منڈلا رہا
تھا۔ کل سے اسے محبت کرنی چاہیے۔ تم سے
کیوں؟ تم تو پھول بن چکے ہو۔ اس بھنورے
کی نیت بڑی خراب تھی۔ وہ بڑا خراب تھا۔
لیکن میں گذری ہوئی باتیں کیوں دہراؤں؟
گذری ہوئی باتیں نہیں دہرانی چاہیئے! ہو سکتا
ہے ان باتوں میں درد ہو اور وہ درد دہرانے
سے اور زیادہ ہو جائے۔ خیر چھوڑو!
دیکھو میں کتنا اداس ہوں۔ میں تمہارے
پاس آنا چاہتا ہوں۔ تم سے اپنا درد بیان
کرنا چاہتا ہوں! لیکن میں کتنا مجبور ہوں
آنا چاہوں بھی تو آ نہیں سکتا۔ تمہیں اپنا
درد سنا نہیں سکتا۔ مجھے اپاہج کر کے تم
سے دُور کر کے جانے کسی کو کیا ملا۔"

گُل کو پھر سرد ہوا نے چھیڑا۔ اور
ڈولتے ڈولتے ان آنکھوں کی طرف دیکھا اور
ان سے کچھ کہا۔ تم وہاں کیوں بیٹھے ہو؟ بہت
اُداس دکھائی دیتے ہو۔ کیا ہوا۔ کس نے
تمہیں دکھ پہونچایا ہے۔ تم اتنے اداس
کیوں ہو؟ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟
میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں جانتا
مجبور ہوں لیکن میری زندگی پر میرا کوئی اختیار
نہیں۔ میری زندگی عارضی ہے۔ اور اس مختصر سی
زندگی میں مجھے دکھ ہی دکھ ملے ہیں۔ میں جب
کلی تھا بھونروں نے میرے رس کو چوس
لینا چاہا تاکہ میں کھل ہی نہ سکوں اور زرد ہو کر
سوکھ جاؤں ایک ننھی منی بچی نے مجھے توڑنا
بھی چاہا لیکن مالی نے یہ کہہ کر میری زندگی بچالی
کہ۔ "بی بی ابھی مت توڑو۔ پھول بن جانے
دو۔ میں تمہیں توڑ کر دے دوں گا۔ بس اب
میں کھل چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ ننھی منی
بچی پھر آجائے اور مالی سے مجھے مانگ لے یا
خود ہی توڑ لے۔ ہو سکتا تھا میں خزاں میں
پھول بننے کی تمنا لیے جان دے دیتا۔ لیکن
ایسا نہ ہوا اور میرا مقصدِ حیات پورا ہوا۔
میں پھول بنا اور مہک رہا ہوں۔ لیکن ایک بات
اور کہوں میری یہ خوشبو سب کو خوش کر سکتی ہے
سوائے میرے، اور سچ پوچھئے تو میں خود
نہیں جانتا کہ میری خوشبو ہے کیا چیز؟
یہ میری زندگی کا کتنا دردناک پہلو ہے!
میری زندگی عارضی ہے۔ میں جانے اس
ڈال سے کب ٹوٹ جاؤں کیا پتہ کوئی نوجوان
ہی توڑ لے! اور تھوڑی دیر تک مجھے اپنی
انگلیوں میں لیے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہے
اور جب اس کا جی اوب جائے اپنی ہی انگلیوں سے
مسل کر پھینک دے یا پھر مالی توڑ کر کسی کو
بیچ دے اور میں گجرے کے بیچ گوندھا جاؤں
اور کسی حسینہ کی زلفوں میں سجوں؟ یا ہو سکتا
ہے کسی دولہے کے سہرے کی زینت ہو جاؤں۔
اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی چتا پر ڈال دیا
جاؤں، یا پھر کسی مزار پر چڑھا دیا جاؤں؟
ڈال سے ٹوٹنے کے بعد جانے کدھر جاؤں اور
سچ پوچھو تو ڈال سے ٹوٹنا ہی میری موت ہے
اور مرنے کے بعد مجھے احساس ہی نہ ہوگا کہ میں
کدھر ہوں ۔۔ کہاں ہوں؟
اور میری لاش لوگوں کے لیے خوشیوں کا
سامان مہیا کرے گی۔ اس بات سے میں بہت خوش
ہوں کہ زندگی میں مجھے کچھ لمحوں کے لیے ہی کیوں ہو
پیار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور مجھے قتل
کر کے لوگ میری لاش کو بھی بڑے پیار سے رکھتے

ہیں۔ لاش تو بہر صورت سڑ ہی جاتی ہے۔ کب تک
تازہ رہ سکے گی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے
کوئی نہ توڑے اور میں اس ڈال ہی پر مہک مہک
کر زرد پڑتا جاؤں اور میری پتیاں ایک
ایک کر کے جھڑتی جائیں اور میں اس ڈال ہی پر
ختم ہو جاؤں۔

کاش! ایسا ہو!!

میں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اب تم بھی
کچھ کہو۔ لیکن تم تو صرف مجھے دیکھے جا رہے ہو۔ اس
طرح سے دیکھنے سے تو کچھ نہ ہوگا۔ میرے پاس آؤ
مجھ سے کہو! تمھیں کیا دکھ ہے اتنے اداس کیوں ہو
میں نے تو تمھیں محبت دی ہے۔ میں نے تمھیں کوئی
دکھ نہیں دیا پھر مجھ سے کیوں روٹھے ہو — — —

— — — — — — — — — —

— — — — — — — تم مجھے بہت
چاہتے ہو۔ اس کا مجھے احساس ہے لیکن خالی اسی
طرح دیکھنے سے تو میں تمھاری آنکھوں سے سب
کچھ نہیں جان سکتا۔ کیا تم کچھ کہہ رہے ہو؟
کیا کہہ رہے ہو؟!

آنکھیں گل کو برابر دیکھے جا رہی تھیں
اور ان آنکھوں سے اظہارِ درد ہو رہا تھا۔ گل کاش!
تم میری زبان جان سکتے اور میں جو کچھ سوچ رہا ہوں
اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تم سمجھ سکتے۔

مجھے تم سے محبت ہے۔ اس کا اظہار
میں کر چکا ہوں میں تم پر وارفتہ ہو چکا ہوں۔
لیکن تم مجھ پر وارفتہ نہیں ہو سکتے۔ تم تو اپنی جگہ
سے ہل بھی نہیں سکتے۔ کتنے مجبور ہو اور ہوا کے
کتنے محتاج جو تمھیں اپنی جگہ سے ہلاتی ہے۔ تم

اتنے حسین ہو کر اتنے مجبور کیوں ہو؟ اتنے
کمزور کیوں ہو؟ تمھیں تو مغرور ہونا چاہیئے
تھا تمھیں تو طاقتور ہونا چاہیئے تھا اپنے
آگے ساری دنیا کو جھکانا چاہیئے تھا۔ کیا
حسن مجبور رہوتا ہے؟ واقعی تم بہت مظلوم
ہو۔ دوسروں کو خوشیاں دے سکتے ہو لیکن
اپنے لیئے کوئی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔ تم تو صرف
دکھ ہی دکھ ہو۔

واقعی دکھ بہت حسین ہوتا ہے اور
اس کی مثال تم ہو۔ میں آزاد ہوں لیکن اب
آزاد نہیں رہا۔ مجھے بھی زمانے نے دکھ دیا ہے
اور شاید اسی دکھ سے میں اپنی جان دے دوں گا
میرا درد کون جانے گا گل؟ مجھ سے کون پوچھے
گا کہ مجھے کیا تکلیف ہے؟ میری طرح کیا اور
لوگ بھی درد میں مبتلا ہوں گے؟ کیا میری
طرح سب ہی زخمی ہوں گے؟ کیا مجھے اپنے
دکھوں کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے؟ کیا مجھے
اپنے دکھوں کے اظہار سے پہلے ان لوگوں کے
دکھوں کے بارے میں سوچ لینا چاہیئے۔ لیکن
میں ایسا نہیں سوچ سکتا۔ مجھے تو اپنا درد سب
کے درد سے زیادہ لگ رہا ہے۔ کل ہی کی
تو بات ہے میں کتنا خوش تھا۔ تم تو جانتے
ہو نا؟ لیکن شام میں میں زخمی ہو گیا اور اب
یہ زخم مجھے آہستہ آہستہ موت کی طرف
ڈھکیلتا جا رہا ہے۔

اچھا ہے گل کہ اب میں مر جاؤں!
سسک سسک کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ فوراً
ہی ختم ہو جاؤں۔ میری تو اب یہی دعا ہے کہ
جتنی جلد ممکن ہو مجھے موت آ جائے۔ اب میری زندگی
میں رکھا ہی کیا ہے۔ تم تو نہ ہل سکو گے۔

اب مجھ سے دو قدم بھی چلا نہیں
جاتا۔ میں بیٹھے بیٹھے اپنی اپاہج زندگی پر
آنسو بہا سکتا ہوں اور آنسو بہا کر اپنی زندگی
کو زندگی نہیں دے سکتا۔ تم ہی کہو کہ میں اب
زندہ رہ کر کیا کروں!

پھول نے بہت اداس ہو کر ان آنکھوں
کی طرف دیکھا۔ البتہ تمھاری آنکھوں میں میں نے درد
کو دیکھا ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن
میں تمھیں کچھ بھی نہ دے سکوں گا۔ دولت جو میرے
پاس ہے وہ ہے میرا حسن اور میری خوشبو
اور ان دونوں چیزوں پر میرا کوئی اختیار نہیں۔
میری ان چیزوں کو ہر کوئی لوٹ سکتا ہے اگر تم
چاہو تو یہ چیزیں تم لے سکتے ہو۔ اگر ان چیزوں
سے تمھیں کوئی تسکین ہو سکتی ہے تو آؤ میرا حسن
لوٹ لو۔ میری خوشبو چھین لو۔ مجھے تم سے محبت ہے
مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم خوش ہو جاؤ تو میرے
لیے یہی بہت کچھ ہے۔ اٹھو وہاں سے میرے
پاس آؤ نہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ آ جاؤ۔
اٹھو وہاں سے، میری خوشبو تمھیں بلا رہی ہے
میرا حسن تمھیں آواز دے رہا ہے۔ تمھارا دکھ دور
کرنے کے لیے۔ نہیں آؤ گے؟ یوں گم سم کیوں
بیٹھے ہو؟ اس طرح کیوں اداس ہو؟ قریب آؤ
مجھ سے اپنے دکھ بیان کرو۔ ردِ عمل میں ایک
غم زدہ لہجہ فضاء میں گونجنے لگا میں بہت اداس
ہوں۔ میرا سارا جسم درد سے پھوٹا جا رہا ہے
میں زخمی ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے میری

(باقی صفحہ ۲۸۱ پر)

مسعود مفتی

نسخہ

(طنزیہ)

بیمار پڑو تو ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤ کیونکہ ڈاکٹر وں کو بھی زندہ رہنا ہے۔ جب تم ڈاکٹر سے نسخہ لکھوالو تو کیمسٹ سے دوائی ضرور بنواؤ کیونکہ کیمسٹوں کو بھی زندہ رہنا ہے اور جب دوائی بنوا چکو تو ہرگز نہ پیو کیونکہ تم کو بھی زندہ رہنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گز بھر کا ہاتھ ہمارے پیٹ میں گھسیڑ ڈالا۔ دو گھونسے چھاتی پر دے مارے۔ ٹھوڑی پکڑ کر گردن جھکا ڈالی۔ اور پھر پیشتر اس کے کہ ہماری سانس درست ہوتی کہ ہم مفصل حالات بتا سکیں۔ وہ قلم لیے کاغذ پر پل پڑے۔ چشم زدن میں نسخہ گھسیٹا گیا۔ الفاظ ہماری الجھی ہوئی سانسوں میں اٹکے ہی رہے اور ہمارے حیرت سے کھلے ہوئے ہاتھوں میں نسخہ تھماتے ہوئے وہ تیزی سے بولے۔

"کسی کیمسٹ سے دوا بنوائیے۔ تین تین گھنٹے بعد ایک خوراک۔۔۔۔ پانچ روز بعد پھر دکھائیے۔۔۔۔ اگلا مریض بھیجو بھئی۔"

نظر اٹھائی تو چپراسی ایک اور شکستہ حال آدمی کو جیتا اٹھا کر اندر دھکیل رہا تھا۔ اور جب تک ہم اس تبدیلی کو مکمل طور پر سمجھ سکتے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے گلے سے بکری کی آواز نکلوا رہے تھے۔ جس کا تان ہمیں بھی کمرے کے باہر بہا لے گئی۔

باہر نکلتے ہی ہم نے تمام گالیوں کا ورد کر ڈالا۔ گو ہمارا روئے گالی عرفی بھیا کی طرف تھا جنھوں نے ہفتہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ جوتی کے ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ درد یقیناً عرفی بھیا کے قتل میں ختم ہوتا۔ اگر ہمیں اچانک خیال نہ آتا کہ ممکن ہے جوتی کے ڈاکٹروں کے معائنے کا انداز یہی ہو۔ اس خیال سے قدرے تسلی ہوئی۔ تو ہم نے مٹھی میں مڑے تڑے ہوئے نسخے کو کھولا تاکہ دیکھیں ڈاکٹر صاحب نے کیا تجویز فرمایا ہے۔ یاد اش بخیر! نسخہ کیا تھا کسی بھاگتی ہوئی فوج کی ابتری کا منظر تھا۔ کاغذ پر الفاظ کا دور دور نشان نہ تھا۔ البتہ چند دندانے دار لکیریں۔ چند ادھڑی ہوئی توسیں اور چند مونچھ بردار نکتے۔ ٹوٹے ہوئے جام کے ٹکڑوں کی طرح کچھ اس انداز میں بکھرے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے سے بظاہر لاتعلقی کے باوجود آپس میں ٹھوکے دیتے نظر آتے تھے۔ الفاظ قسم کی چیز صرف ایک ہی جگہ تھی جو اوپر والے کونے میں ڈاکٹر صاحب کے نام کی شکل میں چھپی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی دم تھی۔ جس میں ڈگریاں کم اور شہروں کے نام زیادہ تھے۔ اس سے نیچے جہاں ڈاکٹر صاحب کے قلم نے گھوڑ دوڑ کی تھی۔ جیو میٹری کے لحاظ سے بے قاعدہ خطوط کچھ اس طرح دست و گریباں تھے کہ کسی سیدھے خط کی پسلی سے یک سمت کوئی قوس پیدا ہو جاتی۔ اور اس کی بغل میں سے سیاہی کی کوئی اور [illegible] رال ٹپک رہی ہوتی۔ آگے کاغذ کا وسیع لق و دق صحرا تھا۔ جس میں کہیں کہیں صفت نکتہ اکیلا سر دھنتا نظر آتا۔ پھر ایک دم تین چار دندانے دار خطوط کسی پتنگ باز کی الجھی ہوئی ڈور کی طرح آپس میں ایسے گتھے ہوئے تھے کہ کوئی راکٹ کی طرح ایک دم اوپر کی طرف پرواز کر جاتا تھا۔ اور کوئی سمندری آبدوز کی طرح سے نیچے سے غوطہ زن تھا۔ تو کسی جگہ کوئی نصف دائرہ پورے ہندسے کی نمائندگی کر رہا تھا تو کسی جگہ دو تین لڑکھڑاتی ہوئی لکیریں اپنی اٹھک بیٹھک سے کسی معرکہ آرا دوائی کا نام جپ رہی تھیں۔ کہیں سیدھے سپاٹ عمود جھنڈے کے ڈنڈے کھڑے تھے تو کہیں چھوٹی چھوٹی گھنڈیاں تھیں تمام بیل کی طرح اندر ہی اندر سمٹی جاتی تھیں۔ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف ایک ہی حشر برپا تھا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ غلطی سے کسی ڈاکٹر کی بجائے کسی عامل کے پاس آن پھنسے ہیں۔ جس نے آسمانی زبان میں کوئی تعویذ لکھ دیا ہو۔ لیکن انھوں نے بیٹی کا نولانے یہ شہادت دی کہ انھوں نے یہ کاغذ کسی دریا کے کنارے جلانے کو نہیں کہا تھا بلکہ کسی کیمسٹ کو دکھانے کی ہدایت کی تھی۔ پھر خیال آیا ممکن ہے ہزاروں سال پہلے ڈاکٹر صاحب کے آبا و اجداد میں سے کوئی بزرگ کسی مصری یا یونانی مندر کے کاہن ہوں۔

اور اس نسلی ورثے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب ابھی لاشعوری طور پر نسخہ کسی ایسی زبان میں لکھ لیتے ہوں جو اہرام مصر کے تاریک ترین گوشوں میں کندہ ہے لیکن جب ڈاکٹر صاحب کی حد سے زیادہ مصروفیت اور ان کا کاروباری رویہ یاد آیا تو یقین آ گیا کہ وہ کلیتاً موجودہ صدی کے ہی آدمی ہیں اور یہ ہمارا خیال غلط ہے۔ بہر حال ہماری نگاہ کبھی ان خطوط کے کنگوروں میں اٹک جاتی، کبھی دندانے دار لکیروں سے پھسل پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں اپنی بیماری اور دوا کا پتہ تو کیا چلتا۔ البتہ پیٹ کی تکلیف کے ساتھ ساتھ سر میں بھی درد شروع ہو گیا۔ آئے ایک بیماری کا علاج کروانے اور جاتے وقت دو تکلیفیں جھنجوڑ رہی تھیں۔ اپنی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ہم مجبوراً کسی کیمسٹ کی تلاش میں نکلے۔

کیمسٹ کا ملازم جب نسخہ لے کر اندر گیا تو ہمارا خیال تھا کہ ڈسپنسری والا روتا چیختا، کپڑے پھاڑتا ابھی باہر بھاگا آئے گا۔ اور اپنی تعلیم و تجربے کا نوحہ کرتا ہوا دہائی دے گا کہ اس سے یہ پڑھا نہیں گیا لیکن ہماری حیرت بے اختیار اُبل پڑی۔ جب تھوڑی دیر بعد ملازم ایک نہایت صاف ستھری شیشی لے کر برآمد ہوا۔ اور بڑی شائستگی سے ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"کوئی اور حکم"

شیشی میں گاڑھے نسواری رنگ کی دوائی تھی۔ ساتھ نسخہ تھا اور اوپر کارک مضبوطی سے بند تھا۔ کیمسٹ کا لیبل بھی چسپاں تھا۔ کہیں بھی کسی شے کے غیر معمولی ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ ہم نے خاموشی سے دوائی اٹھائی۔ اور اپنی قابلیت میں ہزاروں کیڑے ڈالتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

دوائی کا استعمال کیا گیا۔ پیٹ کی تکلیف میں قدرے افاقہ محسوس ہوا لیکن ساتھ ہی سخت قبض کی شکایت لاحق ہو گئی۔ ہم نے سوچا ممکن ہے کوئی بد پرہیزی کا ہو۔ چنانچہ اگلے روز خوراک میں زیادہ احتیاط کرتے ہوئے ہم پھر سے اسی کیمسٹ کی دکان پہ پہنچ گئے۔

لڑکا حسب سابق اندر غوطہ لگا گیا اور جب برآمد ہوا تو دوائی کی شیشی اس کے ہاتھ میں تھی لیکن...... سجھا! دوائی کا رنگ سُرخ تھا حالانکہ پہلے روز دوائی نسواری رنگ کی تھی۔

"ارے بھائی یہ کس کی دوائی اٹھا لائے اس نسخے کی دوا لائی ہوتی" ہم نے ڈانٹا۔

"اسی کی ہے صاحب۔ یہ دیکھئے ٹوکن" اس نے گتے کا ایک ٹوکن دکھایا۔ جو ولادت کے وقت تو یقیناً چوکور رہا ہو گا۔ لیکن اپنے ماتے کی مار سے مائل بہ گولائی تھا۔

"جاؤ۔ جاؤ اندر لے جاؤ اس سے کہو یہ دوائی ٹھیک نہیں۔"

ہم نے سخت گاہک کے انداز میں رُعب جمایا۔ لڑکا دوائی اور نسخہ لے کر اندر چلا گیا۔ لیکن اس کی بجائے ایک معمولی سا آدمی نما چیز ایپرن میں لپٹی ہوئی نکلی اور گھسی ہوئی آواز میں احتجاج نافذ ہونے لگا۔

"دیکھئے صاحب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ دوائی بھی بنائیں اور پھر اس کی تشریحات بھی کرتے پھریں۔ ہمیں تو جو نسخے میں نظر آئے گا ہم وہی بنائیں گے۔"

"دیکھئے جناب" ہم نے مصالحانہ سختی سے کہا۔ "کل جو دوا آپ نے دی تھی اس کا رنگ نسواری تھا۔ اور یہ سُرخ ہے۔"

"جی کل والی دوا کل والے نسخے کے ہمراہ ہو گی۔" وہ ہماری بات کاٹ کر بولے۔ "اور آج کی دوا آج کے نسخے کے مطابق ہے۔"

لیکن بھئی کل کا اور آج کا نسخہ ایک ہی ہے۔

"ایں ایک ہی ہے؟"...... انھیں ذرا بریک سی لگی لیکن پیشہ ورانہ وقار ایکدم پھر سے اُبل پڑا۔ "جی نہیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں، ہم تو جو نسخے میں دیکھیں گے۔ وہی بتائیں گے۔ وہی بنائیں گے۔

اور دھڑاک سے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ فضا میں اپنی بڑبڑاہٹ کی گونج چھوڑتے ہوئے چلے گئے۔ ہم مجبوراً مالک کے پاس پہنچ گئے۔ جو ایک کاؤنٹر کے پیچھے پھنسے بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑوں سے وٹامن بی کی بو آ رہی تھی۔ اور سامنے پڑی ہوئی انجکشن کے پانی کی چار شیشیوں کو انگلیوں سے بجا بجا کر جلترنگ کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی ہمدردی سے ہماری شکایت کو سنا۔ پھر اطمینان سے نسخہ ہاتھ میں لے کر کمال خود اعتمادی سے اس پر نظر دوڑائی۔ لیکن ساتھ ہی ان کے چہرے پر پریشانی اور بے چارگی کی لہریں دوڑنے لگیں اور وہ نسخے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ جیسے کسی شیر خوار بچے کو آلارم بجنے کے بعد پہلی دفعہ ٹائم پیس گھڑی ہاتھ میں پکڑنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

ایکدم ان کا ہاتھ اُچھلا۔ اور گھنٹی

نکل آئیں۔ چند لمحے بعد ہی [illegible] مختلف صاحب پھر سے آن موجود ہوئے۔

"دیکھو بھئی! یہ نسخہ ذرا پھر سے دیکھ لو تاکہ ان کی تسلی ہو جائے۔"

"عجیب بات ہے جناب۔ ابھی ان کو عین شرافت سے بتایا گیا ہے کہ دوائی نسخے کے عین مطابق بنائی گئی ہے۔ لیکن اگر ان کی تسلی نہ ہو تو بنانے والے کا کیا قصور۔"

"جی بنانے والے کا قصور یہ ہے۔ اب تو ہم بھی سچ مچ غصے میں آ گئے کہ وہ نسواری اور سرخ رنگ میں تمیز کر سکتا۔"

بنانے والے نے ضبط کا گھونٹ بمشکل نگلتے ہوئے نسخہ ہاتھ میں پکڑا اور سب سے اوپر والی سطر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"صاحب یہ تو ہے۔"

اس نے نہ معلوم کس دوائی کا نام لیا۔ جس کا نام لینا تو کجا محض اس کا خیال کرنے ہی سے ہمارے گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں اور یہ یہاں لکھی ہے پانچ ملی گرام۔"

وہ نسخہ پہ ایک اگلی انگلی پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ دوسری طرف یہ ہے۔ اس نے ایک اور ڈکار نما نام لیا۔ یہ ہے ایک کیمیکل اور اتنی ملی لے ڈالی ہے اور یہ ہے تیسری......

اس طرح اس نے چار پانچ نام لے ڈالے اور ملک صاحب ایسے سر ہلاتے گئے جیسے کلاس کا نالائق لڑکا کچھ سمجھے بغیر استاد کے ساتھ سر ہلاتا جائے۔ ہم نے بالآخر ملک کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیوں صاحب یہ ٹھیک ہے کیا؟" تو مظلومیت سے بولے۔ "جی نسخہ تو پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے آدمی نہایت تجربہ کار ہیں۔ اور بڑی احتیاط سے نسخہ بناتے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے نسخہ اور دوائی ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ اور خود جلترنگ کی مشق فرمانے لگے۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو سر درد پھر سے عود کر آیا تھا۔

ہمارا اگلا خیال قدرتی طور پہ کسی چھوٹے کیمسٹ کے پاس جانے کا تھا۔ چنانچہ جب وہاں پہنچے تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک باوردی سیلزمین نے نسخہ ہاتھ میں لے کر ہمیں ایک پرچی دے دی۔ اور نسخہ ایک لڑکے کے ہاتھ کسی نامعلوم تہہ خانے کی طرف روانہ کر دیا اور ہم ایک کاؤنٹر پہ بیٹھے انتظار کی گھڑیاں اور دکان کی شیشیاں گنتے رہے۔ تھوڑی دیر میں عدالت کی آواز کے انداز میں ہمارا نام پکارا گیا۔

اور جب ہم لپکے تو لفافے میں بند ایک شیشی ہمیں دی گئی۔ ہم نے بے صبری سے لفافہ اتار کر دوائی کا نام دیکھنا چاہا تو سخت ناامیدی ہوئی کیونکہ دوائی بالکل بے رنگ تھی۔ اب جو ہم نے بے چارگی سے دوائی، نسخے اور سیلزمین کو دیکھنا شروع کیا تو وہ ہمارے قریب منہ لا کر رازداری سے بولا۔

"جناب اگر کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہیئے۔ شرم کا ہے کی۔"

ہم قدرے جھینپ سے گئے۔ اور صفائی پیش کرنے کے طور پہ جو بولنا پڑا تو صرف یہی کہہ سکے۔

"جی نہیں۔ چاہیئے تو کچھ نہیں۔ لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ دوائی اسی نسخے کی ہے؟"

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" وہ دانت نکالنے لگا۔ "یہ کیا فرمایا آپ نے جب آپ نسخہ دیتے ہیں تو دوائی اس کے مطابق ہی بنتی ہے۔"

"جی نہیں۔" ہم قدرے ترش ہو گئے۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ نسخے اور دوائی میں تبدیلی تو نہیں ہو گئی۔"

"استغفراللہ۔ صاحب آپ کیا بات کرتے ہیں بھلا یہ بھی کبھی ممکن ہے اتنا بہترین اسٹاف ایسی غلطی کر سکتا ہے۔"

"لیکن کل میں نے ایک کیمسٹ سے یہی دوا بنوائی تھی تو وہ گاڑھے نسواری رنگ کی تھی اور یہ بالکل بے رنگ ہے۔"

"کون کیمسٹ تھا وہ۔"

اور جب ہم نے نام بتایا تو ہنس کے بولا۔ غنیمت ابھی نہیں ہوتی جناب لیکن کیا کریں جب آدمی اپنے اسٹاف پہ گھسیارے رکھے گا تو ایسی ہی دوائی بنے گی۔ ہمارے ہاں تو بھلا احتیاط کی جاتی ہے۔ شیشیاں جراثیم کش دوائیوں سے صاف کر کے ریفریجریٹر میں رکھی ہوتی ہیں۔ ایک آدمی دوائیاں بناتا ہے دوسرا انھیں پرکھتا ہے۔ تیسرا لیبل لگاتا ہے۔ بھلا غلطی کیسے ممکن ہے۔"

اور پھر ہمارا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر بولا۔ آپ تو بس بالکل وہم نہ کریں اس معاملہ میں ہم ہر چیز کے ذمہ دار ہیں۔ انشاءاللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔"

"کبھی ہاتھ سے جھاڑ دیا" میں نے بیٹھا کر سوچا۔ آج کی شکایت کا تو علاج نہیں ان کے پاس اور آئے ہیں مستقبل کے سودے کرنے۔

چنانچہ وہاں سے جو شیشی چھین کر بھاگے تو خدا
جھوٹ نہ بلوائے کم از کم درجن بھر کیمسٹ گھوم
ڈالے۔ لیکن قسم لے لیجئے جو ایک کیمسٹ کی
دوائی دوسرے سے معمولی سی بھی ملتی ہو۔ کہیں
سے گھلا ہوا چاک ملا تو کہیں تیل کی سی شفاف دوائی۔
کسی نے پتر ستے ہوئے سفوف ڈال کر دیئے۔
تو کسی نے لپالپ کرتی ہوئی جھاگ بھر دی۔ کسی کی
دوائی بند شیشی میں شوں شوں ابل رہی ہے تو
کسی کی شیشی کی دیواروں کے ساتھ اس طرح چپکی
ہوئی ہے کہ لاکھ ہلاؤ پیاس کے قطرے کروٹ
تک نہیں بدلتے پھر تے جیب تو خالی ہو ہی گئی۔
اب یقین بھی خالی ہونے لگا۔ بار بار وہم اٹھتا
کہ خدا معلوم کل بھی صحیح دوا پی ہے یا نہیں اور
نہ معلوم کب تک پھرتے رہتے۔ اگر ایک کیمسٹ
سے تقریباً قریباً اسی رنگ کی دوائی نہ مل جاتی۔ جیسی
ایک روز پہلے پی چکے تھے۔

گھر آکر ہم نے اس کا استعمال شروع کیا۔
آج تک اپنے ستاروں کو کوس رہے ہیں۔ ایک ہی
خوراک پینے سے پیٹ میں گھوڑے دوڑنے
لگے۔ کبھا تو سخت قبض کی شکایت تھی اور کبھا یہ عالم
کہ دوسری خوراک پیتے پیتے سخت پیچش نے آگھیرا
گھنٹے بھر میں پیٹ کمان بنا کر رہ جا چکا۔ اس ہی
تکلیف نے اتنا مصروف رکھا کہ یہ سوچنے کی مہلت
بھی نہ ملی کہ ایک ہی دوائی کی دو دنوں میں یہ
متضاد تاثیر کیسے پیدا ہو گئی۔ اور حیران کن بات
یہ ہے کہ دوسری اتنی زود اثر کہ شیشی کی طرف
دیکھو تو پیٹ میں جھینپے لگنے لگیں۔ خدا خدا کر
کے وقت کاٹا۔ اور جب یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب
اپنی کائنات میں بطور یزداں جم چکے ہوں گے۔
تو فون اٹھایا۔

"ہلو۔ ہلو! ڈاکٹر صاحب ہیں؟"

"جی بول رہا ہوں۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔ میں کل حاضر خدمت
ہوا تھا نسخہ نمبر ۲۴۲ ہے۔ یاد آ گیا آپ کو۔"

"جی جی بولتے جائیے آپ۔"

"تو وہ عرض ہے کہ پیٹ کی تکلیف
تو کچھ زیادہ ہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
پیٹ اپنی تمام بیماریوں کا تجربہ کر رہا ہے۔
پہلے روز تو سخت قبض تھی۔ اب پیچش سے
بُرا حال ہے۔

"لیٹ جائیے۔" فون پر ڈاکٹر صاحب
کی یہ آواز سن کر ہم حیران ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب
کا کیا مطلب ہے۔ پھر ایکدم ان کا مطلب
سمجھ کر ہمیں اپنی ناسمجھی پر افسوس ہوا اور
ہم کھسیانے ہو کر بولے۔

"جی سارا دن لیٹا رہا ہوں۔ لیکن کسی
کل چین نہیں پڑتا۔"

"منہ کھول دیجئے۔" ٹیلیفون پر پھر آواز
آئی اور ہم حیران کہ ڈاکٹر صاحب فون کو
بھی اسٹیتھوسکوپ سمجھتے ہیں۔ نہ معلوم وہ فون
سے کیسے کام لے سکتے ہیں۔

"جی کیا فرمایا۔" ہم نے اپنی سمجھ پر
شک کرتے ہوئے دوبارہ تسلی چاہی۔

"گلے سے آواز نکالیے۔" ڈاکٹر صاحب
کی آواز پھر آئی۔ اور یقین جانیئے۔ ہمیں اپنے
یا ڈاکٹر صاحب کے آسیب زدہ ہونے کا یقین
ہونے لگا۔ لیکن ساتھ ہی ٹیلیفون پر ایک
بکری کی آواز سنائی دینے لگی۔ تو عقدہ کھلا کہ
ڈاکٹر صاحب ریسیور کان سے لگائے کسی اور
مریض کا معائنہ فرما رہے تھے۔ جی میں آیا کہ ہم
اپنا ریسیور اتنے زور سے پٹخیں کہ اس کی
آواز ڈاکٹر صاحب کے کان میں سوراخ کر دے
لیکن بدقسمتی سے ایسے اوقات میں ہمارا
ضبط غصے سے کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتا ہے۔
اس لیے چلا کر فقط اتنا کہا۔ "ڈاکٹر صاحب
آپ میری بات سن رہے ہیں یا نہیں۔"

"ہاں۔ جی۔ سن رہا ہوں۔ آپ چاہتے
کیا ہیں۔"

ہم کباب ہو گئے۔ بمشکل زبان
دانتوں تلے دبا کر ضبط کیا۔ اور عرض کیا "میری
تکلیف نہ صرف بڑھ گئی ہے بلکہ اور بھی کئی
تکلیفیں شروع ہو گئی ہیں۔ اس وقت حاضر ہو
جاؤں گا تاکہ آپ دیکھ سکیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ آنے کی ضرورت
نہیں۔ میں نے خوب دیکھ بھال کر نسخہ لکھا تھا
ممکن ہے کہ کیمسٹ نے لاپروائی کی ہو۔ آپ
کسی دوسرے سے دوا بنوالیں۔ پانچ روز بعد
دکھائیے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" ہم چلائے۔ لیکن
آواز اپنے ہی کانوں میں گونج کر رہ گئی۔ اور ہم
سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد تین روز دوائی
تو کیا پیتے۔ البتہ پہلے روز کی کاوش سے کمائی
ہوئی تمام رنگارنگ شیشیوں کی قطار میز پر
لگا کر سوچتے کہ ان میں سے کون سی دوائی پئیں

لیکن خدا بھلا کرے اس غیر معروف محسنِ انسانیت کا جس کے ایک قول نے بار بار یاد آنے کی وجہ سے ہماری جان بچائی۔ وہ قول یہ ہے کہ جب تم بیمار پڑو تو ضرور ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ کیونکہ ڈاکٹروں کو بھی زندہ رہنا ہے۔ جب تم ڈاکٹر سے نسخہ لکھوا لو تو کسی کیمسٹ سے دوائی ضرور بنوالو۔ کیونکہ کیمسٹوں کو بھی زندہ رہنا ہے اور جب دوائی بنوا چکو تو ہرگز نہ پیو کیونکہ تم کو بھی زندہ رہنا ہے۔

پانچویں روز جب ہم ڈاکٹر کے پاس گئے تو ہم اکیلے نہیں تھے بلکہ ہمارے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو ہم نے ایک گھنٹہ کے لیے کرایہ پر لیا تھا۔ ٹائپ رائٹر اس کے کندھے پر تھا اور اس کے تن و توش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب سے کہا جائے کہ وہ نسخہ خود لکھنے کی بجائے اسے ٹائپ کروا دیں تو وہ اپنی سلامتی کی خاطر فوراً راضی ہو جائیں گے۔"

بقیہ:- "سرگوشی"

آنکھوں میں دم رہ گیا ہے۔ میں صرف تمھیں دیکھ سکتا ہوں۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ مجھے کسی سے گلا نہیں مجھے کسی سے شکایت نہیں۔

اور پھر یہ ٹوٹتے ہوئے بلبل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس نے اپنی چشمِ نم سے پھول کو دیکھا۔ پھول اسے کچھ دھندلا دھندلا سا لگا۔ بلبل کے آنسو گرنے بھی نہ پائے تھے کہ بہت دنوں سے بھوکا ایک سانپ جو درخت سے لپٹا ہوا زخمی بلبل کی تاک میں تھا جھپٹ کر اپنے منہ میں بلبل کو دبوچ لیا۔ بلبل کی موت پر پھول دل شکستہ ہو کر اپنی پتیوں پر گرے شبنم کے آخری قطرے کو زمین پہ ٹپکانا چاہ ہی رہا تھا کہ سورج کی تیز پیاسی کرنوں نے شبنم کے آخری قطرے کو چوس لیا اور دوسرے لمحے مالی نے آ کر پھول کو ڈال سے توڑ لیا۔

محمد اکرام اللہ خان

فلمنامہ

شریف آف بمبئی کی حیثیت سے دلیپ کمار کے تقرر کا سارے ملک میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ دلیپ کمار کی شخصیت جن خصوصیات کی حامل ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس نئی ذمہ داری کے ساتھ مکمل انصاف کرنے میں کامیاب رہیں گے وہ ایک پرخلوص انسان ہی نہیں بلکہ بلند پایہ کے مفکر اور بہترین مقرر بھی ہیں۔ ان سے گفتگو کرنے والا ان کی سوجھ بوجھ، علمیت اور معلومات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی کے چیف منسٹر شری شرد پوار نے اس اعزاز کے لیے دلیپ کمار کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب سے دلیپ کمار کی مقبولیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو ان کے تقرر کی وجہ سے اس عہدہ کی مقبولیت میں نئے انداز سے اضافہ ہو چکا ہے ہم دلیپ صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس عہدہ کے وقار میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

★

ایک دلچسپ اطلاع ملی ہے کہ آئی۔ ایس۔ جوہر وارانسی سے راج نارائن کا مقابلہ کریں گے۔ راج نارائن نے گذشتہ لوک سبھا کے انتخابات میں شریمتی اندرا گاندھی کو شکست دے کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ملک کے موجودہ سیاسی ماحول میں آئی۔ ایس۔ جوہر کو شکست دینا راج نارائن کے لیے بہت مشکل ہے جوہر کے خیال میں جب ایک سیاست داں مسخرہ بن سکتا ہے تو کیا ایک مسخرہ سیاست داں نہیں بن سکتا گذشتہ مہینے جوہر نے راج نارائن کو چیلنج کیا تھا کہ وہ جس مقام سے الیکشن میں حصہ لے گا وہ بھی اسی مقام سے اس کا مقابلہ کرے گا اور جیت کر یہ ثابت کر دکھائے گا کہ ایسے سیاست دانوں سے فلمی مسخرے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ بقول جوہر، راج نارائن کے انتخاب میں حصہ لینے کی خبر اخبارات میں شائع ہوتے ہی وارانسی سے سینکڑوں خطوط اور ٹیلیگرام مقابلہ کرنے کے لیے اس کو موصول ہو چکے ہیں۔ اب جب کہ جوہر نے بھی وارانسی سے مقابلے کا اعلان کر دیا ہے دیکھنا یہ ہے کہ کون کس کو شکست دیتا ہے۔ یہ مقابلہ ملک کے لیے بے حد دلچسپ ثابت ہوگا۔

★

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں فلم، ادب اور کھیلوں نے بڑا ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ آج پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کا دورہ کر رہی ہے اور کل سے امرتسر میں سہ روزہ میاچ کا آغاز ہو رہا ہے۔ جس کو دیکھنے کے لیے سرحد پار کر کے کچھ پاکستانی امرتسر آ رہے ہیں۔ جذبۂ خیر سگالی کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ ویزا وغیرہ کی پابندیوں میں اس میاچ کی حد تک نرمی پیدا کی جا رہی ہیں اور ہندوستانی اپنے پاکستانی بھائیوں کی مہمان نوازی کے لیے بے قرار ہیں۔ قیام و طعام کے انتظامات کے ساتھ ساتھ پاکستانی بھائیوں میں ایسے کوپن بھی تقسیم کیے جائیں گے جن سے کرکٹ میاچ کے علاوہ ہندوستانی فلمیں بھی دیکھ سکیں گے۔

★

فلموں میں بڑی عورت کا کیریکٹر بڑی اہمیت رکھتا ہے جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے اس کیریکٹر رول کو ادا کرنے والی اچھی اداکارہ کلدیپ کور ہی تھی جس نے اس کیریکٹر کو فلمی دنیا میں زندہ جاوید کر دیا۔ فلمی دنیا کی بدقسمتی ہی سمجھیے کہ ایسی عمدہ اداکارہ ٹیٹانس مرض کا شکار ہو کر انتقال کر گئی۔ بہت سی اداکاراؤں نے کلدیپ کور کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن

"نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب"

البتہ کلدیپ کور کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ششی کلا نے کسی حد تک اس کیریکٹر رول کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر فلم "آرتی" میں ششی کلا نے بڑی عورت کے رول میں جو اداکاری پیش کی ہے۔ اس سے یقیناً کلدیپ کور کی یاد ذہنوں میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اس فلم کے علاوہ دیگر فلموں میں بھی ششی کلا نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے

افسوس ہے کہ اس اداکارہ نے بھی فلمی دنیا کو خیرباد کہہ کر آسٹریلیا میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ لیکن تازہ اطلاعات کی روشنی میں وہ مستقبل قریب میں فلمی دنیا میں لوٹ آنے والی ہے۔ ایک اداکارہ نسّی بھی تھی جو خوبصورت ہونے کے باوجود ہیروئین نہیں بن سکی۔ اور بڑی مدت کے رول میں بھی کسی حد تک کامیابی نصیب ہو سکی۔ اسی طرح اس زمرے میں مینو ممتاز، ہیلن، للیتا پوار، درگا کھوٹے اور دیگر اداکاراؤں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس قسم کے رول نرگس اور گیتا بالی نے بھی ادا کیے ہیں۔ نرگس نے خواجہ احمد عباس کی فلم "انہونی" میں اچھی اور بری لڑکی کا ڈبل رول کیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہوگی وہ یقیناً یہ کہہ سکیں گے کہ بری لڑکی کے رول میں نرگس نے لاجواب اداکاری کی تھی۔ گیتا بالی نے بھی فلم "بازی" اور دوسری فلموں میں دیو آنند کے ساتھ ایسے ہی کارول کیے تھے۔ اس مخصوص کیرکٹر رول میں مختلف اداکاراؤں کی عمدہ اداکاری دیکھنے کے باوجود بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلدیپ کور کی جگہ آج بھی خالی ہے اور شاید وہ اس مخصوص رول ہی کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

٭

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ آئی ایس جوہر نے راج نارائن کے دوستوں کی درخواست پر وارانسی سے لوک سبھا کے انتخابات میں حصہ لینے کے اپنے اعلان کو واپس لے لیا ہے اس اعلان سے راج نارائن کو یقیناً سکون نصیب ہوا ہوگا۔ اب کانگریس آئی کے لیڈر مسٹر سی۔ایم اسٹیفن اور جنتا پارٹی کے رہنما شری واجپائی کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ جوہر نے دہلی کی اس پارلیمانی نشست جہاں سے یہ دونوں حضرات مقابلے کر رہے ہیں اپنا پرچہ نامزدگی داخل کر دیا ہے۔

تماشائی

فلمی ڈائری

پچھلے مہینے شیواجی پارک بمبئی میں ۱۹ نومبر کو فلمی ستاروں کی نیشنل پارٹی نے ایک زبردست انتخابی جلسہ کیا جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کر کے فلم والوں کی اس امید کو تقویت پہنچائی کہ سیاسی میدان سے پیشہ ور غیر ذمہ دار اور بدنام لیڈروں کو نکال باہر کرنے کی مہم میں پیشہ ور اداکاروں کی یہ پہلی سیاسی پارٹی اہم رول ادا کرے گی۔ فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں کے علاوہ بمبئی کی جن اہم شخصیتوں نے اس جلسہ میں شرکت کی ان میں ایم۔ سی چھاگلہ، این۔ اے پالکھی والا اور مسز وجے لکشمی پنڈت شامل ہیں۔ نیشنل پارٹی بمبئی کے ایک حلقے سے سابق ہندوستانی سفیر برائے امریکہ اور ممتاز قانون داں این۔ اے پالکھی والا کو ٹکٹ دینا چاہتی ہے۔ لیکن اس بات کے آثار بہت کم ہیں کہ پالکھی والا نیشنل پارٹی کی اس پیشکش کو قبول کریں گے۔ اس سے قبل دیو آنند نیشنل پارٹی کے صدر کی حیثیت سے دلی جا چکے ہیں جہاں وہ پارٹی کی تائید میں راہ ہموار کرنے کے لیے بہت سی سیاسی و غیر سیاسی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ بمبئی کے بعد اب نیشنل پارٹی دہلی میں بھی ایک زبردست انتخابی ریلی کا اہتمام کرنا چاہتی ہے۔ ویسے اب دہلی دور نہیں ہے۔ آئندہ ماہ پتہ چل جائے گا کہ نیشنل پارٹی کے کتنے امیدوار عوامی نمائندے بن کر دہلی جانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

مشہور ہمہ رنگ شاعر، مصنف اور اداکار ہریندرناتھ چٹوپادھیائے نے بتایا کہ ملک کی آزادی کے بعد جب گاندھی جی کانگریس کو تحلیل کر دینا چاہتے تھے تو انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کا نام نیشنل پارٹی رکھ دیں لیکن پنڈت جی کانگریس کے نام کی تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔ چٹوپادھیائے نے نیشنل پارٹی کی رکنیت قبول کرتے ہوئے کہا کہ میرا ایک دیرینہ خواب (کم سے کم نام کی حد تک) اب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔ مگر خود فلم والوں کے خواب کی تعبیر کیا ہوگی کسی کو پتہ نہیں۔

ایک پریس کانفرنس میں جب دیو آنند سے اخباری نمائندوں نے سوال کیا کہ کیا بھگوان رجنیش نیشنل پارٹی کے ساتھ ہیں تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکے۔ دیو آنند نے جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ بھگوان رجنیش کا آشیرواد تو شریمتی اندرا گاندھی کو حاصل ہے۔ بھگوان رجنیش کا آشیرواد خواہ کسی کے ساتھ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خود فلمی دنیا کے بہت سے دیوتا نیشنل پارٹی کے سر پر ہاتھ رکھنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اب اطلاع آئی ہے کہ پچھلے دنوں بمبئی میں نیشنل فلم فرنٹ کی تشکیل ہوئی ہے۔ جو لوک سبھا کے انتخابات میں شریمتی اندرا گاندھی کی تائید کرے گا۔ فلم ساز، ہدایت کار، اداکار بلدیو کھوسا اور موسیقار روی اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ کچھ دنوں قبل جب شریمتی اندرا گاندھی مختصر وقفے کے لیے بمبئی گئیں تو کئی اہم فلمی شخصیتوں نے ان سے ملاقات کی۔ شریمتی گاندھی کے ان پرستاروں میں سنیل دت، نرگس، راج کپور، رندھیر کپور، گلشن رائے اور دیوبرہ پرکاش شامل ہیں۔ ان لوگوں سے جب اس ملاقات کے بارے میں سوالات کیے گئے تو انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ ان کی ملاقات شریمتی گاندھی سے فلمی صنعت کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال تک محدود تھی۔ اس سادگی بلکہ اداکاری کا بھی جواب نہیں۔

★

پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے شیخ مختار کی فلم "نورجہاں" کی پاکستان میں نمائش کی اجازت دی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے بعد سے پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ۱۴ سال کے عرصے کے بعد یہ پہلی ہندوستانی فلم ہوگی جو پاکستان میں دکھائی جائے گی۔ اس فلم کو پہلے سندھ کے گورنر نے دیکھا، پھر اپنی سفارش کے ساتھ اسے اسلام آباد روانہ کیا جہاں جنرل ضیاء الحق نے خود اسے دیکھا اور نمائش کے لیے شیخ مختار کی درخواست منظور کی۔ ۱۹۶۷ء میں بمبئی میں

بنی اس فلم میں مینا کاری، پردیپ کمار، جانی واکر، سہراب مودی، رحمان، دینا اور خود شیخ مختار ہے۔ فلم کی ہدایت ایم صادق اور موسیقی روشن نے دی ہے۔ شیخ مختار نے فلم کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی لیکن باکس آفس پر ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا اور ان پر قرضوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مجبوراً انہیں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق کی غیر متوقع نظر عنایت سے اب ایسا لگتا ہے کہ یہی فلم شیخ مختار کے لیے پاکستان میں نیک شگون ثابت ہوگی۔

★

فلموں کے نام تماشائیوں کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں۔ نام سے وہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ فلم کس قسم کی ہوگی۔ لیکن "سہاگ" کے تعلق سے یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ "سہاگ" کا نام عام تماشائیوں کو متاثر نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود یہ فلم باکس آفس پر کامیابی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تماشائیوں نے فلم کے نام کی بجائے ہدایت کار من موہن دیسائی اور اداکار امیتابھ بچن کے ناموں پر توجہ دی اور اسے بھی "امر، اکبر، انتھونی" کی طرح مسالہ فلم سمجھا۔ "سہاگ" موضوع کے اعتبار سے "امر، اکبر، انتھونی" سے کافی مختلف ہے لیکن من موہن دیسائی نے اپنے تمام پرستاروں کو مایوس نہیں کیا ہے۔

★

پروین بابی کی پراسرار بیماری کے بارے میں آپ گذشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں اب ختم ہو چکی ہے۔ وہ بالکل صحت مند ہے اور فلموں کی شوٹنگ میں باقاعدہ حصہ لے رہی ہے۔ "برننگ ٹرین" میں اس کی ڈبنگ ختم ہو چکی ہے اور "شان" کی شوٹنگ جاری ہے۔ مقدر اور محنت کے سہارے کامیابی کی طرف تیزی سے پرواز کرتے ہوئے جب "یرقان" میں مبتلا ہوئی تو اس کے دل و دماغ کو کافی صدمہ پہنچا اور وہ "نروس بریک ڈاؤن" کا شکار ہو گئی اور یار لوگوں نے اس کی بیماری کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور کر دیں لیکن اب لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہیں اور پروین پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو چکی ہے

★

بی آر چوپڑہ کی "برننگ ٹرین" مکمل ہو چکی ہے اور جنوری میں نمائش کے لیے پیش کر دی جائے گی (حیدرآباد میں اس کی نمائش شاید مشہور آرکیٹیکٹ مسٹر صدیق کی بنائی ہوئی نئی خوبصورت تھیٹر "فرحین" میں ہوگی)۔ "برننگ ٹرین" خوفناک حادثے کی بنیاد پر بنائی گئی پہلی ہندوستانی فلم ہوگی جو مشہور انگریزی فلم TOWERING ENFERNO سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہے ویسے تو یش چوپڑہ کی "کالا پتھر" بھی چسنالہ کے حادثے کے پس منظر میں بنائی گئی لیکن اول تو "کالا پتھر" میں حادثے کی مکمل اور متاثر کن عکاسی پیش نہیں کی گئی اور پھر یہ فلم خود باکس آفس پر حادثہ کا شکار ہو گئی ہے اس کے برخلاف "برننگ ٹرین" میں حادثے کے پس منظر کی مکمل اور بے حد متاثر کن عکاسی کی گئی ہے اور اس کے لیے بیرونی ماہرین کی مدد لی گئی ہے اس بنا پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ "برننگ ٹرین" باکس آفس پر خود حادثہ کا شکار نہیں ہوگی بلکہ ہنگامہ بپا کرے گی۔

★

سرینگر کی تاریخ میں "نوری" تیسری فلم ہے جس نے سلور جوبلی کی ہے۔ پہلی دو فلمیں "برسات" اور "جنگلی" ہیں ان تینوں فلموں کی خصوصیت ان کی دلکش موسیقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کشمیری موسیقی کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کو ترجیح نہیں دیتے۔ جے پور میں "مقابلہ" اور "مقدر کا سکندر" نے باکس آفس کے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ اس مقابلے میں "مقابلہ" "مقدر کا سکندر" سے دو قدم آگے ہے۔

★

بلاسپور کی ایک ۶۰ سالہ دادی ماں نے "مقدر کا سکندر" ۱۸۳ بار دیکھا۔ اس بزرگ خاتون کو فلم کا گانا "سلام عشق میری جان" بے حد پسند ہے۔ تھیٹر کے مالک نے ہر روز کی اس تماشائی کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہوئے ایک ساڑی اور بلاوز کا کپڑا تحفتاً پیش کیا ہے

★

رنجیت ورک کی فلم "گردودھی" میں تین چوٹی کی ہیروئینیں، ہیما مالنی، زینت امان اور ریکھا کام کر رہی ہیں۔ فلم کے ہیرو دھرمیندر کو اس

کی محبوبہ غصے کی آگ میں جلاتی ہے اور کردھی بنا دیتی ہے۔ یہ محبوبہ ہیما مالنی نہیں بلکہ ریکھا ہے۔

★

احمد آباد میں جب بھی کوئی دلکش موسیقی والی فلم لگتی ہے تو سامنے بیٹھنے والے تماشائیوں کی چاندی ہی چاندی ہوتی ہے۔ فلم کے کسی مشہور و مقبول گانے پر پیچھے والے سکے اچھالتے ہیں اور سامنے والے لوٹتے ہیں یہ بات احمد آباد تک ہی محدود نہیں ہے بمبئی میں بھی یہی ہوتا ہے۔ کرلا کی ایک تھیٹر بھارت میں فلم "سرگم" چل رہی ہے ایک شخص ہر روز فلم دیکھنے جاتا ہے۔ دو روپے کا ٹکٹ خریدتا ہے اور جب واپس ہوتا ہے تو اس کی جیب میں ۴، ۵ روپے ہوتے ہیں۔ جو اسکرین پر پھینکے گئے سکوں کی لوٹی ہوئی رقم ہوتی ہے

★

امجد خان اب تو دلینا سے ہیرو اور ہدایت کار بن گیا ہے۔ لیکن جب وہ ویلن تھا اس وقت بھی لوگ جانتے تھے کہ پردے پر انتہائی سنگدل نظر آنے والا انسان اپنی عملی زندگی میں انتہائی رحم دل ہے امجد خان نے اپنے والد اداکار جینت کی یاد میں دوا ڈرنگی ایک وین دان میں دی ہے۔ یہ موٹر وین اسٹوڈیو اسٹوڈیو گھوم پھر کر ضرورت مندوں میں دوائیاں تقسیم کرتی ہے۔

★

راج کپور کو موسیقی میں کافی دخل ہے۔ برسات، "سنگم" یا "بابی" تک اس کی اکثر فلموں کے گانے عوام میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ بمبئی کے ایک تہذیبی ادارے "سُرسنگار" کی جانب سے راج کپور کو اس کے موسیقی کے ذوق پر "راجیشورا ایوارڈ" دیا گیا۔ راج کپور نے اعزاز قبول کرنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا کہ جب وہ "جس دیش میں گنگا بہتی ہے" بنا رہا تھا تو اس نے فلم کے موسیقار شنکر جے کشن سے کہا کہ وہ اس فلم کو موسیقی ریز بنانا چاہ رہا ہے۔ فلم کی کہانی چونکہ ایک ڈاکو کی زندگی کے متعلق تھی اس لیے شنکر جے کشن نے کہا کہ فلم میں موسیقی کی بہت کم گنجائش ہے لیکن راج کپور [illegible] کا چھٹا حس جو موسیقی کے معاملے میں بے حد حساس ہے بیدار ہو گیا اور اس نے فلم کے ٹائٹل گانے "ہم اس دیش کے واسی ہیں" کی دھن اتنی خوبصورت اور دلکش بنوائی کہ آج بھی لوگ اس پر جھوم اٹھتے ہیں۔

★

ہندوستانی اسکرین کے مشہور کامیڈین محمود امریکہ میں دو مہینے کے قیام کے بعد کچھ دنوں پہلے بمبئی لوٹا ہے۔ امریکہ سے واپسی کے بعد جہاں وہ تفریح کی خاطر گیا تھا اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ اب وہ فلم بنانے کے چکر میں پڑنے کی بجائے اپنے اصلی میدان یعنی اداکاری میں پھر سے وہ مقام حاصل کرے گا جہاں صرف اس کے نام سے تماشائی سینما گھروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ آج کل وہ "من پسند" کی شوٹنگ میں حصہ لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ نوکیتن کی نئی فلم "ہم تینوں" میں بھی کام کر رہا ہے محمود کے ہاں فلم سازوں کا تانتا بندھا ہوا ہے لیکن وہ بڑی احتیاط سے فلمیں قبول کر رہا ہے۔ ادھر کچھ سالوں سے ہماری فلموں میں مار دھاڑ اور جنس کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ طنز و مزاح اور قہقہوں کا دم گھٹ کے رہ گیا ہے ہمارے فلم سازوں اور محمود جیسے اداکاروں کو سنجیدگی سے اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

★

بنگال کے مشہور ہدایت کار مرنال سین کو سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈس کا پہلا انعام ملا ہے ہندوستانی فلموں کا معیار بڑھانے اور ہند، روس دوستی کو مستحکم کرنے کی کوششوں کے صلے میں انھیں یہ اعزاز دیا گیا ہے اس سے قبل ان کی فلم "کورس" کو بھی ماسکو انٹرنیشنل فلم فسٹیول میں انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

★

ENTER THE DRAGON اور
RETURN OF THE DRAGON
کے بعد اب ہندی فلم والوں کو بھی جوڈو اور کراٹے کا خیال آیا ہے۔ کے۔ ڈبلیو۔ خان اور اے۔ ایس۔ خان اپنا فلمز کے بینر تلے "بلاک بیلٹ" بنا رہے ہیں۔ بلاک بیلٹ مارشل آرٹس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ کہانی اور ہدایت خالد سمیع کی ہے اور موسیقی اوشا کھنہ کی۔ آشا سچدیو اور اکبر بیدی اس کے ستارے ہیں۔

~~~~~
~~~~~

کی

خوبصورت ساڑیوں

کیلئے

ربط پیدا کیجئے

باپولال شیوشنکر ایجنسیز

سلطان بازار، حیدرآباد

معیاری اور اعلیٰ ذوق کے لئے ہمیشہ

لامسا اسپیشل چائے

چائے پتّہ چائے

Registered with the Registrar of Newspaper-Registered No. 8285/64

: 6 Phone : 52957

POONAM URDU MONTHLY

ce : Azampura, Hyderabad-500 024 Editor . Nasir Kurnooli, M. A.